مولانا مودودی

اپنی اور دوسروں کی نظر میں

مرتبہ

محمد یوسف

شائع کردہ

مکتبہ الحبیب • اچھرہ • لاہور

★

افتخار احمد ناظم مکتبۃ الحبیب نے

تعلیمی پریس لاہور میں چھپوا کر ——— اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

تعداد		قیمت
۱۱۰۰	★	۵/۱۲/-

مندرجات

(۳) فکر و شخصیّت: ——— ۸۰

(۸) دو صحافتی ملاقات نامے :

ا۔ صحافت :۔ ۱۹۲۰ء ۔ ۱۹۲۴ء



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ہر انسان اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں گرد و پیش کے حالات و واقعات اور موجود و غیر موجود شخصیتوں کے افکار و خیالات سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی زندگی کی نئی راہوں کو متعین کرنے اور انھیں ساز گار و آسودہ کار بنانے کیلئے ان کی فکر و نظر سے استفادہ کرتا ہے۔ اس میں بعض کے تاثرات وقتی ہوتے ہیں جو بہت جلد زائل ہو جاتے ہیں اور بعض کے دائمی جن کو زمانے کی گردشیں بھی نہیں مٹا سکتیں، لیکن یہ تاثرات ہوتے ضرور ہیں چنانچہ میں بھی اپنی زندگی میں مختلف شخصیتوں کے افکار و خیالات سے متاثر ہوا اور اُن کے فکر و عمل سے اپنی استعداد کے مطابق فائدہ اور فیض حاصل کیا۔

لیکن یہ میری زندگی کا یادگار واقعہ ہے کہ مجدد و متکلم اسلام مولانا مودودی کے افادات کا اثر ایسے نازک اور پُرخطر وقت میں ہوا جبکہ لادینی تعلیمی ماحول اور مستشرقین کی کتابوں کے مطالعہ کی وجہ سے اسلام کی ہیئتِ کلی مجھے بہت ہی ناپسندیدہ دکھائی دینے لگی تھی خاص کر اسلام میں جہاد کی جو گھناؤنی اور خون آشام نقاشی ان قلم نوازانِ جہل کار نے کی ہے اس سے طبیعت میں سخت خلجان پیدا ہوا تھا۔ اصل حقیقت کو جاننے کے لئے میں نے ایک جاں بلب پیاسے کی طرح اُردو انگریزی میں اہلِ علم مسلمانوں کی ہر اس تحریر کو پڑھ ڈالا جس تک میری رسائی ہو سکی۔ لیکن کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے کسی کی تحریر بھی میرے خلجان کو رفع نہ کر سکی۔ اور نہ اس سیاہ کاری کا مداوا کر سکی جس سے مشرق شناسانِ غرب نے اسلام کو داغدار کرنے کی مقدور کوشش کی تھی۔ تاہم یہ میری اپنی کم علمی اور کوتاہ رسی

تھی۔ ورنہ علمار کرام اور اصحاب فکر و نظر کے یہاں اس طرح کے مواد کی کمی نہ تھی۔

۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔ اور ایسے نازک موقعہ پر جب کہ میں کفر و الحاد کے چہبچے میں گرنے ہی والا تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھے مولانا مودودی کی غالباً اوّلین تصنیف "الجہاد فی الاسلام" کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ اس کے مطالعے نے میرے فکر و تصور کا نقشہ ہی بدل دیا۔ میں تو اسے تائید ایزدی سمجھتا ہوں اور اسی لئے مودودی صاحب سے زیادہ اس ذات پاک کا شکرگزار ہوں جس نے مجھے اسلام پر استقامت بخشی اور مودودی صاحب کو بے راہوں کو راہ پر لانے کی قابلیت عطا کی۔

اسوقت سے آج تک میں مولانا کی تحریروں کو باقاعدہ پڑھتا رہا ہوں اور امکان بھر اُن کو سمجھنے اور اُن سے استفادہ کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اُن کے ایک ایک لفظ کو سمجھا ہے۔ اور ان کے پیغام کی روح کو پا لیا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی تحریروں نے مجھے اسلام سے روشناس کرایا اور خدا کی اس بے پایاں نعمت کو اپنانے کی خواہش میرے دل میں پیدا کی۔ جو بحمداللہ زندۂ جاوید ہے۔ لیکن اب تک مولانا سے ملنے کا اتفاق نہیں پیش آیا تھا۔ اور نہ اس کی دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ نہ جانے کیوں؟ شاید اس لئے کہ

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

لیکن جب میں نے اس کتاب کی ترتیب کا ارادہ کیا تو خیال ہوا کہ اس عظیم شخص کی صورت تو دیکھ لوں جس کے افکار نظریات کو میں گذشتہ میں

سال سے پڑھ رہا ہوں اور جو ایک بڑی حد تک میرا محسن بھی ہے۔ اور جس کے متعلق اب میں ایک ایسا کام کر رہا ہوں جو اس لحاظ سے تعلیمی بھی ہے اور بصیرت افروز بھی کہ مولانا کی زندگی اور ان کی ذہنی پرداخت (Career) دوسروں کے لیے سبق آموز ہے۔ چنانچہ ۱۲ر فروری ۱۹۵۵ء کو مجھے ایسی جگہ ان سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ جہاں قدرت بندگانِ حق کو آزمائش کی کسوٹی پر کس کر کھرے کھوٹے میں امتیاز کرتی ہے اور پھر آلام و مصائب کی بھٹی میں تپا کر انھیں کندن بناتی ہے۔ یہ مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی جو صرف لذتِ دید تک محدود رہی۔

بیسویں صدی کی عظیم ترین دریافت" جس پر دنیائے عقلیت آج جان و دل سے فدا ہے۔ وہ سہ آتشہ مرکب ہے۔ جو شخصیت پرستی، نسل پرستی اور قوم و وطن پرستی کے آمیزے سے کشید ہوتا ہے۔ اسی کے بطن سے "نظریاتی ملوکیت" نے جنم لیا، اور عصر حاضر کی روح رواں بن گئی۔ اور اسی کو اپنانے کے لیے ہر نوع کا قائد مختلف پہلوؤں سے کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنی ساکھ بٹھانے کے لئے "مقصد نظریہ، اصول، معیار جیسے خوش آیند اور خوش آہنگ الفاظ کا استقرار اعادہ کیا جاتا ہے کہ ذہن ماؤف ہو جاتے ہیں۔ لیکن بے حقیقت، حقیقت نمائی نہ کبھی زیادہ دنوں تک قائم رہی ہے اور نہ رہ سکتی ہے محض الفاظ کی بندش و ترکیب کو معالج باور کرا کے جو شیش محل تیار کیا جاتا ہے، چار دن نہیں گذرتے کہ آن کی آن میں نماک بسر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب واقعہ ہے کہ شیشہ گری کے تجربہ عام کے

باوصف کارِ ملمع سازی میں پیرک صد ہزار سالہ کی درازیٔ عمر کے ساتھ ساتھ، روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جس کی وجہ سے انسان نت نئے روپ دھار لینے میں اس قدر مشاق ہو گیا ہے کہ اس کے "اصلی روپ" کی جھلک تک دیکھنا نہ صرف مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے اور اس پر قائدیت ـــــــ مذہبی قائدیت، سیاسی قائدیت، معاشی قائدیت وغیرہ وغیرہ کا جتنا گہرا رنگ چڑھتا چلا جاتا ہے، اتنی ہی اس کی "اصلیت" گم ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کا یہ ایک عظیم ترین سانحہ ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ انسان اپنے افعال و کردار سے پہچانا جاتا ہے، لیکن اس کے حقیقی "افکار و کردار" کو جاننا پہچاننا بہرحال آسان نہیں۔ حکیم مشرق نے اس کی شناخت کا ایک ذریعہ بتایا ہے وہ کہتے ہیں

زندہ یا مردہ یا جاں بلب

از سہ شاہد کن شہادت را طلب

شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن ←

خویش را دیدن بنورِ خویشتن

شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے ←

خویش را دیدن بنورِ دیگرے

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق ←

خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

یعنی

آدمی کو پہچاننے کے لیے ان تین شہادتوں کی ضرورت ہے :-

۱۔ شعورِ خویشتن ← آدمی اپنی نظر میں کیا ہے

۲۔ شعورِ دیگرے ← آدمی دوسروں کی نگاہوں میں کیا ہے۔

۳۔ شعورِ ذاتِ حق ← آدمی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کیا مقام رکھتا ہے۔

اسی "ذریعہ" سے بیسویں صدی میں ہند و پاکستان کی ایک اہم شخصیت — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی — کو سمجھنے کے لیے یہ حقیر پیشکش ہے۔

اس "کارِ بے کار و بار کار" کی تحریک جنوری ۱۹۸۴ء میں اقدام کے ایک پرانے پرچے میں علی سفیان آفاقی کا مولانا مودودی سے ایک انٹرویو دیکھ کر ہوئی۔ صحافی کے تاثر کو پڑھ کر مجھے اپنا وہ تاثر یاد آیا جو "الجہاد فی الاسلام" پڑھ کر خود مجھ پر ہوا تھا اور اسی تاثر نے اس کتاب کی صورت گری کی۔ انسان اکثر ایسے کام بھی کر جاتا ہے جس کا ایک ساعت پہلے اسے وہم و گمان تک نہیں ہوتا۔ عالمِ امکان کا کوئی مادی یا غیر مادی داعیہ (Thought) اس کا محرک بن جاتا ہے۔ اور شہابِ ثاقب کی طرح ایک چمک اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے جو اسے راہ دکھا دیتی ہے۔ بس اس کتاب کی جمع و ترتیب کے سلسلے میں بھی یہی کچھ صورتِ حال پیش آئی۔

مولانا مودودی کے اصول و نظریات سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف لیکن یہ ہر شخص تسلیم کرے گا کہ وہ اس دور کی ایک بڑی شخصیت ہیں اور ان کے اعمال و افکار میں ہمیں ایسے بے شمار نقوش مل سکتے ہیں جو ان کے بڑا پن کو

ظاہر کرتے ہیں پیشِ نظر کتاب جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے اور نام سے زیادہ اس کا سرورق اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہ کتاب مولانا مودودی کی شخصیت کا مقام معلوم کرنے کے لئے ایک میزان کا کام دے گی کسی انسان کو ناپنے یا تولنے کے لئے جتنے زاویہائے نظر ہو سکتے ہیں۔ اُن کا اگر حصر و استقصار کیا جائے تو وہ تین ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ خود اپنے کو کس رنگ میں ظاہر کرتا ہے۔ دوم یہ کہ دوسرے اُسے کس رنگ میں دیکھتے ہیں۔ سوم یہ کہ اللہ تعالےٰ کی جناب میں اس کا درجہ و مرتبہ کیا ہے یا کیا ہو گا۔ ان تین پہلوؤں میں سے خدا کا معاملہ، تو وہ ہم سے متعلق نہیں۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کسی شخص کا مقام اس کی بارگاہ میں کیا ہے۔ ہم اس عالم ہزار شیوہ و رنگ میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ وہی بہتر جانتا ہے کہ کون کس درجے کا آدمی ہے۔ رہے باقی دو پہلو تو یہ اس کتاب کے دو پلڑے ہیں۔ پہلا پلڑا ہے "مولانا مودودی اپنی نظر میں"۔ دوسرا پلڑا ہے "مولانا مودودی دوسروں کی نظر میں" مؤلف نے ترازو آپ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ اسے تول کر فیصلہ کریں۔

کتاب کے پہلے حصے "اپنی نظر میں" تمام تر وہ تحریریں اور اقتباسات ہیں جو مولانا مودودی کے خود اپنے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ تحریریں اور اقتباسات، ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ ان میں معنوی اور منطقی ربط کے علاوہ ایک زمانی تسلسل بھی ہے جس سے مولانا مودودی کی ذہنی پرداخت کے مختلف مدارج اور افکار و تصورات کے نشو و ارتقار

کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ اپنی نظر کا اساسی اور غیر منفک عنصر ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا مودودی اپنی زندگی کے ایام و سنین میں کس حیثیت اور کس رفتار سے آگے بڑھے ہیں۔ اور وہ اس سفر میں کن مراحل سے گذرے ہیں۔ ان اقتباسات سے فکر و عمل کے علاوہ زبان اور قدرتِ تحریر کی رفتارِ ترقی کا بھی اندازہ نمایاں طور پہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا جزء "دوسروں کی نظر میں" ہے۔ اس حصے میں وہ مقالات و مضامین درج کئے گئے ہیں جو دوسروں نے لکھے ہیں۔ ان "دوسروں" میں صرف وہ لوگ شامل نہیں ہیں جنھیں مودودی صاحب کے "اپنے" کہا جا سکتا ہو۔ اس جزء کے مندرجات میں آپ کو موافق، مخالف پہلوؤں کے علاوہ بے لاگ اور غیر جانبدارانہ اظہار رائے بھی ملے گا۔

یہ کتاب اپریل میں شائع ہو جاتی، اسقدر تاخیر اس وجہ سے ہوئی کہ میں نے سوچا کہ قرآن نے اس آیت میں ہمیں ایک حقیقت سے آگاہ کیا ہے اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء اس بنا پر میں نے مولانا کے خاندانی حالات کی جستجو کی۔ اس سلسلے میں مجھے بہت سی کتابوں کے نام ملے ہیں جن میں مولانا کے اسلاف کرام کے حالات قلم بند ہوئے ہیں۔ ان میں دو کتابیں میرے اس کام کے لئے بہت ضروری تھیں۔ ایک "جواہر مودودی" جو خاندان مودودی کے اکابر کے حالات ہیں، شاہ محمد اکرم برا سوی صاحب "اقتباس الانوار" نے ۱۰۹۶ھ میں لکھی تھی۔ دوسری "تحفۃ الابرار" یہ تمام سلاسل طریقت کا جامع تذکرہ ہیں۔ اس میں خاندان

مودودی کے حالات مولانا کے والد ماجد تک مرقوم ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تک یہ ذخیرہ دستیاب نہ ہو سکا۔ تاہم اُمید ہے اور انشاء اللہ اس کتاب کی دوسری جلد خاندانی حالات سے مزور آراستہ ہوگی۔

خاندانی حالات کی جستجو میں خود مولانا کے بہت سے حالات دریافت ہوئے۔ اورنگ آباد اور حیدر آباد اور دہلی کے بعض اصحاب سے رابطے کی صورت نکلی۔ اُن سے مزید حالات دریافت ہونے کی توقع ہے۔ ان اصحاب کے ذریعے مولانا کے زمانۂ طالب علمی کی کچھ بیاضیں اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ترجمہ وتالیف کے مسودے اس وقت حاصل ہوئے جب یہ کتاب طباعت کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ بیاضوں کے بلاک اور مذکورہ بالا مسودوں کے اقتباس انشاء اللہ آئندہ جلد کی زینت ہوں گے۔

مرتب اوراق ان اصحاب کا شکر گزار ہے جنھوں نے اپنے مضامین مرحمت فرمائے اور قارئین سے معذرت خواہ ہے کہ مرحلۂ طباعت ایسے عالم میں پیش آیا کہ وہ کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح سے قاصر تھا۔

اچھرہ۔ لاہور
۱۵ر نومبر ۱۹۵۵ء

محمد یوسف



اپنی نظر میں

شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن
خویش را دیدن بنورِ خویشتن

اقبال

"میں علم کا پیاسا ہوں اور اس پیاس کو بجھانے والا اُس کے سوا کوئی نہیں۔ میری عقل و فہم میں ہزاروں کوتاہیاں ہیں، اور ان کو دُور کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہی ہے۔ میرا دل بے چین ہے، میری رُوح مضطرب ہے .... میرا دماغ سکون سے محروم ہے۔ خدا ہی ہے جو اس بیماری کا مداوا کر سکتا ہے۔ میں گناہوں میں گھرا ہوا ہوں میرے عمل میں لاکھوں خامیاں ہیں، میری فطرت کی کمزوریاں قدم قدم پر مرضاتِ الٰہی کے اتباع سے مجھ کو روکتی ہیں۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جو میرے ان عیوب کی اصلاح کرے اور عمل صالح کی توفیق بخشے۔ میں اس سے خلوصِ نیت کا طلب گار ہوں۔ صحت فکر اور سدادِ نظر مانگتا ہوں۔ الحب فی اللہ والبغض للہ کی توفیق چاہتا ہوں۔ میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اپنے بندوں سے بے نیاز کر کے صرف اپنا نیازمند بنائے محبت اور خوف اور طمع کا تعلق سب سے توڑ کر صرف اپنے ساتھ جوڑ دے اور اتنی قوت اور طاقت عطا فرمائے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنے دل کے سب حوصلے نکال سکوں۔ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ عَسٰی اَنْ لَا اَکُوْنَ بِدُعَاءِ رَبِّیْ شَقِیًّا۔

میرا بچپن

میرا بچپن ریاست حیدر آباد کے مشہور شہر اورنگ آباد دکن میں گزرا ہے۔ میرا خاندان تو دہلی کا تھا لیکن میرے والد مرحوم دہلی سے اورنگ آباد چلے گئے تھے۔ اس وجہ سے میری زندگی کے ابتدائی تیرہ، چودہ سال اورنگ آباد میں ہی بسر ہوئے۔ جو لوگ ایک ہی جگہ پل کر جوان ہوئے ہیں، اور ساری عمر اپنے پیدائشی وطن ہی میں رہے ہیں، وہ اس بات کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی گہری محبت ہوتی ہے جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا ہو۔ تیرہ چودہ سال کی عمر تک میں وہیں رہا۔ پھر میرا یہ پیدائشی وطن مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ برسوں کے بعد جوانی کی عمر میں جب مجھے ایک دفعہ پھر اورنگ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو میرے اوپر عجیب کیفیت گزری جس کا

شہر قریب آتا جاتا تھا میری بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ریل بہت سست چل رہی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ریل پر سے کود جاؤں اور بھاگ کر شہر میں جا پہنچوں۔ بچپن کی دیکھی ہوئی ہر ایک چیز کو میں پہچاننے کی کوشش کرتا تھا اور میرا دل بے اختیار کھنچنے لگتا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی گہری محبت ہوتی ہے جہاں اس کا بچپن گزرا ہو۔

ایک عجیب بات جو میں نے وہاں جا کر محسوس کی وہ یہ تھی کہ بچپن کی دیکھی ہوئی کوئی چیز بھی اب اتنی بڑی نہیں رہی تھی جتنی چند سال پہلے تھی۔ سڑکیں، بازار، گلیاں، عمارتیں، سب پہلے سے چھوٹی اور کچھ کچھ تنگ سی ہو گئی تھیں جن گھروں میں کبھی رہا تھا، یا اکثر جایا کرتا تھا، وہ بھی پہلے بڑے بڑے تھے، اور اب سکڑ کر بالکل چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ جس چیز کو بھی اپنی یاد کے نقشے سے ملا کر دیکھتا ہوں وہ ہے تو اپنی جگہ ہی پر مگر پہلے سے چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے۔ آخر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سارا فرق جو مجھے محسوس ہو رہا ہے دراصل ان چیزوں میں نہیں ہوا، بلکہ خود میرے اندر ہو گیا ہے۔ جب تک میں بچہ تھا میری نگاہ چھوٹی تھی، اور چیزیں بڑی نظر آتی تھیں۔ جب میں بڑا ہو گیا تو میری نگاہ بھی بڑی ہو گئی اور چیزیں اسی لحاظ سے چھوٹی نظر آنے لگیں۔

مجھے اپنی بہت چھوٹی عمر کی باتیں بھی اب تک یاد ہیں۔ مجھے اپنی حیرت اب تک یاد ہے جب مجھے پہلی مرتبہ یہ سن کر ہوئی تھی کہ ابا کے ابا کو دادا اور ابا کی

۶۵۴۸

اماں کو دادی کہتے ہیں۔ میرا دل یہ یقین کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا کہ ابا بھی کسی کے بیٹے ہو سکتے ہیں، اور نہ میں یہ تصور ہی کر سکتا تھا کہ میرے والد بھی کبھی میری طرح بچے ہوں گے۔ اس نئی معلومات پر میں بہت دنوں تک غور کرتا رہا، اور یہ بات بڑی تحقیقات کے بعد میری سمجھ میں آئی کہ جتنے لوگ اب بوڑھے ہیں، یہ سب کبھی بچے تھے اور ان کے بھی کوئی ماں باپ تھے۔

اس سے بھی زیادہ چھوٹی عمر کا ایک اور خیال مجھے اب تک یاد ہے۔ میں اماں اور ابا کے کوئی معنی نہیں جانتا تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور میں ان کے پاس کیسے آگیا ہوں۔ البتہ میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ یہ ہیں بڑے اچھے لوگ۔ اپنے والد کو دنیا کا سب سے اچھا آدمی اور اپنی والدہ کو سب سے اچھی عورت سمجھتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ لطف اس وقت آتا تھا جب میں بیمار ہوتا، یا مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی، اور میرے والدین میرے لیے پریشان ہوتے تھے۔ اسی لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی کبھی جان بوجھ کر بھی خطرہ میں ڈالتا تھا۔ اس وقت جو بے چینی میری والدہ اور میرے والد کے دل میں پیدا ہوتی تھی، اس سے میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ انہیں میری بہت فکر ہے۔ ان تجربات سے ماں اور باپ کے معنی میری سمجھ میں آگئے اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ماں باپ اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے ایک بھائی مجھ سے تین چار سال بڑے تھے۔ مجھے کھانے کی جو چیز ملتی تھی اسے فوراً کھا لیتا تھا، مگر بھائی صاحب سنبھال کر کسی اچھے وقت پر کھانے کے لیے اٹھا رکھتے تھے۔ اسی طرح جو پیسے مجھے ملتے تھے ان کو بھی فوراً خرچ کر ڈالتا تھا، اور بھائی صاحب انہیں جمع کر کے کبھی کوئی اچھی چیز خریدا کرتے تھے۔ بس یہ میرے اور ان کے درمیان جھگڑے کی بنیاد تھی۔ میں ہمیشہ ان کے حصے میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا تھا، اور وہ ہمیشہ تھوڑی دیر تک مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اول تو میں سمجھا کرتا تھا کہ اس طرح میں انہیں شکست دے کر مال غنیمت حاصل کرتا ہوں، مگر بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ بڑے بھائی کو مجھ سے محبت ہے، اور انہیں خود بھی اسی میں مزہ آتا ہے کہ میں ان سے لڑ بھڑ کر اپنا حصہ وصول کر لیا کروں۔ اس طرح میں والدین کے عطیوں میں سے ۷۵ فیصدی کا مالک ہوتا تھا۔ پچاس فیصد اپنے حساب میں، اور پچیس فیصد بڑے بھائی صاحب کے حساب میں سے۔ مشہور بات تو یہ ہے کہ "سگ باش برادر خورد مباش" یعنی چھوٹا بھائی بننے سے کتا بننا زیادہ بہتر ہے، مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔

تربیت

میرے والد مرحوم نے میری تربیت بڑے اچھے طریقے پر کی تھی۔ وہ دہلی کے شرفا کی نہایت ستھری زبان بولتے تھے۔ انہوں نے ابتدا سے

یہ خیال رکھا تھا کہ میری زبان بگڑنے نہ پائے جب کبھی میری زبان پر کوئی غلط لفظ چڑھ جاتا یا کوئی بازاری لفظ میں سیکھ لیتا تو وہ مجھے ٹوک دیتے اور صحیح بولنے کی عادت ڈالتے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں پرورش پانے کے باوجود میری زبان محفوظ رہی۔ بعد کو مجھے ہندوستان کے مختلف حصوں میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، مگر بچپن میں جو زبان پختہ ہو چکی تھی اس پر کسی جگہ کی بولی کا اثر نہ پڑ سکا۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصے، تاریخ اسلام اور تاریخ ہندوستان کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اس کا مفید اثر میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے اخلاق کی درستی کا بھی بہت خیال رکھتے تھے انہوں نے مجھے ایسے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلنے دیا جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں کبھی کبھی میں کوئی بری عادت سیکھ لیتا تھا، تو بڑی کوشش سے اسے چھڑاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ملازمہ کے بچے کو مارا تو انہوں نے اس بچے کو بلا کر کہا ”تو بھی اسے مار“ اس سے مجھے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کسی زیردست پر نہیں اٹھا) وہ مجھے زیادہ تر اپنے ساتھ اپنے دوستوں کی صحبت میں لے جاتے تھے، اور ان کے دوست سب کے سب سنجیدہ، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کی وجہ سے میں مہذب عادات سیکھ گیا، اور بڑی بڑی باتوں کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ میری طبیعت میں جتنی شوخی تھی، والد مرحوم کی اس تربیت کی وجہ سے وہ شرارتوں اور دنگے فساد

کے بجائے ظرافت کی شکل میں ڈھل گئی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں مجھ سے بڑی عمر کے لوگ میرے ساتھ بہت دل چسپی لیا کرتے تھے کیونکہ میں شرارتیں کرنے کے بجائے بہت مزے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا۔

میرے والد مرحوم نے میری ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا تھا۔ غالباً وہ میری زبان کی حفاظت کے لیے اور مجھے بُری صحبتوں سے بچانے کے لیے مجھے مدرسے بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ گھر کی اس تعلیم میں مجھ کو بہت سے استادوں سے سابقہ پیش آیا۔ بعض استاد ایسے تھے جنہوں نے مجھے کند ذہن بنانے کی کوشش کی، اور ان کے اثر سے مجھے خود اپنے اوپر ہی یہ شک ہونے لگا کہ شاید میں کچھ پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض استادوں نے مجھے اس سے زیادہ پڑھانے کی کوشش کی جتنا میں اپنی عمر کے لحاظ سے پڑھ سکتا تھا۔ البتہ بعض استادوں نے مجھے بہت اچھی تعلیم دی، اور مجھے جو کچھ حاصل ہوا وہ انہی کا فیض تھا۔ مجموعی طور پر اسے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ گھر کی یہ تعلیم میرے لیے مدرسے کی بہ نسبت زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ پانچ چھ سال کی اس تعلیم میں مجھ کو اتنا علم حاصل ہو گیا جتنا مدرسے میں بچوں کو آٹھ سال میں ہوتا ہے، بلکہ جب مجھ کو گیارہ سال کی عمر میں مدرسے کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا تو اکثر مضمونوں میں میری معلومات اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ تھیں حالانکہ میں اپنی آٹھویں کلاس میں سب سے چھوٹی عمر کا طالب علم تھا۔

میری ابتدائی تعلیم میں ایک خرابی ایسی تھی جس کو بعد میں میں نے بری طرح محسوس کیا۔ وہ خرابی یہ تھی کہ عام دستور کے مطابق مجھے سب سے پہلے بغدادی قاعدہ پڑھا کر قرآن پڑھوا دیا گیا۔ یہ غلطی عام طور پر مسلمان اس زمانے میں بھی کرتے تھے اور آج تک کیے جا رہے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ بچہ دنیا کی اور ساری چیزیں تو سمجھ کر پڑھتا ہے، مگر صرف قرآن ہی کے متعلق وہ خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس کے الفاظ پڑھ لینے کافی ہیں۔ اس غلط طریقہ کی وجہ سے مجھے بے سمجھے قرآن پڑھنے کی ایسی عادت پڑی کہ آگے چل کر جب میں نے عربی زبان پڑھ لی اس وقت بھی برسوں تک قرآن کو بغیر سمجھے ہی پڑھتا رہا۔ اکیس سال کی عمر میں مجھ کو پہلی مرتبہ اپنی اس غلطی کا احساس ہوا، اور میں نے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مسلمان بچوں کو اس غلطی سے بچایا جائے۔ (اور انہیں قرآن اس وقت پڑھایا جائے جب وہ کم از کم اتنی اردو پڑھ لیں کہ قرآن کا ترجمہ ساتھ ساتھ پڑھ سکیں)

اب میں تھوڑا سا حال اپنے مدرسے کا بیان کرتا ہوں۔ گیارہ برس کی عمر میں جب مجھ کو ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے میل جول کا موقعہ ملا، کیونکہ اس سے پہلے تک تو میں زیادہ تر بڑوں کی صحبت ہی میں رہا تھا۔ مدرسے میں اوّل اوّل

تھوڑے دنوں تک اجنبی رہا۔ پھر میں نے مدرسے کی اس شریف ٹولی سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے جس میں سنجیدہ اور شوقین طالب علم شامل تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے محض اپنی ظرافت کے ذریعہ سے شریر ٹولی کے بھی دو تین سرغنوں کو دوست بنا لیا تھا۔ میں ان کی شرارتوں میں تو شریک نہیں ہوتا تھا، مگر مذاق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے میں نے ان کو رام کر لیا تھا۔ اس طرح میں شریف ٹولی کا دوست بھی رہا، اور شریر ٹولی سے میرے تعلقات بھی نہیں بگڑے۔ اُستادوں میں سے اکثر میرے اوپر مہربان تھے۔ خصوصاً ایک استاد تو ایسے شفیق بن گئے کہ آج تک ان کے خاندان سے میرے تعلقات قائم ہیں اور ان کے صاحبزادے کو میں اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ (مدرسے ہی میں مجھ کو پہلی مرتبہ مضامین لکھنے اور تقریری مباحثوں میں حصہ لینے کا موقعہ ملا۔ اس سے مجھ کو احساس ہؤا کہ مجھ میں زبان اور قلم سے کام لینے کی کچھ صلاحیت ہے۔ مدرسے کی زندگی میں چند مہینے ہی گزارنے کے بعد مجھے اس سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ چھٹی کا دن مجھ کو سخت ناگوار ہوتا تھا، اور جب لمبی چھٹیاں آتی تھیں تو پہلے ہی سے ہم چند لڑکے آپس میں یہ پروگرام طے کر لیتے تھے کہ روزانہ ایک جگہ جمع ہوا کریں گے، اور مل کر کچھ مطالعہ کیا کریں اور مل کر تفریح بھی کریں گے۔

کھیل سے مجھے ابتدائی عمر میں بہت کم دلچسپی تھی۔ جب کچھ ہوش سنبھالا

تو بنوٹ کے فن سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میری والدہ صاحبہ کے خاندان میں یہ فن بہت مقبول تھا خصوصاً میرے ماموں اس کے بہت ماہر تھے۔ میں نے اپنے خالہ زاد بھائیوں سے یہ فن سیکھا، اور کچھ مدت تک بس یہی میرا کھیل رہا۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد مجھے فٹ بال اور کرکٹ سے دلچسپی پیدا ہوئی، مگر صرف تفریح کے لیے اس میں شریک ہوتا تھا لیکن اچھا کھلاڑی میں کبھی نہیں بن سکا۔

خود نوشت

[یہ خود نوشت مولانا مودودی صاحب نے سنہ ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک دوست سید منظر علی صاحب اشہر مؤلف منظر الکرام کی فرمائش پر رقم فرمائی تھی۔ منظر صاحب نے منظر الکرام کے نام سے عمائد و مشاہیر حیدرآباد (دکن) کا ایک تذکرہ لکھ کر شائع کیا تھا، اسی سلسلے میں ان کو صاحبانِ علم و قلم کا تذکرہ خود نوشت مرتب کرنے کی نادر ترکیب سوجھی۔ اس تقریب سے یہ رواں اور بے تکلف نوشتہ معرضِ وجود میں آیا، اور یہ حسنِ اتفاق ہے کہ مرتبِ اوراق کو ان اوراق کی ترتیب کے لیے مولانا ابوالخیر مودودی صاحب کے ذریعے خود منظر صاحب کا منقولہ نسخہ حاصل ہو گیا۔ اس پس منظر کے لحاظ سے یہ ایک تاریخی چیز ہے لیکن اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے: اس میں احساس ہے سیرت و شخصیت کی ابتدائی نشوؤں میں جن میں فکر و نظر کی تکوین ہوتی ہے]۔

خاندان سے

میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس میں تیرہ سو برس تک سلسلہ ارشاد و ہدایت اور فقر و درویشی جاری رہا ہے۔ سادات اہل بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں "ہرات" کے قریب ایک مقام پر آکر آباد ہوئی تھی، جو "چشت" کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہوا۔ اس خاندان کے نامور بزرگ حضرت ابو احمد ابدال چشتی (متوفی ۳۵۵ھ) حضرت حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ انہی سے صوفیہ کا مشہور سلسلہ چشتیہ جاری ہوا ہے۔ ان کے نواسے اور جانشین حضرت ناصر الدین ابو یوسف چشتی (متوفی ۴۵۹ھ) سادات کی ایک دوسری شاخ سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلہ نسب امام علی نقی علیہ السلام کے واسطے سے امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ حضرت ناصر الدین ابو یوسف

کے فرزند اکبر حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی (متوفی ۵۲۷ھ) تھے، جو تمام سلاسل چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندان مودودیہ کے مورث ہیں:

(حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے شیخ حضرت عثمان ہرونی تھے۔ ان کے شیخ حضرت حاجی شریف زندنیؒ، اور ان کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین مودود، رحمۃ اللہ علیہم)

(خاندان مودودیہ کی جس شاخ سے میرا تعلق ہے، وہ نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہندوستان میں آباد ہے۔ اس شاخ کے پہلے بزرگ جنھوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کی حضرت ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۹۳۵ھ) تھے۔ وہ سکندر لودی کے زمانہ میں چشت سے ہندوستان آئے، اور کرنال کے قریب قصبہ براس میں مقیم ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں یہ خاندان مستقلاً دہلی میں آباد ہوا، اور اب تک کہ پانچ پشتیں گزر چکی ہیں اور چھٹی پشت گزر رہی ہے اسی اجڑے دیار میں آباد ہے۔

ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔ میرے نانا میرزا قربان علی بیگ خاں سالک، کہ خود شاعر اور صاحب قلم تھے۔ مگر پشتہا پشت سے ان کا پیشہ آبا

سپہ گری تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے میرزا طولک بے عالمگیر کے عہد میں ما وراء النہر سے ہندوستان آئے اور فوجی مناصب سے سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجالاتے رہے۔ جب شیرازۂ سلطنت درہم برہم ہوا تو مختلف افراد مختلف سمتوں میں تتربتر ہوگئے۔ چنانچہ حضرت سالک مرحوم کے والد نواب عالم بیگ خاں اور چچا نواب نیاز بہادر، نواب میر نظام علی خاں کے آخری عہد میں حیدرآباد آئے۔ نیاز بہادر خاں کی شادی نواب مستقل جنگ عزت الدولہ عاشور بیگ خاں کی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہ عاشور بیگ خاں ان کے ہم جد اور رشتے میں ان کے چچا تھے، اور دولت آصفیہ نے اُسی خطاب و اعزاز سے سرفراز کیا تھا جو خطاب و اعزاز دولت مغلیہ کی جانب سے ان کے جد کو عطا کیا گیا تھا۔ نواب مستقل جنگ کے بعد نیاز بہادر خاں ان کی جگہ نظم جمعیت کے جمعدار اور جاگیر کے مالک ہوئے۔

عالم بیگ خاں کی شادی عبدالرحیم خاں قلعہ دار گول کنڈہ کے خاندان میں ہوئی، اور انہی بیوی کے بطن سے حضرت سالک مرحوم پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۲ء میں نواب نیاز بہادر خاں چیچل گوڑہ کے ہنگامے میں شہید ہوئے۔ اس ہنگامے کے واقعات دکن کی تاریخوں میں تفصیل سے مذکور ہیں، اور شہادت کا یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ "از شمشیر شمشیر خاں کار نیاز بہادر خاں، و از شمشیر نیاز بہادر خاں کار شمشیر خاں تمام شد"۔ اس واقعہ کے بعد نواب عالم بیگ خاں

اپنے خورد سال بچے کو لے کر دہلی واپس چلے گئے۔ اس کے تقریباً چالیس سال بعد میرزا سالک مرحوم پھر حیدرآباد واپس آئے اور سر سالار جنگ اعظم نے ان کو سررشتۂ تعلیمات میں مامور کر دیا۔ یہاں انہوں نے نواب عماد الملک بلگرامی کی سرپرستی و شرکت سے "مخزن الفوائد" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا، جو اگرچہ حیدرآباد کا سب سے پہلا نہیں، تو کم از کم قدیم ترین علمی و ادبی رسالوں میں سے ایک ضرور تھا۔ ۱۸۸۰ھ میں حضرت سالک نے انتقال فرمایا اور اسی خاک میں دفن ہوئے جہاں پیدا ہوئے تھے۔

میرے والد مرحوم، مولوی سید احمد حسن صاحب، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو سال پہلے دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ سر سید مرحوم نے جب مدرسہ قائم کیا تھا تو وہ اپنے خاندان اور رشتہ داروں میں سے بھی بہت سے لڑکوں کو چن کر علی گڑھ لے گئے تھے۔ چونکہ میری دادی صاحبہ مرحومہ سے ان کی قرابت ہوتی تھی، اس لیے میرے والد مرحوم کا انتخاب بھی اسی سلسلے میں ہوا۔ مدرسہ میں سر محمد رفیق اور سر بلند جنگ وغیرہ ان کے رفیقِ جماعت تھے (اسی زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں جو شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی،

اس کا حال سب جانتے ہیں۔ مگر ہمارا خاندان اس نفرت میں عام مسلمانوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا کیونکہ یہاں مذہب کے ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ میرے دادا صاحب کو والد کا علی گڑھ میں تعلیم پانا سخت ناگوار تھا، مگر سرسید کے خیال سے خاموش تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک عزیز علی گڑھ تشریف لے گئے اور اتفاقاً ایک جگہ کرکٹ کا کھیل دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں ان کی نظر والد مرحوم پر پڑی، اور یہ دیکھ کر انہیں سخت رنج ہوا کہ ایک پیر طریقت کا لڑکا انگریزی لباس پہنے انگریزی طرز کا کھیل کھیل رہا ہے۔ دہلی واپس ہوتے تو دادا صاحب سے مل کر کہا کہ

"بھائی صاحب! احمد حسن سے تو ہاتھ دھو بیٹھیے۔ میں نے اس کو علی گڑھ میں دیکھا کہ کافر کرتی پہنے گیند بلا کھیل رہا تھا۔"

یہ خبر سن کر دادا صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اور انہوں نے فوراً والد مرحوم کو علی گڑھ سے واپس بلا لیا۔ اس طرح وہ وہاں تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔ اس کے بعد انہوں نے الہ آباد جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ریاست دیوگڑھ میں ولی عہد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اتالیقی کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ راجہ صاحب نے دہلی سے دو آدمیوں کو بلایا تھا تاکہ ان میں سے ایک کا انتخاب کریں۔ ان میں سے ایک میرے والد تھے اور ایک والد مرحوم کے استاد تھے، جنہوں نے بچپن میں ان کو پڑھایا تھا۔ دیوگڑھ پہنچ کر جب والد مرحوم کو معلوم ہوا کہ میرے استاد

کو بھی بلایا گیا ہے تو انہوں نے راجہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ میں اپنے استاد کے مقابلے میں پیش نہیں ہو سکتا۔ مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔ دوسری طرف اُستاد صاحب سے والد کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ "وہ میرا شاگرد اور میرے سامنے کا بچہ ہے۔ بھلا وہ میرے مقابلے میں کیا پڑھائے گا"۔ دونوں کے اخلاق کے یہ نمونے دیکھ کر راجہ صاحب نے کہا کہ "ہمیں استاد کی ضرورت نہیں شاگرد ہی ہمیں پسند آیا ہے"۔ کئی سال تک والد مرحوم دیوگڑھ میں رہے۔ پھر ایک سازش کے ماتحت ولی عہد کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا، جس کا والد مرحوم کو سخت صدمہ ہوا، اور دیوگڑھ کی ملازمت چھوڑ کر چلے آئے۔ پھر کئی سال تک انہوں نے میرٹھ، غازی آباد، اور بلند شہر وغیرہ مقامات میں وکالت کی اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں ایک مقدمہ میں وکالۃً اورنگ آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں مولوی محی الدین خاں صاحب صوبے کے میر عدل تھے، اور رشتے میں والد مرحوم کے چچا ہوتے تھے۔ ان کے ایماء سے یہاں وکالت شروع کر دی اور چند ہی ماہ میں بڑی تیزی سے کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے تک والد مرحوم پر انگریزی خیالات اور انگریزی طرزِ معاشرت کا غلبہ تھا، اور مذہبیت کی چنگاری راکھ میں دبی ہوئی تھی۔ مولوی محی الدین خاں صاحب کی صحبت نے رفتہ رفتہ ان پر ایسا اثر کیا کہ فرنگیت کے تمام اثرات باطل ہو گئے اور اس کی جگہ اسلامیت پوری طرح متمکن ہو گئی۔ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں والد مرحوم نے مولوی محی الدین خاں صاحب سے

بیعت کرلی اور ذکر و شغل، ریاضات و مجاہدات اور سلوک و مراقبہ میں لگ گئے تاہم اس وقت تک یہ رنگ آتنا نہ چڑھا تھا کہ وکالت کے ساتھ اس کا نباہنا مشکل ہوتا۔ چار سال تک دین اور دنیا دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے، مگر ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں، جب کہ میں صرف ایک سال کا تھا، والد مرحوم کے لیے ان دونوں کا نباہنا مشکل ہوگیا، اور انھوں نے نہ صرف وکالت بلکہ دنیا کمانے کی فکر ہی کو خیر باد کہا۔ تمام اثاث البیت تقسیم کر کے دہلی تشریف لے گئے اور درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ایک قدیم بستی "عرب سرائے" میں اقامت گزیں ہوگئے، اور اپنا سارا وقت دینی مشاغل میں صرف کرنے لگے۔ جب تین سال اسی طرح زندگی بسر کرتے گزر گئے تو مولوی محی الدین خاں صاحب نے ان کو پھر اورنگ آباد طلب کیا اور نصیحت کی کہ رجوع الی اللہ کے لیے ترک دنیا لازم نہیں ہے۔ صرف یہ کوشش کرو کہ جو کچھ کماؤ جائز طریقے سے کماؤ۔ اس نصیحت پر عمل کر کے والد مرحوم نے پھر وکالت شروع کی، مگر اب یہ رنگ تھا کہ کوئی جھوٹا مقدمہ نہیں لیتے تھے۔ ہر موکل کو سب سے پہلے خود ان کی تحقیقات اور جرح و تنقید کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ جب انھیں کامل اطمینان ہو جاتا کہ اس کا معاملہ سچا ہے تب کہیں اس کی وکالت کرنے پر راضی ہوتے۔ ان تقییدات کے ساتھ وکالت کا چلنا معلوم۔ رفتہ رفتہ اہل معاملہ کا رجوع ان کی طرف کم ہوتا چلا گیا اور مالی مشکلات بڑھتی چلی گئیں مگر

اس کے ساتھ ان کا مذہبی رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ان کی ذہنیت، ان کے خیالات، ان کی معاشرت، غرض ہر چیز اس قدر بدل گئی کہ یہ تشبیہ تک کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ان کو کبھی انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کی ہوا بھی لگی ہے۔ ۱۹۱۵ء تک اورنگ آباد میں وکالت کرتے رہے۔ پھر حیدرآباد تشریف لائے مگر چند مہینے رہ کر خرابی صحت کے باعث بھوپال چلے گئے، یہاں میرے بڑے بھائی سید ابو محمد صاحب اگزکٹیو افسر تھے وہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس نے ان کو بالکل بیکار کر دیا۔ چار سال تک اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۲۰ء میں انہوں نے انتقال فرمایا۔

میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (ستمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ پیدائش سے تین سال پہلے ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آئے تھے انہوں نے میری پیدائش کی پیش گوئی کی تھی اور والد سے فرمایا تھا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ چونکہ اس نام کے ایک بزرگ پہلے بھی ہمارے خاندان میں گذر چکے تھے اور انہی کی ذات سے ہندوستان میں ہمارے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس لیے والد نے ان کے ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا۔ چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو اسی نام سے مجھے موسوم کیا گیا۔ میری پیدائش کے ایک سال بعد، جیسا کہ

میں بیان کر چکا ہوں، والد مرحوم نے دنیا ترک کر دی اور تین سال تک زاہدانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے بعد گو انہوں نے پھر دنیا کی طرف رجوع کیا، مگر اس دنیا کی طرف نہیں جسے چھوڑا تھا، بلکہ ایک خالص مذہبی دنیا کی طرف۔ ان کی زندگی کے اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا وہ ایک مکمل مذہبی ماحول تھا۔ والد مرحوم اور والدہ ماجدہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتدا ہی سے میرے دل و دماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتسم ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم

والد مرحوم نے اوّل دن ہی تہیہ فرما لیا تھا کہ مجھے مولوی بنائیں گے۔ چنانچہ میری تعلیم بھی اسی ڈھنگ پر ہوئی۔ اردو اور فارسی کے ساتھ عربی زبان اور فقہ و حدیث کے درس پر ڈال دیا گیا، اور انگریزی زبان، علوم اور خیالات کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی۔ والد مرحوم کو تعلیم کے ساتھ اخلاق و عادات کی اصلاح کا بھی خاص خیال تھا۔ ایک مدت تک انہوں نے مجھے کسی مدرسے میں داخل نہیں کیا، بلکہ گھر پر تعلیم دلوائی۔ پڑھنے کے علاوہ جتنے اوقات بچتے تھے ان میں وہ بیشتر مجھ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے احباب میں لے جاتے تھے، جو سب کے سب ثقہ اور سنجیدہ لوگ تھے۔ راتوں کو انبیاء کے قصے، بزرگانِ دین کے حالات، اسلامی تاریخ کی کہانیاں سناتے، مختلف دلچسپ

پیرایوں میں اسلامی عقائد ذہن نشین کرتے اور مذہبی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عام نشست و برخاست میں بھی انہیں اخلاق و تہذیب کی اصلاح کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ زبان کی طرف بھی ان کی خاص توجہ تھی۔ بیس سال تک دکن میں رہنے کے باوجود ان کی زبان پر یہاں کا ایک لفظ اور ایک محاورہ بھی نہ چڑھا تھا۔ بالکل خالص اُردوئے معلّٰی بولتے تھے اور زبان کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بھی انہوں نے ایک کافی مدت تک اس کا خیال رکھا کہ ہم عام بچّوں میں ملنے جلنے نہ پائیں۔ اور اس حفاظت کے باوجود اگر کبھی گھر کے نوکروں یا دوسرے لوگوں سے سنا سنایا کوئی دکنی لفظ یا محاورہ زبان پر چڑھ جاتا تو وہ فوراً ٹوک دیتے تھے اور صحیح لفظ بتا دیا کرتے تھے۔

نو سال کی عمر تک میں نے گھر پر پڑھا اور اس زمانے میں صرف و نحو، عربی ادب اور فقہ کی متعدد ابتدائی کتابیں پڑھ لیں۔ پھر میرے استاد مولوی نذیر اللہ حسینی مرحوم و مغفور کے مشورے سے مجھے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت رشدیہ میں داخل کر دیا گیا۔ داخلے کے چند مہینے بعد میں رشدیہ کے امتحان میں شریک ہوا مگر ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ریاضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ریاضی کی تعلیم بھی میں نے صرف اسی چھ مہینے کی مدت میں حاصل کی تھی۔ اس کے سوا کسی اور مضمون میں میں کمزور نہ تھا۔ اس وجہ سے صدر مدرس ملا داؤد صاحب نے جو ابتدا سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے، میری

ناکامی کے باوجود مجھے جماعت مولوی میں شریک کر لیا۔ یہاں پہلی مرتبہ میں جدید علوم سے روشناس ہوا۔ گو ذریعۂ تعلیم اردو تھی مگر کیمیا، طبیعیات، ریاضی اور تاریخ وغیرہ علوم سے واقفیت اور دلچسپی کی ابتدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مختلف اساتذہ کے اثرات سے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور مدرسے کے دوستوں کے ساتھ میل جول نے اس رکھائی اور اکھل کھرے پن کو دور کر دیا جو ابتداءً سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کی بدولت پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ دونوں الگ رہنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں سوسائٹی میں اس وقت شامل ہوا جب کافی ہوشیار ہو چکا تھا۔ والد مرحوم کی صحبت اور تلقین و تربیت سے مجھ میں برے اور بھلے کی تمیز پیدا ہو چکی تھی اور ان کی ابتدائی تربیت نے ایک ایسی سیرت کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں جو دوسروں کے اثرات کو بلا امتیاز اور بلا ارادہ قبول نہ کر سکتی تھی۔ اس کا فائدہ مجھے چند سال بعد محسوس ہوا جب میں اپنی زندگی میں کلیتہً آزاد و خود مختار ہو گیا اور کوئی سر دھرا نگرانی کرنے والا نہ رہا۔ اس وقت صرف یہی چیز تھی جس نے مجھ کو گمراہ ہونے سے بچایا۔ حالانکہ جب میں آزاد ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف پندرہ سال کی تھی جس میں عام طور پر نوجوان کے لیے گمراہی کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔

۱۹۱۴ء میں میں نے مولوی کا امتحان دیا اور ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں کامیاب ہوا۔ اس زمانے میں والد مرحوم کی مشکلات

بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اور ان کی صحت بھی جواب دیتی جارہی تھی۔ تاہم وہ اورنگ آباد چھوڑ کر حیدرآباد تشریف لائے اور مجھے دارالعلوم کی جماعت مولوی عالم میں شریک کرادیا۔ اس زمانے میں مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم دارالعلوم کے صدر تھے۔ والد مرحوم مجھے حیدرآباد میں چھوڑ کر بھوپال تشریف لے گئے اور میں یہاں پڑھتا رہا۔ مگر یہ تعلیم کا سلسلہ چھ مہینے سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ ایک روز بھوپال سے دفعتًہ اطلاع آئی کہ والد پر فالج کا سخت حملہ ہوا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی میں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر حیدرآباد سے روانہ ہوا اور بھوپال جاکر والد مرحوم کی خدمت میں منہمک ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ان کے صحت یاب ہونے کی تمام امیدیں منقطع ہوگئیں اور اب زندگی کے تلخ حقائق نے بزور اپنے آپ کو محسوس کرانا شروع کیا۔ ڈیڑھ دو سال کے تجربات نے یہ سبق سکھایا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے اور معاشی استقلال کے لیے جدوجہد کیے بغیر چارہ نہیں۔ فطرت نے تحریر و انشا کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا۔ عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہوئی، اسی زمانے میں جناب نیاز فتحپوری سے دوستانہ تعلقات ہوگئے۔ اور ان کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی۔ اس کے علاوہ دفتری ملازمت کی طرف طبعًا کوئی میلان نہ تھا اور اس قسم کی زندگی اختیار کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ غرض

ان تمام وجوہ سے یہی فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلۂ معاش قرار دینا چاہیئے۔
۱۹۱۸ئہ میں سب سے پہلے میرے بھائی . . . . نے اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھا اور اخبار مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹر ہوئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا اور ہم دونوں نے ساتھ مل کر کام شروع کیا۔ لیکن ڈیڑھ دو مہینہ سے زیادہ ہم وہاں نہ نباہ سکے۔ وہاں سے ہم دہلی واپس ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریک کے زبردست طوفان کی ابتدا ہو رہی تھی۔ کچھ فطری آزاد خیالی، کچھ ذاتی مطالعے کچھ خاندانی روایات اور کچھ ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہمیں ابتدا ہی سے فرنگیت اور فرنگی تسلط سے نفرت تھی اور طبیعت ایسی ہر تحریک کو قبول کرنے پر آمادہ تھی جو ہندوستان کو اس تسلط سے آزاد کرنے کے لیے کی جائے۔ اس کے ساتھ مذہبی جذبات بھی شریک ہو گئے۔ بہر حال ان وجوہ سے ہم نے "انجمن اعانت نظر بندان اسلام" میں کام کرنا شروع کیا، اور پھر ۱۹۱۹ئہ میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانے میں میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی، مگر وہ ابھی زیر طبع ہی تھی کہ میرے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اسے ضبط کرا دیا۔

اس زمانے میں ہماری ملاقات ایک اور صاحب سے ہوئی جو جبل پور کے رہنے والے تھے اور "انجمن اعانت نظر بندان اسلام" کی روح رواں تھے۔

تاج الدین ان کا نام تھا۔ انہوں نے جبل پور سے "تاج" نامی ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور اس کی ایڈیٹری ہم دونوں کے سپرد کی۔ مگر وہ زمانہ اخبارات کے لیے سخت ناسازگار تھا۔ چند مہینے سے زیادہ "تاج" نہ نکل سکا، اور ہم جبل پور سے بھوپال اور بھوپال سے دلی واپس چلے گئے۔ اب اخبار نویسی کی ضروریات نے مجھے انگریزی پڑھنے پر مجبور کیا۔ خوش قسمتی سے ایک شفیق استاد مولوی محمد فاضل صاحب مجھے مل گئے، جنہوں نے میری طبیعت کا اندازہ کر کے یہ سمجھ لیا کہ اگر اس شاگرد کو پرائمر اور کنگ ریڈر پڑھائی گئی تو اس کا دل اکھڑ جائے گا، اس لیے انہوں نے ابتدا ہی ایک ایسی کتاب سے کرائی جو ایک زمانے میں میٹرک کے نصاب میں شریک تھی۔ یہ تعلیم چار پانچ مہینے سے زیادہ نہ رہی اور اس مدت میں بھی کبھی ایک گھنٹے سے زیادہ استاد کی توجہ مجھے حاصل نہ ہو سکی لیکن اس مدت میں جو کچھ میں نے پڑھ لیا، اس کے بعد میں استاد سے بے نیاز ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے خود انگریزی اخبارات، رسائل اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور دو سال تک صرف اسی ایک کام میں منہمک رہا۔ اول اول میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، مگر اس کے باوجود میں ہر قسم اور ہر موضوع کی سہل اور مشکل عبارتیں پڑھے جاتا تھا اور لغت کی مدد سے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ الفاظ اور ان کے معانی اور ان کے محل استعمال اور مختلف اسالیب بیان میرے ذہن نشین ہوتے چلے گئے،

زندگی کی بہت کچھ

اور میں نے اتنی استعداد بہم پہنچا لی کہ انگریزی زبان میں تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مذاہب اور عمرانیات کا مطالعہ کر سکا، اور کبھی مجھے علمی مضامین کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی۔

اب تک میری اور میرے بھائی کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھی، مگر ۱۹۲۰ء سے ہم دونوں کی راہیں الگ ہو گئیں۔ بھائی نے اخبار نویسی کو عملاً چھوڑ دیا اور میں بالکل اسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں تاج الدین صاحب نے جبل پور سے پھر "تاج" نکالا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا، پھر روزانہ ہو گیا اور میں تنہا اس کو چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا (جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا) اس زمانے میں وہاں مسلمانوں کی طرف سے بولنے والا کوئی نہ تھا اس لیے مجبوراً مجھے تقریریں بھی کرنی پڑیں، حالانکہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ بہر حال اس دوسری مرتبہ جبل پور کے قیام نے مجھے دو بڑے فائدے پہنچائے: ایک یہ کہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی جو پہلے نہ تھی۔ میں پہلے ذمہ داری کے کاموں سے گھبراتا تھا اور جب کوئی ایسا کام درپیش ہوتا تھا تو میں جھجکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا تھا۔ لیکن جبل پور میں جب میں نے تنہا کسی دوسرے کی مدد کے بغیر صرف اپنی ذمہ داری پر اخبار نویسی اور پبلک

کی خدمت کی، تب مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر کچھ مخفی قوتیں ہیں جو ضرورت کے موقعہ پر خود اُبھر آتی ہیں اور میری مدد کرتی ہیں۔ اس وقت سے پھر کبھی مَیں کسی ذمّہ داری کو قبول کرنے میں نہیں جھجکا۔ دوسرا فائدہ مجھے یہ حاصل ہوا کہ مَیں اپنی زندگی میں کلیتہً خود مختار ہو گیا اور جبل پور میں مجھے خود اختیاری کو عملاً برتنے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے مَیں ہمیشہ کسی نہ کسی عزیز کے ساتھ رہا تھا اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کی کمزوری کسی نہ کسی حد تک میرے اندر موجود تھی۔

جبل پور کی زندگی زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکی۔ بدقسمتی سے میرے ایک مضمون پر حکومت نے گرفت کی اور چونکہ اخبار کے ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا اس لیے ان پر مقدمہ چلا دیا گیا۔ گو اس طرح مَیں حکومت کی گرفت سے بچ گیا، لیکن مجھے اس سے بچنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی اور آئندہ کے لیے مَیں نے عہد کر لیا کہ دوسروں کی ذمہ داری پر اخبار نویسی نہ کرونگا، بلکہ اپنی ہر جنبشِ قلم کی ذمہ داری خود اپنے سر لوں گا۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے خاتمے پر مَیں دہلی واپس ہوا۔ سنہ ۱۹۲۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا جب میری ملاقات مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب صدر و ناظم جمعیتہ علمائے ہند سے ہوئی۔ اسی سال انہوں نے

جمعیتہ علمائے ہند کی طرف سے اخبار "مسلم" نکالا اور مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ اخبار ۱۹۲۳ء تک جاری رہا اور آخر تک میں ہی اس کا ایڈیٹر رہا۔

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ میرے لیے سخت مصائب، خانہ بدوشی اور پراگندہ حالی کا زمانہ تھا اس لیے گو مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا افسوس تھا، مگر میں اس نقصان کی تلافی کرنے پر قادر نہ تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھ کو اطمینان کے ساتھ دہلی میں بیٹھنا نصیب ہوا تو پھر تکمیلِ تعلیم کی طرف توجہ کی اور اخبار نویسی سے جو کچھ وقت بچا اسے مختلف اساتذہ سے عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے میں صرف کیا۔ اور ہر فن کے متعلق ضروری استعداد بہم پہنچائی۔

۱۹۲۳ء میں "مسلم" بند ہو گیا اور میں نے حیدرآباد کے قصد سے دہلی چھوڑ دی۔ لیکن راستے میں بھوپال نے دامن پکڑ لیا اور میں نے حیدرآباد کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بھوپال میں ڈیڑھ سال تک میں ہمہ تن مطالعہ میں مشغول رہا اور بجز ایک دو مضامین کے تحریر کا کوئی کام نہ کیا۔ ۱۹۲۴ء کے آغاز میں پھر دہلی واپس آ گیا۔ وہاں مولانا محمد علی مرحوم سے مراسم پیدا ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ مجھے "ہمدرد" میں اپنا مددگار بنائیں لیکن اسی زمانے میں مولانا احمد سعید صاحب نے جمعیتہ علمائے ہند کی جانب سے اخبار "الجمعیتہ" نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا اور قدیم تعلقات کی بنا پر مجھے "الجمعیتہ" کو "ہمدرد" پر ترجیح دینی پڑی۔ اس کے علاوہ ترجیح کی دوسری

وجہ یہ بھی تھی کہ میں فطرۃً خود مختاری کو پسند کرتا ہوں اور کسی دوسرے شخص کے ماتحت کام نہیں کر سکتا، خواہ وہ میرے نزدیک کتنا ہی محترم ہو۔ غرض ۱۹۲۵ء کی ابتدا سے "الجمعیۃ" کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۲۸ء کی انتہا تک میں اس اخبار کو تنہا اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا۔ اس زمانے میں اخبار نویسی کے ساتھ مختلف علوم کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ عربی کے درسیات میں سے بعض انتہائی کتابیں جو رہ گئی تھیں ان کا درس بھی لیا اور دو کتابیں بھی لکھیں جو "الجہاد فی الاسلام" اور "دولت آصفیہ و حکومت برطانیہ" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

اس زمانے میں میں نے جرمن زبان بھی سیکھنے کی کوشش کی، مگر جن صاحب سے میں نے پڑھنا شروع کیا تھا وہ ڈیڑھ مہینے سے زیادہ دہلی میں نہ رہے اس لیے میں اپنے ارادے کی تکمیل میں ناکام رہا۔

اب وہ زمانہ آیا جب دس سال کے مسلسل تجربات نے مجھے ہندوستان، اور خصوصاً اردو زبان کی اخبار نویسی سے بالکل بیزار کر دیا تھا، اور میرے لیے یہ زندگی سوہانِ روح ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ۱۹۲۸ء کے خاتمے پر میں نے "الجمعیۃ" سے قطع تعلق کر لیا اور آئندہ کے لیے تصنیف و تالیف کے شغل کو اپنے لیے پسند کیا۔ لیکن جن مضامین سے مجھ کو دلچسپی ہے ان پر تحقیقات کے لیے دہلی میں مواد بہم پہنچنا مشکل تھا، اس لیے پھر اسی سرزمین کی طرف مجھے رخ کرنا پڑا جہاں سے بارہ برس قبل میں یہ سمجھ کر نکلا تھا کہ اب شاید کبھی یہاں

آنا نصیب نہ ہوگا (دسمبر ۱۹۲۸ء میں میں حیدرآباد پہنچا اور اگست ۱۹۳۰ء تک یہاں رہا) اس مدت میں میں نے "تاریخ آل سلجوق" تالیف کی۔ اور ابن خلکان کے ان حصوں کا ترجمہ کیا جو مصر کے فاطمی خلفاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگست ۱۹۳۰ء میں بیمار ہو کر میں دہلی واپس چلا گیا۔ چند مہینے وہاں رہ کر صحت درست کی پھر چند مہینے بھوپال میں رہ کر ایک مفصل تاریخ دکن کا مواد فراہم کرتا رہا جسے لکھنے کا میں ایک عرصے سے ارادہ کر رہا تھا۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں پھر حیدرآباد واپس آیا اور تاریخ دکن کا مواد فراہم کرنے میں منہمک ہو گیا۔ اس سلسلے میں میں نے نظام الملک آصف جاہ اول کی سیرت لکھی جو عنقریب مکمل ہو جائے گی اور ایک مختصر تاریخ دکن لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ آج کل میں جامعہ عثمانیہ کے لیے علامہ صدر الدین شیرازی کی کتاب "الاسفار الاربعہ" کا ترجمہ کر رہا ہوں جو عربی میں فلسفے کی ایک ادق کتاب ہے۔

(تحریر و انشا کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب میں نو برس کا تھا۔ اس زمانے میں میرے ایک قریبی عزیز جناب اشفاق حسین صاحب زاہدی (صاحب "فراست الید") جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت تک ہمارے ہاں رہے۔ انہوں نے

ہم دونوں بھائیوں کے دلوں میں انشا پردازی کا شوق پیدا کیا اور درسی کتابوں کے علاوہ عام رسالے اور اخبارات پڑھنے کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ اپنے خیال میں یہ سمجھ لو کہ تم کسی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہو اور اپنے اس خیالی معشوق کو خط لکھو جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا اظہار ہو۔ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بالکل نابلد تھے، اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق اور معشوق اور محبت اور ہجر کے تصور کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مگر اس زمانے میں **گلستاں بوستاں** پڑھ چکا تھا اور اس سے صرف اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے۔ اور اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے جو صرف اس کے ملنے ہی سے بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک غریب بیمار جلتا رہتا ہے اور اس حالت کا نام ہجر ہے۔ ان معلومات کو ہم نے اس وقت اپنی بساط کے مطابق خوب استعمال کیا اور ایک ایک ملیا چوڑا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ بھائی اشفاق کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا، مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ ان خطوں کو دیکھ کر پھڑک گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ میرے خط کو انہوں نے زیادہ پسند کیا تھا۔ اگرچہ عبارت کے اعتبار سے بڑے بھائی کا خط زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

اس کے بعد گو مجھے ایک مدت تک لکھنے کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا، کیونکہ والد مرحوم کی شدید نگرانی کی وجہ سے اپنا بیشتر وقت تعلیم میں صرف کرنا پڑتا تھا۔ مگر تعلیم سے جو کچھ وقت بچتا تھا اس میں اردو کی مختلف کتابیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا جس سے مختلف مضامین اور اسالیب بیان ذہن نشین ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں مولوی کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مجھے تھوڑی سی فرصت میسر آگئی اور والد مرحوم نے دماغ کو آرام دینے کی ہدایت فرمائی۔ اس فرصت کے زمانے میں اپنے بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی تحریک پر میں نے قاسم امین بے کی کتاب "المرأۃ الجدیدۃ" کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اب خدا جانے اس ترجمے کے اوراق کہاں ہیں، مگر مجھے خوب یاد ہے کہ اس ترجمے کی روانی اور سلاستِ زبان اور چٹخارے دار محاورے دیکھ کر والد مرحوم بہت خوش ہوئے تھے اور بھائی نے بھی خوب داد دی تھی۔

یہ میری ابتدائی مشق تھی۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں بھوپال میں قیام ہوا اور عام مطالعے کے ساتھ انشا پردازی کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اب شاید مرنے سے پہلے پیچھا نہ چھوڑے گا۔ ابتدائی تین چار سال تک تو مشقی کی حالت تھی جس کا اندازِ تحریر پسند آجاتا تھا اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا میں یہ محسوس کرتا گیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا نہیں ہے بلکہ خود اپنے انداز میں لکھنا ہے۔ ۱۹۲۱ء سے

خود اپنا مستقل رنگ اختیار کیا ہے جس میں میں کسی کا مقلد نہیں ہُوں۔ میں اس نظریے کا قائل ہُوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی الفاظ ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیے، باقی رہے الفاظ تو ان کے انتخاب میں الجھنے کی ضرورت نہیں وہ آپ سے آپ مضمون کے ساتھ آجائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جب کبھی کچھ لکھنا ہوتا ہے تو میں اپنی تمام تر کوشش صرف خیالات کو مجتمع کرنے اور دلائل و شواہد اور مواد فراہم کرنے میں صرف کرتا ہوں اور جب دماغ میں مضمون مرتب ہو جاتا ہے تو پھر اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔ الفاظ کے انتخاب سے میری بے اعتنائی ایسی بڑھی ہوئی ہے کہ اکثر و بیشتر میں لکھنے کے بعد نظر ثانی بھی نہیں کرتا، اِلّا اس صورت میں جب کہ کوئی خاص ذمہ داری کی تحریر لکھنی ہو۔

شخصیت — چند اشارے

(۱)

جو شخص دوسروں کا اثر قبول کر کے اپنا رنگ چھوڑ دے اور ان کے رنگ میں رنگ جائے، لامحالہ اس کے اندر تلون، چھچھورپن، سرعتِ انفعال اور خفیف الحرکتی کا مرض ضرور ہوگا۔

میرا مزاج کچھ اس قسم کا ہے کہ کچا کام کرنے پر میری طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔

میں ذاتی طور پر یہ تو گوارا کر سکتا ہوں کہ آدمی یا لوگوں کا ایک طبقہ محض سوسائٹی کی بہتری کے لیے جان دے دے، قید ہو جائے یا سخت صعوبتیں برداشت کرے مگر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اچھے سے اچھے مقصد کے پیش نظر بھی اپنی خودی ختم کر دے، شخصیت کی قربانی دے یا اپنی فطرت اور اپنی روح سے ہاتھ دھو لے۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے پروپیگنڈا اور شخصی نزاعات اور سب و شتم کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ بزرگان قوم کی پگڑیاں اچھالنے والوں، اور سیاسی اختلافات کو ذاتی عداوت میں تبدیل کرنے والوں کی روش سے میں ہمیشہ بیزار رہا ہوں۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھی جانتے ہیں۔

میں اس سپہ سالار کو احمق سمجھتا ہوں جو اپنی فوج کے کمزور پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، جو تیلے الفاظ سے اس میں طاقت کا جھوٹا پندار پیدا کرتا ہے، اور اسے خطابت کی شراب پلاتا ہے تاکہ وہ مدہوش ہو کر تباہی کی خندقوں میں کود پڑے۔

میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں جذبات سے مغلوب ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ نرمی اور سختی جو کچھ بھی اختیار کرتا ہوں جذبات کی بنا پر نہیں، بلکہ ٹھنڈے دل سے یہ رائے قائم کرنے کے بعد اختیار کرتا ہوں کہ اس موقع پر واقعی ایسا کرنا چاہیے۔

خدا کے فضل سے میں کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور کہا کرتا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے، تول تول کر

کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے نہ کہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ مجھی خلافِ حق نہیں کہا اور جو کچھ کہا اس کا کہنا خدمتِ دین کے اس مرحلے پر ناگزیر تھا۔ اس کے کہنے پر نہیں، بلکہ نہ کہنے پر مجھے اندیشہ تھا کہ میں ماخوذ ہوں گا۔

یہ تحریف جو دین میں کی جارہی ہے، اگر میں اس کے آگے سپر ڈال دوں اور جس وضع قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں، اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں تو میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہونگا جس کے لیے اللہ کے ہاں مجھ سے سخت باز پُرس ہوگی اور اس باز پُرس میں کوئی میری مدد کے لیے نہ آسکے گا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو اس اُخروی خطرے میں ڈالوں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اخلاقی پستی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی بستیوں میں خدا کا قانون توڑنے والے مزے سے دندناتے پھرتے ہیں اور رب العٰلمین کے قانون کی پابندی کرنے والے اور اس کی اطاعت کی تلقین کرنے والے اُلٹے نکو بن جاتے ہیں۔

میرے برادرانِ دینی خواہ میری بات سُنیں یا نہ سنیں مگر میں تو یہی کہتا رہونگا کہ تمہارے لیے اب اس کے سوا کسی چیز میں خیریت نہیں ہے کہ سچے مسلمان بنو اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہارا جو فرض ہے اسے ادا کرو۔

میرے جرأت آمیز الفاظ سے آپ کو شاید یہ گمان گزر رہا ہوگا کہ میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں۔ حالانکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ بڑے مراتب تو درکنار اگر صرف سزا سے بچ جاؤں تو

تو یہ بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے۔

یہ ایک لاحاصل سوال ہے کہ میں نے کس عالم سے فیض حاصل کیا ہے یہ سوال تو اس سے کرنا چاہیے جس نے کوئی علمی کام نہ کیا ہو اور جس کے علمی مرتبہ و مقام کو جاننے کے لیے مدرسہ کی سند اور اُستادوں کے ناموں کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔ میں نے کام کیا ہے اور میرا کام کوئی چھپا ہوا نہیں بلکہ چھپا ہوا سب کے سامنے موجود ہے اس کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ میں نے کیا کچھ پڑھا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے اسے کتنا ہضم کیا ہے۔

موجودہ زمانے کی عام بگڑی ہوئی فضا میں کسی شخص کا بدگمانیوں سے بچنا مشکل بھی ہے اور بدگمانی کرنے میں بندگانِ خدا حق بجانب بھی ہیں۔ دعا کیجیے کہ اللہ ہم سب کو بھلا انسان بنائے اور ہماری قوم کے اخلاقی ماحول کو درست کر دے۔

اولاد خدا کی نعمت بھی ہے اور امانت بھی۔ نعمت کا شکر ادا کیجیے اور امانت کی ذمہ داری نہ بھولیے۔

پہلے میں نے اس لیے بچوں کو لانے سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کے ذہن پر یہاں کے ماحول کا برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ مگر اب غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہیں یہ جگہ ضرور دکھا دینی چاہیے۔ کیا عجب کہ کل جو نسل اٹھنے والی ہے وہ موجودہ نسل سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی ہو اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو ہم سے بھی زیادہ سخت جدوجہد کرنی پڑے۔ میں اپنی اولاد کو عیش کے لیے نہیں پالنا چاہتا بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لیے پالنا چاہتا ہوں۔

میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں اور انہی کمزوریوں کا احساس ہے

جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوند عالم سے علم صحیح اور عقل سلیم کے لیے دُعا کروں محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کر کے اس کام پر آمادہ کیا ہے جس کے دشوار گذار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف، اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف، میری روح لرز اُٹھتی ہے۔ بہر حال محض خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور ان تمام حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر جن کی طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں، اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔

خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی سے مجھ کو کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں۔ جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بطلان پر بھی دلائل بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے تو میں اپنی رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ اُن کی پارٹی یا اُن کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے

لوگوں کے غیظ و غضب کی مجھے کچھ پروا نہیں۔ مَیں نہ ان کی گالیوں کا جواب دوں گا اور نہ اپنے طریقے ہی سے ہٹوں گا۔

میری یہ صاف گوئی ان حضرات کو یقیناً بہت بُری معلوم ہو گی جو رجال کو حق سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں، اور اس کے جواب میں چند اور گالیاں سننے کے لیے مَیں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔ مگر مَیں جب دیکھتا ہوں کہ مذہبی پیشوائی کی مسندِ مقدس سے مسلمانوں کی غلط رہنمائی کی جا رہی ہے، ان کو حقائق کے بجائے اوہام کے پیچھے چلایا جا رہا ہے اور خندقوں سے بھری ہوئی راہ کو شاہراہِ مستقیم بتا کر انہیں اس کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تو مَیں کسی طرح اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ کوشش بھی کروں تو میرے اندر اس پر صبر کی طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا ب مجھے اس پر راضی ہو جانا چاہیے کہ جو کوئی میری صاف گوئی پر ناراض ہوتا ہو تو ہو جائے۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ

مفادِ دین و امت کے تقاضے

میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہو سکتی کہ اپنی قوم کے جن اکابر کا انتہائی احترام میرے دل میں ہے، ان کے خلاف زبان کھولوں۔ اکابرِ قوم تو درکنار ایک عامی مسلمان کی عزت بھی میرے لیے نہایت بیش قیمت ہے۔ لیکن صرف دو چیزیں ہیں جو مجھ کو اس وقت زبان کھولنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ ایک یہ کہ میرے نزدیک خدا کا دین اور اس کی امتِ مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شے اور ہر تعلق سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اس کو نقصان پہنچا رہا ہے تو میں اس کی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین عزیز ہو، دوست ہو، استاد ہو یا میری قوم کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس معاملے میں کسی تعلق یا کسی نیازمندی کی پروا کرنے سے میں بالکل معذور ہوں۔ جس کسی کو میرے اس طرزِ عمل سے تکلیف ہو وہ اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دے گا تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہوں گا خواہ وہ دنیوی اعتبار سے حقیر ترین آدمی ہو۔ اور اگر وہ محض شکایت کرے گا تو میں صاف عرض کروں گا کہ حق کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے، اپنے اور پرائے کی تمیز سے مجھے معاف رکھا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس شخص کو میں دینی یا قومی معاملے میں غلطی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں خود اس کی عاقبت کا خیال مجھے مجبور کرتا ہے کہ دنیا ہی میں اس کو اصلاح کی طرف لانے کی کوشش کروں۔ میرے نزدیک ہر مسلمان کا اور خصوصاً مسلمانوں کے علماء اور اکابر کا میرے اوپر یہ حق ہے کہ ان کو ایسی غلطیوں سے بچانے کی کوشش کروں جن کے متعلق میں اپنی تحقیق کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں وہ ان پر ماخوذ ہوں گے۔ اور یہی حق میرا بھی دوسروں پر ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں۔ لوگوں کو میری نیت پر شبہ کرنے کا اختیار ہے مگر میرا ضمیر اپنی جگہ مطمئن ہے کہ میں جس سے اختلاف کرتا ہوں اس کی سچی خیر خواہی میرے دل میں ہوتی ہے، نہ کہ بدخواہی۔

کھری معاملت

پچھلی ملاقات کے موقع پر میں یہ کہنا بھول گیا کہ اب "ترجمان القرآن" کے بند ہونے کا باقاعدہ اعلان ہی کر دینا مناسب ہے۔ اگست ۴۸ء سے اب تک پونے دو سال میں ہم رسالہ کے خریداروں کو صرف پانچ پرچے دے سکے ہیں۔ پہلے ڈیکلریشن منظور کرنے میں حکومت نے چھ مہینے لگا دیے تھے۔ اب پھر میری گرفتاری کے بعد دوسرے ڈیکلریشن کی منظوری میں مہینوں

کی دیر لگا دی گئی۔ ان حالات میں رسالہ کا جاری رہنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ نہ تو میرے مالی حالات ہی اس کی اجازت دیتے ہیں کہ رسالہ کے اسٹاف کو خواہ مخواہ روکے رکھوں اور ان کے معاوضے مفت دیتا رہوں۔ اور نہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ لوگوں کا چندہ میرے پاس غیر معلوم مدت تک رکا رہے اور اس کا بدل ان کو نہ ملے۔ اس وقت تو میں اس قابل ہوں کہ ان کے چندے انہیں واپس کر سکتا ہوں مگر آگے کے حالات کچھ معلوم نہیں کیا رنگ اختیار کریں۔ بالفرض اگر میں آئندہ اس پرچے کو جاری رکھنے کے قابل بھی نہ رہا اور لوگوں کے چندے واپس کرنے کی طاقت بھی مجھ میں نہ رہی تو خدا کے ہاں کس کس کے حساب کی جواب دہی کر سکوں گا۔ لہٰذا آپ مقامی احباب کے مشورے سے پرچے کی بندش کا اعلان کر دیں اور خریداروں کو ایک گشتی چھٹی بھیج کر ان سے پوچھ لیں کہ آیا وہ نقد رقم واپس لینا چاہتے ہیں یا کتابوں کی صورت میں۔ جو لوگ نقد چاہیں انہیں نقد ادا کی جائے اور جو کتابیں چاہیں انہیں مکتبہ سے کمیشن پر کتابیں لے کر بھیج دی جائیں۔ ہر خریدار کا حساب اس کی گشتی چھٹی میں درج کر دیا جائے کہ اس کا کتنا چندہ ہمارے ذمہ باقی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آئندہ اس پرچے کو پھر جاری کرنے کی توفیق بخشی تو ان خریداروں کو اطلاع دے دی جائے گی۔

چراغ الدین صاحب کے لیے کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کرنے کی

کوشش کی جائے۔ سردست پرچے کے حسابات بند کرنے کے لیے شاید ایک دو مہینے ان کو روکنا ہوگا۔ تاہم اگر اس مدت کے اندر ہی انہیں کوئی دوسری جگہ مل جائے تو ان کو ہرگز نہ روکا جائے۔ آپ خود ان سے چارج لے لیجیے گا اور مقامی رفقاء کی مدد سے خریداروں کے حسابات صاف کر دیجیے گا۔

(مکتوب بنام مولانا ابوالخیر صاحب مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۴۹ء)

نہ تملق نہ بدزبانی

مجھے یہ معلوم کرکے بہت تعجب ہوا کہ مجھ سے ہمدردی رکھنے والے کسی شخص نے قائداعظم مرحوم اور ان کی ہمشیرہ محترمہ کے بارے میں کریہہ اور نازیبا کلمات استعمال کیے۔ یہ بات میرے طریقے اور مسلک کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنی پوری پبلک لائف میں گالیاں کھائی تو بہت ہیں مگر الحمدللہ کہ کبھی گالی دی نہیں۔ میں نے اصولاً جس کی رائے اور پالیسی کو صحیح سمجھا ہے اس کی تائید کی ہے اور جس کی بھی رائے یا پالیسی سے مجھے اتفاق نہیں رہا ہے اس پر بےلاگ تنقید کی ہے، مگر نہ میں تملق سے کبھی ملوث ہوا ہوں اور نہ بدزبانی سے۔ شخصی طور پر میں نے ہمیشہ ان لوگوں کا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے جن سے قومی یا دینی معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ میں صرف ایماندارانہ

اور بامقصد تنقید کا قائل ہوں، اور خدا اور رسول کے سوا کسی کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ آپ نے ان حضرت کے نازیبا جملوں کے جواب میں مجھ پر یا میرے گھر والوں پر جو بھی حملے کیے ہوں میں انہیں صدق دل سے معاف کرتا ہوں۔ (جزاہ اللّٰہ تبارک وتعالٰی فی الدارین خیراً) بلکہ میری طرف سے ان سب لوگوں کے لیے عام معافی ہے جو میرے پیچھے یا میرے سامنے مجھے گالی دیں۔ مجھے کبھی اس سے خوشی نہیں ہو سکتی کہ میری وجہ سے کوئی خدا کے ہاں ماخوذ ہو۔ آگے خدا کو اختیار ہے، جسے چاہے معاف فرمائے اور جسے چاہے پکڑے۔

(حافظ ریاض احمد صاحب کے نام)

معروف کردار

صحرائی صاحب کی مجھ سے یا میرے رفقاء سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس بات کی تو سرکاری ذرائع سے بھی تحقیق کی جا سکتی ہے کہ آخر وہ مجھ سے کب ملے اور کیسے مل سکتے تھے؟ آپ کے باقی ماندہ سوالات ایسی صورت میں غیر متعلق ہو جاتے ہیں جبکہ میرے سے کوئی ملاقات ہوئی ہی نہیں۔

برادرم! میں اس وقت ایسی پوزیشن میں ہوں کہ اپنے خلاف کسی الزام

کی تردید کرنا تو در کنار اکثر حالات میں یہ جاننا بھی میرے لیے مشکل ہے کہ باہر کیا الزام مجھ پر لگایا جا رہا ہے۔ یہ ایک نادر موقعہ ہے۔ جس کے لیے بھی مجھ پر حملہ آور ہونا مفید ہو سکتا ہو اس کو ضرور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے انسان کا گوشت ویسے ہی ایک لذیذ چیز ہے، پھر جبکہ وہ مفت بٹ رہا ہو تو ہمارے موجودہ اخلاقی ماحول میں بھلا ایسے زاہد کتنے نکل آئیں گے جو اس سے متمتع ہونے میں تامل کر جائیں۔

صحرائی صاحب نے تو جو کچھ کیا اس کا مجھے کوئی رنج نہیں، کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے، اور جانتے بھی ہوں تو ان کے کرنے کا کام وہی ہے جو انہوں نے کیا۔ مگر آپ نے جو مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا تو نے پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار کیا اور کیا تو نے قائد اعظم مرحوم کو گالیاں دیں، اس سے فی الواقع مجھے بڑی اذیت ہوئی، کیونکہ آپ سے میری توقعات کچھ اور تھیں۔ برادرِ عزیز! کیا اب کوئی ذلیل سے ذلیل بہتان بھی میرے مرتبے سے اتنا فروتر نہیں رہا کہ آپ اسے سن کر سُبحانک ہٰذا بہتانٌ عظیم کہہ سکیں اور مجھ سے اس کے دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھیں؟ اور بالفرض اگر تحقیق کرنا ضروری ہی تھا تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی اجنبی یا غیر معروف آدمی تو نہیں ہوں۔ کم و بیش تیس سال سے پبلک لائف میں ہوں۔ برسوں اخبار نویسی کر چکا ہوں۔ سترہ اٹھارہ برس سے "ترجمان القرآن" نکال رہا ہوں۔ کتابوں

اور رسالوں کی شکل میں میرے لکھے ہوئے ہزاروں صفحے موجود ہیں جن کو بلا مبالغہ لاکھوں آدمی پڑھ چکے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں ہزارہا آدمی ایسے موجود ہیں جنہوں نے اپنے کانوں سے میری تقریریں سنی ہیں۔ ہزاروں آدمی ذاتی طور پر میرے جاننے والے موجود ہیں۔ خود شہر لاہور میں برسوں رہ چکا ہوں۔ آپ نے کیوں نہ پبلک میں اعلان کیا کہ جو شخص ابوالاعلیٰ کو ایک بدزبان اور یاوہ گو انسان کی حیثیت سے جانتا ہو، یا جس نے اس کو کبھی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن و بدخواہ کی حیثیت سے جانا ہو وہ اپنی شہادت پیش کرے؟ آپ نے کیوں نہ میرے سنئے اور پڑوسی ہمسایوں سے پوچھا کہ انہوں نے کبھی کوئی گالی یا بیہودہ بات میری زبان سے سنی ہے؟ آپ نے کیوں نہ میرے ذاتی ملازموں سے پوچھا کہ میں نے کبھی ان کو سخت سست کہا ہے یا نہیں، بلکہ جو لوگ وقتاً فوقتاً مجھ کو گالیاں دیتے رہے ہیں، اور آج بھی گالیوں سے نواز رہے ہیں، آپ نے انہی سے قسم دے کر پوچھ لیا ہوتا کہ کبھی میں نے بھی ان کو گالی کا جواب گالی سے دیا ہے؟ یہ ساری شہادتیں اگر دنیا سے ناپید ہو چکی ہوتیں تو البتہ آپ حق بجانب تھے کہ مجھ سے دریافت فرماتے۔

"پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار" اور وہ بھی میری زبان سے! سبحان اللہ! میرے عزیز! تھوڑی دیر کے لیے دین و ملت کے سوال کو بھی

نظر انداز کر دیجیے۔ خالص مادی نقطۂ نظر ہی سے دیکھیے تو بھلا یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے کہ جو شخص خود اپنے بال بچوں سمیت اس کشتی میں سوار ہے وہ اس میں چھید کرے گا؟ کیا وہ خود یہ چاہے گا کہ اس کا اور اس کی بیوی اور بیٹیوں اور بچوں کا وہی حشر ہو جو اس کی آنکھیں مشرقی پنجاب میں اپنی قوم کی بہنوں اور بیٹیوں کا دیکھ چکی ہیں؟ اس قسم کا عجیب سوال مجھ سے کرنے کے بجائے آپ نے جیل کے ڈاکٹر سے پوچھا ہوتا کہ ابوالاعلیٰ اس قید کے زمانے میں کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟ اگر میں عقل و خرد سے محروم نہیں ہوں تو کیا غیرت، حمیت، شرافت سب آپ ہی لوگوں کے حصے میں آگئی ہے؟ میرے اندر اس کا شائبہ بھی نہیں رہا؟

(شورش کاشمیری کے نام)

جان دے سکتا ہوں رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا

آپ کا بالمشافہ معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے، لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بطورِ خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے۔ لیکن ظالم سے رعایت

کا مطالبہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جو کچھ علاج آپ غائبانہ کر سکتے ہوں بس اسی پر اکتفا فرمائیں۔

(حکیم محمد شریف صاحب کے نام)

پٹھان اور مچھر

مجھے اس بات کی بڑی فکر تھی کہ میری نظر بندی کی مدت بڑھنے کا آپ کی صحت پر کچھ برا اثر نہ پڑا ہو۔ اب آپ کے والا نامہ سے یہ معلوم کر کے بہت اطمینان ہوا کہ آپ نے اسے اسی استقلال کے ساتھ برداشت کیا ہے جس طرح ایک مومن خاتون کو برداشت کرنا چاہیے۔ جس راستہ پر میں برسوں سے چل رہا تھا اس میں یہ منزل تو بہر حال آنی ہی تھی۔ حیرت اس کے آنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ اتنی دیر سے کیوں آئی۔ درحقیقت میں تو اسی پر حیران ہوں کہ شیطان اور اس کی برادری نے مجھے اتنے دنوں برداشت کیسے کیا۔ بہر حال اب کہ وہ ادھر متوجہ ہو گئے ہیں، یہ امید نہ رکھیے کہ یہ کشمکش جلدی ختم ہو جائے گی۔ اب اس کا خاتمہ دو ہی طرح ہو سکتا ہے۔ یا میں ختم ہو جاؤں یا وہ اصلاح ہو کر رہے جس کے لیے میں پچھلے ۱۵ برس سے

کام کر رہا ہوں۔ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میری ماں اور بھائی اور بیوی اور بچوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو اپنا دل کڑا کر لینا چاہیے اور ہر بدتر سے بدتر نتیجہ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر آپ لوگ اس طرح کی غلط امیدیں قائم کریں گے جو پچھلے چھ مہینے میں شائد قائم کر لی گئی تھیں، تو بلا وجہ اپنے آپ کو خلاف توقع صدمات سے دوچار کریں گے۔ آپ یقین فرمائیں کہ ایک شیطانی طاقت دنیا میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے، میں خدا کے بھروسے پر اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو چکا ہوں، لہٰذا جو کچھ سامنے آتا ہے وہ میری توقعات سے کم ہی ہوتا ہے اور میرے ارادے پر اس کا اتنا اثر بھی نہیں ہوتا جتنا کسی چٹان پر مچھر کے حملے کا ہوتا ہے، وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ (والدہ ماجدہ کے نام ایک خط کا اقتباس)

ناقابلِ تسخیر ورثہ

اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصدِ زندگی ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی دلیل سے بدلا جا سکے گا تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ شفاخانہ امراضِ دماغی ہے۔

اور اس نے جو یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آ کر میں اپنا ضمیر اس کے ہاتھ رہن رکھ دوں گا اور آئندہ سے راشن کیے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگوں گا، تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرا دل صداقت کے لیے ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری ہر رائے کو علمی و عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا ایمان و یقین کوئی قابلِ بیع و رہن چیز نہیں ہے۔ اس کی کوشش پہلے بھی جس نے کی، ناکام ہوا ہے، اور آئندہ بھی جو کرے گا انشاءاللہ منہ کی کھائے گا۔"

مستحکم نظر! مستحکم سیرت!

میں نے اپنی ۴۹ سالہ عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ اس تیس سال کی مدت میں پڑھ کر، سن کر، سوچ کر اور مشاہدہ و تجربہ کر کے میرے ذہن کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے۔ میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے۔ میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے۔ میں کچھ رائیں رکھتا ہوں جن کی پشت پر برسوں کے مطالعہ سے فراہم کیے ہوئے دلائل ہیں۔ میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے اور ان پر میں پورے قلبی اور دماغی اطمینان کے

ساتھ ایمان لایا ہوں۔ اور کچھ چیزوں کو میں نے باطل پایا ہے اور ان کو قلب و دماغ کے متفقہ فیصلہ کے ساتھ رد کر چکا ہوں۔ میرے ذہن اور ضمیر کے یہ فیصلے میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں رہے ہیں بلکہ میں برسوں سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ ہزاروں آدمیوں کو میں نے اس نصب العین کی طرف کھینچا ہے جسے میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ ہزاروں کو اس حق کا قائل کیا ہے جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا۔ ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی اس جد و جہد میں مبتلا کر دیا ہے جس میں خود مبتلا ہوں۔

تصوّرِ ادب

معاش کے لیے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لیے اینٹیں ڈھو لے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے، یہ کام محض معاش کے لیے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریہ و مسلک پر کرنا ہو گا۔

ترجمان القرآن: تطہیر و تنویر افکار

اس رسالے (ترجمان القرآن) کی ترقی کے لیے بہت سی تمنائیں میرے دل میں ہیں۔ جس طرز پر یہ نکل رہا ہے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ایک زبردست انقلابی طاقت بن جائے۔ خیالات کا رُخ جاہلیت سے اسلام کی طرف پھیر دے۔ افکار کی تطہیر، تنویر اور تعمیر خالص اسلام کے اصولوں پر کرے۔ اسلام جو ایک جامد یادگارِ قدیم بنا کر رکھ دیا گیا ہے اس کو یہ ایک نامی متحرک اور محرک نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کرے۔ اعلیٰ درجہ کی تنقید کے ساتھ دنیا کی ایک ایک گمراہی کا استیصال کرے اور گہری تحقیق کے ساتھ زندگی کے ایک ایک مسئلہ کو اصولِ اسلام کے مطابق حل کرے۔ یہ تمنائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ برس سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں انہیں حاصل کرنے کے لیے خرچ کر رہا ہوں، مگر بدقسمتی سے اکیلا اور تنہا ہوں۔ میری طاقت محدود ہے، وسائل مفقود ہیں، اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں نہیں کر سکتا۔ ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر وہ کمیاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں۔ جس جنون میں مبتلا ہوں اس کا مجنون مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچاتا رہا ہوں ان کے بھی جب قریب جاتا ہوں

تو وہ مجھ سے دُور نظر آتے ہیں۔ ان کی دھن میری دھن سے الگ۔ ان کی گرویدگی کے مرکز میرے مرکزِ گرویدگی سے جدا۔ ان کی روح میری روح سے ناآشنا۔ ان کے کان میری زبان سے بیگانہ۔ یہ دنیا کوئی اور دنیا ہے جس سے میری دنیا مانوس نہیں۔

اسلوبِ تحقیق و ترجمانی

آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ میں نے سنسکرت زبان اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے براہِ راست واقفیت کے بغیر محض یورپین ترجموں کے اعتماد پر اپنی کتاب میں ویدوں سے کیوں بحث کی۔ لیکن آپ نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ الجہاد فی الاسلام بالکل میرے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے جب مذاہب کے معاملہ میں میرا رویہ پوری طرح پختہ نہیں ہوا تھا اور نہ وہ احتیاط طبیعت میں پیدا ہوئی تھی جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اب اگر مَیں اس کتاب کو دوبارہ لکھوں گا تو ہر اس چیز کی جس کی براہِ راست واقفیت کا موقع مجھے نہیں ملا ہے از سرِ نو تحقیق کروں گا۔ آپ اگر اس تحقیق میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو مَیں آپ کا بہت شکر گذار ہوں گا۔ کوئی ہندو عالم

... جو محض حامئ دین (DEFENDER OF THE FAITH) ہی نہ ہو

بلکہ خود محقق بھی ہو اور محققانہ انصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ اگر میری کتاب کے اس حصے پر جو ہندوؤں سے متعلق ہے، تنقید کر کے مجھے بتائے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے تو اس سے مجھے بہت مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں جس میں ہندو مذہب کے مقصدِ جنگ اور قوانینِ جنگ کو بناوٹ کے بغیر، جیسے کہ وہ بجائے خود ہیں، پیش کیا گیا ہو تو مزید باعثِ شکرگزاری ہوگا۔ "بناوٹ کے بغیر" کی شرط میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ آج کل عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مذہب پر، جیسا کہ وہ بجائے خود ہے، ایمان نہیں رکھتے، مگر قومی عصبیت کی خاطر اس مذہب کو اور اپنے مذہبی طرزِ عمل کو "معقول" بنانے کے لیے وہ اکثر موجودہ نظریات کے مطابق ایک نیا مذہب گھڑتے ہیں اور پرانے مذہب کے نام سے اسے پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس طریقہ سے سخت نفرت ہے خواہ اسے مسلمان برتیں یا ہندو یا کوئی اور۔ میرا خود بھی یہ طریقہ ہے اور میں پسند بھی صرف ایسے ہی لوگوں کو کرتا ہوں جو اصل مذہب کو جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، ویسا ہی رہنے دیں اور ویسا ہی اسے پیش کریں۔ پھر اگر وہ ماننے کے لائق ہو تو اسے مانیں اور ماننے کے لائق نہ ہو تو اسے رد کر دیں۔

دیدہ ور سزا

یہ ارشاد کہ "اس سے شبہ کیا جا رہا ہے کہ تو خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرے گا۔" اس کے جواب میں بجز اس کے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہو سکتا جو خدا سے ڈرتا ہو، جسے خدا کے سامنے اپنی ذمّہ داری کا احساس ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی یاد ہو کہ:

اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ، اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو جماعت اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں، میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہیں کر سکیں گے، اور وہ سزا یہ ہے کہ انشاء اللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی اور ان کو بیان کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔

دعویٰ نہیں مدعیوں کی تردید

میری کتاب "تجدید و احیائے دین" جس کی بعض عبارتوں کو غلط معنی پہنا کر وہ مجھے مدعی مہدویت قرار دے رہے ہیں، آج کوئی نئی تصنیف نہیں ہے آج سے دس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک برابر شائع ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہر جگہ آپ کو مل سکتی ہے۔ آپ اس کو خود دیکھیں۔ دو چار سطروں یا چند فقروں کو نہیں، پوری کتاب کو پڑھیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ میں نے اس میں اپنی مہدویت یا مجددیت کا دعویٰ کیا ہے یا دعویٰ کرنے والوں کی تردید کی ہے؟

سچا تجربہ

مولانا ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کے گروہ کے علماء نے میرے خلاف جو پروپیگنڈہ شروع کیا ہے اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ مگر میرے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ بارہا اس طرح کے لوگوں نے طرح طرح کے جھوٹ میرے خلاف پھیلانے کی کوشش کی ہے اور میں نے ہمیشہ ان کے مقابلے میں صبر سے کام لیا ہے۔ میرا اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو

فروغ نہیں دیتا۔

اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا

آپ کو معلوم ہے کہ میں اس قسم کی تحریروں کا جواب کبھی نہیں دیا کرتا، اس لیے یہ اندیشہ نہ فرمائیے کہ ان فتووں کے جواب میں یہاں سے کچھ لکھا جائے گا اور بات بڑھے گی۔ لیکن اس کے ساتھ میرا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو مجھے ٹھوکر مارے میں اُس کے آگے سر جھکا دوں۔ یہ طریقہ نہ اس کام کی غرض کے مطابق ہے جسے میں کر رہا ہوں اور نہ اس طریقے سے فی الواقع دین ہی کی کوئی مصلحت پوری ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ اگر دیانت اور سچائی کا ہتھیار لے کر حملہ آور ہوتے اور مجھ میں یا جماعت اسلامی کی تحریک و نظام میں کوئی ایسی خرابی پاتے جو فی الواقع ان کے دلائل سے ثابت ہوتی تو میں یقیناً ان کے آگے جھکتا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے اپنی اصلاح کرتا لیکن انہوں نے ہتھیار جھوٹ کا استعمال کیا ہے اور حملہ آور ہونے میں دنائت کی راہ اختیار کی ہے، اس لیے میں ان کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کروں گا جو ایک شریف آدمی کو کرنا چاہیے۔ یعنی اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔

مولانا صاحب موصوف اور ان کے ساتھیوں نے یہاں آکر مجھ سے جو باتیں کیں اور پھر واپس جا کر جو خطرے کی گھنٹی بجائی، ان دونوں کے فرق پر جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دل خدا کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے بالکل خالی ہو چکے ہیں، اور انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا ہے، آگے کوئی نہیں جہاں اپنے اقوال و اعمال کا انہیں حساب دینا ہوگا۔

میرا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے اور میں آئندہ بھی اسی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خدا کے خوف سے خالی پاتا ہوں ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بدلہ لینا میرے بس میں نہیں ہے، خدا ہی ان سے بدلہ لے سکتا ہے۔ اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ ان کے جھوٹ کی تردید کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ ان کا پردہ انشاء اللہ دنیا ہی میں فاش ہوگا۔ اس لیے آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں ان کے جواب میں کوئی بیان کسی اخبار کو بھیجوں گا۔

میری ذات پر جو حملے کیے جائیں ان کی مدافعت آپ لوگوں کے ذمے نہیں ہے۔ اگر میرے منع کرنے کے باوجود آپ لوگ اس سے باز نہ رہ سکیں تو براہِ کرم اس معاملے میں حدِ اعتدال سے بھی کچھ کم ہی پر اکتفا کریں۔ زیادہ سے زیادہ بس اس قدر کافی ہے کہ اگر کوئی الزام مجھ پر لگایا جائے یا کوئی علمی اعتراض مجھ پر ہو تو اپنے علم کی حد تک اس کی تردید کر دیں، یا مجھ سے اس کی حقیقت پوچھ لیں اور اس کا جواب دے دیں۔ باقی رہی میری تذلیل و تحقیر تو اس پر میرے کسی دوست یا رفیق کو بُرا ماننے کی ضرورت نہیں۔ اسے میں پہلے ہی ہر ایک کے لیے معاف کر چکا ہوں۔ اور ہمارے موجودہ دور کے بزرگانِ دین کے لیے تو وہ آپ سے آپ مباح ہے خواہ اسے کوئی معاف کرے یا نہ کرے۔ وہ چاہے کتنے ہی صریح اور رکیک الفاظ میں دوسروں کو جاہل، احمق، گمراہ، اور بے دین کہہ دیں، قابلِ مواخذہ نہیں۔ البتہ دوسرا اگر ان کی کسی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ٹوک دے، خواہ کتنے ہی ادب و احترام کے ساتھ ٹوکے، وہ تنقیص اور تحمیق کا مجرم ہے۔ اس کا مستقل زخم ان کے شاگردوں اور مریدوں کے دلوں پر لگ جاتا ہے اور مدت العمر رِستا رہتا ہے۔ یہ عالی ظرف لوگ ہیں، ان کی کسی بات پر بُرا نہ ماننا چاہیے۔

عنقائے بلند آشیاں

"(کسی کام کو تجدیدی کام کہنے سے) یہ لازم نہیں آتا کہ جو تجدیدی کام کرے وہ مجدّد کے لقب سے بھی ملقّب ہو، صدی کا مجدّد ہونا تو اس سے بلند تر بات ہے۔ اینٹیں چن کر دیوار بنانا بہرحال ایک تعمیری کام ہے، مگر کیا یہ لازم ہے کہ جو چند اینٹیں چن دے وہ انجینیر بھی کہلائے اور انجینیر بھی معمولی نہیں، بلکہ اپنی صدی کا انجینیر؟ اسی طرح کسی کا اپنے کام کو تجدیدی کام یا تجدیدی کوشش کہنا، جبکہ فی الواقع وہ تجدیدِ دینِ حق ہی کی غرض سے یہ کام کر رہا ہو، محض ایک امرِ واقعہ کا اظہار ہے اور اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ مجدّد ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور اس صدی کا مجدد بننا چاہتا ہے۔ کم ظرف لوگ بے شک تھوڑا سا کام کر کے اونچے اونچے دعوے کرنے لگتے ہیں، بلکہ کام کا ارادہ ہی دعوے کی شکل میں کرتے ہیں، لیکن کسی ذی فہم آدمی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کام کرنے کے بجائے دعوے کرے گا۔ تجدیدِ دین کا کام ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ خود مولانا (حضرت معترض) کو بھی ہم انہی میں شمار کرتے ہیں۔ میں نے اپنی حدِ استطاعت تک اس خدمت میں حصہ لینے کی سعی کی ہے اور اب ہم چند خدّامِ دین ایک جماعت کی صورت میں اس کے لیے کوشش کرنا چاہتے ہیں

اللہ جس کے کام میں بھی اتنی برکت دے کہ واقعی اس کے ہاتھوں دین کی تجدید ہو جائے وہی درحقیقت مجدد ہو گا۔ اصل چیز نہ آدمی کا اپنا دعویٰ ہے نہ دنیا کا کسی کو مجدّد کے لقب سے یاد کرنا۔ بلکہ اصل چیز آدمی کا ایسی خدمت کرکے اپنے مالک کے حضور پہنچنا ہے کہ وہاں اسے مجدّد کا مرتبہ حاصل ہو۔ مَیں مولانا کے حق میں اسی چیز کی دعا کرتا ہوں، اور بہتر ہو کہ وہ بھی "عنقا را بلند است آشیانہ" کہنے کے بجائے دوسروں کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ ان سے اپنے دین کی ایسی کوئی خدمت لے لے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض اسلامی الفاظ کو خواہ مخواہ ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی رومی عظمت کی تجدید کا داعیہ لے کر اٹھتا ہے اور رومیت کے پرستار اس کو مرحبا کہتے ہیں۔ کوئی ویدک تہذیب کی تجدید کا عزم لے کر اٹھتا ہے اور ہندویت کے پرستار اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔ کوئی یونانی آرٹ کی تجدید کے ارادہ سے اٹھتا ہے اور آرٹ کے پرستار اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ کیا ان سب تجدیدوں کے درمیان صرف اللہ کے دین کی تجدید ہی ایک ایسا جرم ہے کہ اس کا نام لیتے ہوئے آدمی شرمائے اور اگر کوئی اس کا خیال ظاہر کردے تو اللہ کے پرستار اس کے پیچھے تالی پیٹ دیں۔

بارز شخصیت

عدالت میں اسلامی ریاست، اس کے نظام، اس میں ذمیوں کی حیثیت، پاکستان میں اس کے قیام اور اسلامی قوانین کے اجرا، فقہ اور سنت میں مسلم فرقوں کے اختلافات، اسلام کے قوانین جنگ اور ان میں خصوصیت کے ساتھ اسیران جنگ کی حیثیت، اور اسی طرح کے دوسرے دینی اور علمی مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس نوعیت کے جتنے سوالات بھی کیے گئے ہیں ان کے کافی و شافی جوابات عدالت میں نہیں دیئے جا سکے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایسے مسائل پر بحث و گفتگو کے لیے یہ کوئی موزوں شکل نہیں ہے کہ سوال کرنے والا عدالت کی کرسی پر ہو اور جواب دینے والا گواہوں کے کٹہرے میں ان تمام حدود کی پابندی کے ساتھ کھڑا یا بیٹھا ہو جو عدالت میں ایک گواہ کے لیے مخصوص ہیں۔ نیز جس منتشر اور غیر مرتب طریقے سے یہ سوالات گواہوں سے کیے گئے ہیں اس کے ساتھ کسی علمی اور دینی مسئلے پر تشفی بخش بحث نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے تو ضروری ہے کہ آدمی کے سامنے ایک ایک سوال وضاحت کے ساتھ رکھا جائے، پھر اسے موقع دیا جائے کہ اس پر ایک جامع تقریر کر کے اس کے ہر گوشے پر روشنی ڈالے، اور جب تک وہ مسئلہ صاف نہ ہو دوسرا

سوال نہ چھیڑا جائے۔ عدالتی جرح کے انداز میں سوال و جواب کسی علمی مسئلے کی بحث کو مفید نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا۔ علاوہ بریں یہ بات بھی واضح نہیں ہو سکی کہ یہ مسائل اس تحقیقات میں کس مناسبت سے زیر بحث آئے ہیں۔ اگر مناسبت کا پہلا مسلح ہوتا تو خاص طور پر ان مسائل کے اسی پہلو پر اچھی طرح روشنی ڈالی جاتی جس کے لحاظ سے یہ موجودہ تحقیقات سے متعلق سمجھے گئے ہیں۔ بہرحال چونکہ یہ مسائل زیر بحث آگئے ہیں، اور عدالت کی جو روداد یں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں ان سے ان مسائل کے بارے میں بکثرت غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے اس بیان میں ان پر بھی کلام کروں۔

فکر و شخصیت

حکیمانہ اسلوبِ تفہیم

آپ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ میری صحت کے بارے میں بہت متفکر ہیں۔ اس ہمدردی و محبت کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ میری صحت کے معاملے میں ذرا فکر نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل میری صحت جتنی اچھی ہے ایسی صحت تو برسوں سے مجھے نصیب نہ تھی۔ وزن بڑھ گیا ہے۔ خوراک بڑھ گئی ہے۔ نیند اتنی اچھی آتی ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں اتنی اچھی نیند کبھی نہ آئی تھی۔ دماغی اور جسمانی دونوں طرح کی محنتیں پہلے سے زیادہ کر سکتا ہوں اور پہلے سے بہت کم تھکتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے

کہ بلا مبالغہ آج شاید روئے زمین پر مجھ سے زیادہ مطمئن کوئی آدمی نہیں ہے
بال بچوں اور متعلقین کی مجھے فکر نہیں، کیونکہ انہیں خدا کے حوالے کر آیا ہوں۔
قوم کی مجھے فکر نہیں، کیونکہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے جتنی ذمہ داری
مجھ پر تھی وہ سب موجودہ حکمراں گروہ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ جماعت
اور دعوت اسلامی کی مجھے فکر نہیں، کیونکہ گرفتار ہوتے ہی عند اللہ بری الذمہ
ہو چکا ہوں، اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی سو فیصدی یقین رکھتا
ہوں کہ اس کام کو میرے قید ہونے اور رہنے سے قطعاً کوئی نقصان نہ
پہنچے گا، بلکہ اس کے برعکس فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس کے بعد آپ خود ہی
سوچیں کہ مجھ سے زیادہ خوش و خرم اور مطمئن کون ہو سکتا ہے۔ پھر یہاں
غور و فکر اور گہرے مطالعہ کا جو خداداد موقعہ مجھے مل گیا ہے یہ تو وہ نعمت
ہے جس کے لیے میں اپنی بے حد مصروف زندگی میں مدتوں سے ترس رہا تھا۔
آج کل اس نعمت سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہوں اور مگن ہوں۔

(حکیم محمد شریف صاحب کے نام)

میری میعاد قید کی توسیع پر آپ نے جو صدمہ کا اظہار فرمایا ہے یہ تو

ہر حال میں مخلصانہ محبت کا تقاضا ہے جو آپ کو میرے ساتھ ہے۔ لیکن ایک بات اصولی طور پر سمجھ لیجیے کہ جو شخص خدا اور خلق کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھے اور خدا کی راہ میں اس کی خلق کی بھلائی کے لیے کام کرے خدا اس کے ساتھ کبھی بُرا معاملہ نہیں کرتا، اور ظاہر بیں آنکھیں جس چیز کو اس کے حق میں شر سمجھتی ہیں وہ بھی خدا کی طرف سے اس کے حق میں خیر ہوتی ہے۔ یہ بات اگر آپ ذہن نشین کر لیں گے تو انشاء اللہ آپ کو بھی وہی طمانیت قلب حاصل ہو جائے گی جو خدا کے فضل سے مجھے حاصل ہے۔ یہ محض خوش عقیدگی کی بات نہیں ہے بلکہ ایک صریح حقیقت ہے۔ میں جس اصلاح کے لیے کام کر رہا تھا اس کے راستے میں پتھر کے پہاڑ حائل نہیں تھے بلکہ گندگی و غلاظت کے فلک بوس انبار حائل تھے۔ میں نے تو خدا کی رضا کی خاطر اس گندگی کو صاف کرنے کے لیے قدم اٹھا دیا تھا اور جو غلاظت کے چھینٹے مجھ پر پڑنے شروع ہو گئے تھے ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر رہا تھا۔ مگر میرے خدا نے مجھ سے چوہڑوں اور بھنگیوں کا کام لینا پسند نہیں کیا اس لیے اس نے مجھے ایک گوشۂ عافیت میں لا کر بٹھا دیا اور اب وہ گندگی کے انبار انہی لوگوں کے سروں پر اٹھوا کر پھنکوا رہا ہے جن کی وہ گندگی ہے۔ یہ کام ابھی ادھورا ہے۔ ابھی ایک ہی انبار صاف ہوا ہے۔ چند انبار ابھی باقی ہیں، بلکہ غلاظت کا اصلی اور سب سے بڑا ڈھیر ابھی تو جوں کا توں رکھا ہے۔ اس لیے میرے باہر

آنے کا ابھی کوئی موقعہ نہیں ہے۔ جس روز یہ کام تکمیل کے قریب ہوگا آپ لوگ انشاء اللہ مجھے اپنے درمیان پائیں گے۔

(حکیم محمد شریف صاحب کے نام)

ہماری توسیع نظر بندی پر آپ کا اور دوسرے مخلص احباب کا رنج بھی فطری ہے، اور آپ لوگوں کی یہ خواہش بھی اپنی جگہ فطری کہ ہماری اور آپ کی جدائی کا یہ دور ختم ہو، لیکن انسان خواہ جزع فزع کرے یا صبر، بہر حال خدا اپنے قوانین اور اپنے طریقے کسی کی خاطر بدلنے والا نہیں ہے۔ اسے ہمارا اور ہماری قوم کا اور ہمارے سربراہ کاروں کا بہر حال امتحان لینا ہے اور اسی امتحان پر ہم سب کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے یہ امتحان دینا چاہیے اور اس کا ثبوت دینا چاہیے کہ ہم اپنے عقیدے اور نیت اور مقصد میں صالح اور صادق اور مضبوط ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں اپنی قوم کے حق میں بھی دعا کرنی چاہیے کہ وہ آخر کار اپنے آپ کو ایک باشعور اور اصلاح پسند قوم ثابت کرے۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ جھوٹ اور فریب اور ظلم کے ہتھیاروں سے ہمارے خلاف نبرد آزما ہیں ہمیں ان کے حق میں بھی

دعا کرنی چاہیے کہ ان کا بگاڑ اصلاح پذیر ثابت ہو اور وہ اس راہ سے پلٹ آئیں جس پر چل کر دوسری قوموں کے شیاطین اپنا انجام دیکھ چکے ہیں۔

(حکیم محمد شریف صاحب کے نام)

آپ کے تازہ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کی نظر بندی کی طوالت آپ کو اب بہت زیادہ شاق ہو رہی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ چیز ایسی نہیں ہے جس پر آپ یا ہمارے دوسرے احباب مضطرب ہوں۔ یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ سینکڑوں خدا کے بندے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے نفس کی خاطر چوری، ڈاکے، قتل، اور دوسرے جرائم کیے اور ان کی پاداش میں کئی کئی سال کی قیدیں برداشت کر رہے ہیں، انتہائی تکلیف کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لیے نہ یہاں کوئی راحت ہے اور نہ حیاتِ اُخروی کے لیے ہی ان کے پاس کوئی تسلی کا سامان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان یہ سب کچھ چند لمحوں کے عارضی فوائد اور لذتوں کی خاطر برداشت کر جاتا ہے تو کیا ہم کو یہ زیب دیتا ہے کہ جو کچھ ہم نے اپنے نفس کے لیے نہیں بلکہ خدا اور اس کے دین کے لیے کیا اور جس پر ہم ابدی زندگی میں اجر پانے کی توقع بھی رکھتے ہیں، اس کی پاداش

میں بندوں کی کسی انتقامی کارروائی کو ہم ٹھنڈے دل سے برداشت نہ کریں اور اس ذراسی اذیت پر جو ہمیں پہنچ رہی ہے مضطرب ہونے لگیں ہیں تو سمجھتا ہوں کہ بندگانِ نفس کی بہ نسبت بندگانِ حق کو اگر دوگنے اور چوگنے مصائب و شدائد سے بھی سابقہ پیش آئیں تو ان کی پیشانی پر بل نہ آنا چاہیے۔

(حکیم محمد شریف صاحب کے نام)

تاریخ کی شہادت

میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں جنہوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے کیونکہ میدان کے مقابلے سے جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت ہے اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرمانروائی کے لیے نہیں بنائی ہے۔ اسی طرح میرا مطالعہ مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے، اور جن کے لیے حقیقت و صداقت کا روشنی میں آجانا "خطرے" کا حکم رکھتا ہے، اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے "سیفٹی" قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسے اخلاقی بزدلوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولھے پر نہ کبھی چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔

یہ چیز عقل کے خلاف ہے۔ قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور ہزاروں برس کے تاریخی تجربات اس پر شاہد ہیں کہ ان سہاروں پر جینے والے تھوڑی دیر کے لیے چاہے کتنا ہی زور باندھ لیں بہر حال وہ دیر تک نہیں جی سکتے۔ میں اپنی خاطر نہیں، خود ان لوگوں کی خاطر ہی یہ چاہتا تھا کہ یہ ہوش کے ناخن لیں اور سیدھے سیدھے بھلے آدمیوں کی طرح کام کریں۔ اس لیے میں نے باہر بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور اب اندر سے بھی اتمامِ حجت کر دیا۔ اب اگر یہ دنیا کی ہزاروں مرتبہ آزمائی ہوئی حماقتوں کا تجربہ کرنے ہی پر مصر ہیں تو انہیں تجربہ کر لینے دو۔

علمی تنقید کا مطالبہ

جن حضرات علماء نے میرے رسالہ دینیات پر فتوے تحریر فرمائے ہیں میں شخصی طور پر بھی ان کا نیاز مند ہوں، اور ان کے علم و فضل کا بھی احترام میرے دل میں ہے۔ ان تک میری یہ گزارش پہنچا دی جائے کہ فتوے تحریر فرمانے اور انہیں اہلِ فتنہ کے ہاتھ میں دینے کے بجائے وہ براہ کرم میری کتابوں پر علمی تنقید فرمائیں۔ مجھے اپنی کسی غلطی کو غلطی ماننے میں اور اس کی اصلاح کرنے میں نہ پہلے کبھی تامل تھا اور نہ اب ہے۔ البتہ پہلے بھی یہ عرض

کرتا رہا ہوں، اور اب بھی اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جس چیز کو غلطی کہا جاتا ہے اسے تعین کے ساتھ مجھے بتایا جائے تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں مبہم اعتراضات سے یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ چیز کیا ہے جس پر اعتراض ہے۔

متوازن تناسب

خطبات میں عبادات کے دنیوی نہیں بلکہ اخلاقی فوائد کو میں نے زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں اخروی فوائد کا قائل نہیں ہوں یا انہیں کم اہمیت دیتا ہوں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے لوگوں کی نگاہوں سے عبادات کے اخلاقی، اجتماعی اور تمدنی فوائد اوجھل ہو گئے ہیں اور ان کے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے لوگ ان عبادات سے غفلت برتنے لگے ہیں اس لیے میں نے ان پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ نمایاں وہی چیز کی جاتی ہے جو مخفی ہو یا جس سے عموماً لوگ غافل ہوں نہ کہ وہ چیز جس سے پہلے ہی لوگ واقف ہوں۔

میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ میری اور جماعت اسلامی کی اس قدر شدت کے ساتھ مخالفت یکایک اب کیوں شروع ہوگئی ہے اور یہ فتوے کن وجوہ سے دیئے جا رہے ہیں۔ لیکن میں اگر اس کو جان بھی لیتا تو یہ غیر ضروری بحث ہے کہ کسی نے اعتراض کیا تو کیوں کیا۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا اعتراض معقول ہے یا نامعقول۔ معقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے مان لیتے ہیں یا اس کا معقول جواب دیتے ہیں اور اگر نامعقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے ہوا میں تحلیل ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

میرے متعلق اس نزاع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر میں صبر کرتا ہوں اور ان لوگوں کے معاملے کو خدا پر چھوڑتا ہوں جنہوں نے بغیر علم و تحقیق کے یہ بدگمانی لوگوں میں پھیلائی کہ میں اہل حدیث کو حنفی بنانے کی سازش کر رہا ہوں۔ کاش وہ لوگ جو فقہی جزئیات میں کتاب و سنت کی پیروی پر بڑا زور دیا کرتے ہیں۔ اخلاقی معاملات میں بھی کتاب و سنت کی کچھ پیروی کر لیا کریں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ کل میں نے اشتراکیوں کے ساتھ بعض علماء کی موافقت پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہوئے اُن بُرے نتائج کا ذکر کیا تھا جو روسی ترکستان میں اشتراکی مبلغین کے ساتھ علماء کی موافقت سے نہ صرف علماء کے حق میں بلکہ خود اسلام کے حق میں رونما ہوئے۔ آج میری اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے شکایت کی گئی ہے کہ ایک طرف تو تم علماء پر سخت تنقید کرنے سے لوگوں کو روکتے ہو، اور دوسری طرف خود اپنی تنقید کرتے ہو۔ اس قسم کی باتیں ہیں جن کی بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے بعض لوگ "حق" کی عقیدت سے کچھ بڑھ کر "رجال" کی عقیدت میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کو ثابت شدہ واقعات سنا رہا ہوں کہ اشتراکی کارکنوں کے ساتھ روسی ترکستان کے علماء نے ابتداءً جو تعاون کیا تھا اس کا خمیازہ کس بُری طرح سے انہوں نے بھگتا، اور اس کے نتیجے میں کس طرح اسلام اس سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا جو بارہ سو برس تک قبۂ اسلام بنی رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں آپ کے سامنے یہ بھی واقعات ہی پیش کر رہا ہوں کہ بعض اچھے خاصے ذمہ دار علمائے ہندوستان بھی کس طرح اسی غلطی کا اعادہ کر رہے ہیں۔ آپ میری ان دونوں باتوں میں سے کسی کی بھی تردید نہیں کرتے، اور نہیں کر سکتے، لیکن پھر بھی آپ کو شکایت ان حضرات

سے نہیں ہے جو اسلام کے لیے اپنی نادانی سے یہ خطرہ پیدا کر رہے ہیں بلکہ آپ کو اُلٹی شکایت اس شخص سے ہے جو اس نادانی پر ان کو خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی جڑوں پر تیشہ چل جانے سے آپ کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اپنی عقیدت کے بتوں کو ٹھیس لگنے سے ہوتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

نفسی کیفیتوں کی نباضی

آپ کے عنایت نامے سے ان اسباب کا سراغ ملا جن کی وجہ سے دیوبند اور سہارنپور سے لے کر مدرسہ امینیہ تک یکایک یہ طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ممکن ہے اسباب کچھ اور بھی ہوں، لیکن ایک قریبی سبب آپ کا (اور شاید آپ جیسے بعض اور لوگوں کا بھی) وہ بے جا جوش تبلیغ ہے جس سے مغلوب ہو کر آپ نے بطور خود درس و افتاء اور مذہبی پیشوائی کے بڑے بڑے مسند نشینوں کو جماعت اسلامی اور اس کی تحریک کی طرف دعوت دے ڈالی، حالانکہ اس سے بارہا منع کیا جا چکا تھا۔ بعید نہیں کہ آپ کی طرح کے بعض جوشیلے حضرات نے ان دینی مراکز کے گرد و پیش کی دنیا میں بھی پہنچ کر کچھ تبلیغی سرگرمیاں دکھائی ہوں، اور وہ ان حضرات کے

بھڑک اُٹھنے کی موجب بن گئی ہوں۔ آپ تقسیم ہند کے پہلے کی رُوداد یں اٹھا کر دیکھ لیجیے، ان میں جگہ جگہ یہ چیز آپ کو ملے گی کہ لوگوں نے بار بار اکابر علماء کو دعوت دینے پر اصرار کیا ہے اور میں نے ہمیشہ نہ صرف خود اس سے پہلو تہی کی ہے، بلکہ جماعت کے عام ارکان کو بھی (بجز ان لوگوں کے جو خود اس کوچے سے تعلق رکھتے ہوں) تاکید کی ہے۔ دعوت کی غرض سے علماء کے پاس جانا تو درکنار ان کے قریب تک نہ پھٹکیں۔ مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے میرے اس انکار اور مخالفت کے راز کو نہ سمجھا اور آخر کار اس کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ بعض لوگوں نے مجھ پر اُلٹی یہ بدگمانی بھی کی کہ میں نخوت اور تکبّر کی بنا پر مذہبی آستانوں کی حاضری سے انکار کرتا ہوں۔ حالانکہ میرا حال یہ ہے کہ میں اپنے اس نصب العین کی خاطر "کوچۂ رقیب" میں بھی سر کے بل جانے کے لیے تیار ہوں، اور ان شاء اللہ ہمیشہ تیار رہوں گا۔ ان آستانوں سے میرے گریز اور دوسروں کو بغرض دعوت ان کے پاس جانے سے منع کرنے کی وجہ ہرگز وہ نہ تھی جو لوگوں نے بدگمانی کی بنا پر سمجھی، بلکہ ایک دینی مصلحت تھی جس کو میں اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنا پر ایک مدت سے خوب سمجھ چکا تھا۔

مجھے ہر کلمۂ تحسین سے بالکل معاف رکھیے۔ آپ لوگ تو ایک آدھ لفظ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں اور مجھے مدتوں اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے، حتیٰ کہ اپنے سر کی ٹوپی تک بچانی مشکل ہو جاتی ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مذہبی دنیا میں ساری حمد واسطے ان حضرات کے ہے۔ سیاسی دین سیاست کے لیڈروں کی حمد و ثنا جتنی بھی ہو جائے مضائقہ نہیں، بلکہ ان میں سے کوئی بہت زیادہ مقبول ہو جائے تو وہ خود ان حضرات کی زبانوں سے بھی مبالغہ آمیز حمد کا مستحق ہو جاتا ہے لیکن دین کی راہ سے جو شخص آئے اور ان آستانوں کا پروانہ لے کر نہ آئے اس کے حق میں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کلمۂ تعریف بھی ان کے دلوں پر تیر کا سا کام کرتا ہے۔ ان کی اس کمزوری کا لحاظ کر کے اگر آپ لوگ اس طرح کے کلمات زبان سے نکالنا نہ کر دیں تو یہ میرے حق میں بھی بہتر ہے اور اس تحریک کے حق میں۔ میں خدا کے فضل سے کسی تعریف کا حاجت مند نہیں ہوں۔ جو کچھ کر رہا ہوں اپنے اندرونی احساسِ فرض کی بنا پر کر رہا ہوں۔ لوگوں کی تعریف کے بغیر، بلکہ مذمت کے باوجود، انشاء اللہ اپنا کام اسی طرح کرتا رہوں گا۔

اے مریض اپنا علاج کر

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر آپ تنقید کرنا اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آئند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس چیز کو خوش آئند سمجھ کر نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے جسے حلق سے اتارتا ہوں، اور اچھی طرح اس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اس کے اندر پاتے ہونگے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو واقع میں موجود ہے۔ تغافل کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف تغافل برتنا بلکہ ان کے لیے جواز و استحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوش گوار چیز ہے۔ جس سے دل خوب بہلتا ہے مگر اس کی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے جس کے نشے میں مریض سو جاتا ہے، مگر وہ اندرونی خرابیاں دور نہیں ہوتیں جن کے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی انہیں اسی پینک کی خوراکیں دیا کروں۔ ان کی خواہش ہے کہ حسن خیالی

جنت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ آبِ حیواں پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دل فریب طلسم انہوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دیتا، یا اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جن کے لیے ان چیزوں کا سہارا بنا دین اور امت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

استدلال اور گرفت

[نوٹ: مولانا مودودی کی فکر و شخصیت کے بہت گہرے نقوش ان افادات میں مرتسم ہیں جو مولانا نے قلم کاری اور پیشہ و سیاست کے موضوع پر قلم بند کرائے [مولانا مودودی کی مفکر اور فکر انگیز شخصیت کی امتیازی خصوصیت ان کی توحید فکر ہے۔ یہ توحید فکر غالباً عقیدۂ توحید میں ان کے رسوخ اور اشتغال بالقرآن کا ثمر ہے۔ وہ ان تمام امور کو

موضوعات اور واقعات پر جو ان کے زیر نظر آئیں، یا لائے جائیں ایک مفکر کی طرح گرفت کرتے اور اصطلاحی منطقی کی طرح نہیں بلکہ ریاضیاتی منطقی کی طرح بیانات کا مُنات کے مباحث پر استدلال کرتے ہیں یہ دونوں افادات مولانا کی اس امتیازی خصوصیت کا نہایت واضح عکس پیش کرتے ہیں، اسی لیے یہ دونوں افادات اسی سلک میں آراستہ کیے جا رہے ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ فلم کاری پر تبصرہ مدیر فلمیشیا جناب ظہیر احمد صاحب نقش کے استفسارات کے جواب میں قلم بند کرایا گیا تھا، اور پیشہ ور سیاست پر تبصرہ ایک صحافتی ملاقات میں جناب علی سفیان آفاقی صاحب نے قلم بند کیا تھا۔]

(۱)

نقش: فلم سازی کی صورت حال کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

سراسر مہلک

مولانا: میں فلم سازی کی موجودہ صورت کو سارے انسانی معاشرے کے لیے

عموماً اور پاکستانی سوسائٹی کے لیے خصوصاً، نہایت مہلک، نقصان دہ اور نامناسب سمجھتا ہوں۔ موجودہ فلمیں انسان کو حق شناسی بخشنے کے بجائے باطل کا پیرو بناتی ہیں۔ آج کی فلمیں چاہے پاکستانی ہوں اور چاہے غیر پاکستانی، محض ادنیٰ قسم کے کاروباری انداز میں تیار ہوتی ہیں۔ ان میں رقص و سرود، رومان، عریانی، فحاشی اور جنسی کشش پیدا کر کے فلم ساز اپنی دوکان کی رونق بڑھا رہے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان فلموں سے متاثر ہو کر عوام الناس اپنے آباؤ اجداد کے اخلاق کو کس بے نیازی اور بے پروائی سے تباہ کر رہے ہیں۔ ان فلموں کے باعث لوگوں کا چلن کس قدر بگڑ چکا ہے؟ — اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں، بالخصوص آج کے نوجوانوں کی اکثریت ان فلموں کے اثر سے یا تو عملی طور پر فنوطی بن چکی ہے اور یا ذہنی طور پر جرائم پسند ہو گئی ہے

محض جلبِ منفعت

فلم ساز یہ کاروبار محض جلبِ منفعت کی خاطر شروع کرتے ہیں۔ کوئی

بلند مقصد ان کے پیش نظر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں لوگوں کے اخلاق کی تباہی اور سوسائٹی کے آئین کی بربادی سے کوئی دکھ محسوس نہیں ہوتا۔

سرچشمۂ مفاسد

آج کے اکثر نوجوان، جنہیں کل قوم کا رہنما بننا ہے۔ ان فلموں کے باعث گمراہ ہو رہے ہیں۔ قوم کی متعدد بیٹیاں، جنہیں مستقبل کی نسل کو تربیت دینا ہے، آج خود غلط تربیت پا رہی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ آج سارے معاشرے میں جو لہو و لعب، جو بد تہذیبی و بد اخلاقی، جو عیاشی و خرابی پا رہے ہیں، اس کا سب سے بڑا منبع یہی فلمیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسی فلموں کی تیاری قانوناً بند کر دی جائے اور ایسی فلموں کی نمائش پر مکمل پابندی عائد ہو تو ہمارے معاشرے سے پچانوے فی صد برائیاں فوراً دور ہو سکتی ہیں۔

یکسر منافی مقصدیت

پاکستان میں ایسی فلموں پر پابندی لگانے کی اس لیے اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ یہ ایک بالکل نیا ملک ہے اور یہاں ایک نئی تہذیب، نئی معاشرت اور نئی سوسائٹی پیدا ہو رہی ہے۔ اگر یہاں فلمیں اسی انداز میں پیش ہوئیں تو ہماری تہذیب و معاشرت کی نئی عمارت بالکل غلط اور کمزور بنیادوں پر کھڑی ہو گی، جو یقیناً افسوسناک ہے۔ دنیا کی یہ عظیم ترین اسلامی مملکت نہایت اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ ان مقاصد کی تعمیل و تکمیل کے لیے لازم ہے کہ عوام کو متاثر کرنے والی ہر بڑی شے کا صحیح احتساب کیا جائے۔

نقش: آپ کے نظریے کے مطابق پاکستان میں اگر صحیح اسلامی دستور نافذ ہوا تو پھر فلمی صنعت زندہ رہے گی یا ختم کر دی جائے گی اور اگر زندہ رہے گی تو کس قسم کی فلمیں تیار کرنے کی اجازت ہو گی؟

اسلامی دستور: زہر نہیں دے سکتا

مولانا: جب پاکستان میں صحیح اسلامی دستور نافذ ہوگا تو ان ملکی اور غیر ملکی فلموں کی نمائش از روئے قانون فوراً بند کرنا پڑے گی جن کے باعث معاشرے میں کسی قسم کا نامناسب و نامفید رجحان پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ ان فلموں پر پابندی لگنے کے بعد لوگوں کے ذہن خود بخود بدلنا شروع ہو جائیں گے۔

تریاق مہیا کرے گا۔

پاکستان میں فلمی صنعت اس وقت بھی زندہ رہے گی مگر اس کی حیثیت ضرور تبدیل ہوگی۔ اب فلمی صنعت محض ایک نجی کاروباری ادارہ ہے۔ اُس وقت اس کی تجارتی حیثیت ثانوی ہوگی اور اولین حیثیت مقصدی ادارہ کی ہوگی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ فلمی صنعت اسٹیٹ کے ڈائریکٹ کنٹرول میں آجائے گی، بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ اس وقت

فلم سازوں کو یہ اجازت نہیں مل سکے گی کہ وہ محض ذاتی منفعت کی خاطر جو خرافات چاہیں فلم میں پیش کر دیں۔ اسلامی دستور نافذ ہونے کے بعد نہ تو انہیں لوگوں کے سفلی جذبات اور نفسانی خواہشات ابھارنے کا موقعہ مل سکے گا، اور نہ وہ ایسی فلمیں تیار کر سکیں گے جن میں پیشہ ور اداکار کام کریں۔

اداکاری: نفسیاتی جائزہ

مَیں ڈرامے لکھنے کا مخالف نہیں ہوں، مگر انہیں ایکٹ کرنے کا سخت مخالف ہوں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ایکٹنگ انسان کی شخصیت کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔ مسلسل اداکاری کے باعث انسان کا اپنا ذاتی کیرکٹر قائم نہیں رہتا۔ مختلف کرداروں کا روپ بھرتے بھرتے اس کے اپنے کیرکٹر کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل جاتی ہیں، اور اس طرح انسان رفتہ رفتہ اپنی شخصیت کے اصل خطوط ہمیشہ کے لیے کھو دیتا ہے۔ اخلاقی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی اداکاری نہایت بُری چیز ہے۔ مسلسل

اداکاری کے باعث انسان کا حقیقی نظریۂ حیات قطعاً بدل جاتا ہے، اور وہ زندگی کا ادراک حاصل کرنے کے بجائے ہر خاص و عام کا چربہ اُتارنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اسے فطرت کا صحیح مطالعہ کرنے اور اس مطالعے سے کوئی صحیح نتیجہ اخذ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ انسان کی بجائے مٹی کا ایسا پتلا بن کر رہ جاتا ہے جس میں اپنی کوئی روح نہیں ہوتی، بلکہ مصنوعی طور پر آئے دن نت نئی روح کا حلول اس کی خودی کو فنا کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اعتراض کریں کہ نیکوکار لوگوں کے کردار کی ادائیگی سے تو ان اداکاروں میں ذاتی خوبیاں ہی پیدا ہونگی، اس لیے ایسے کرداروں کی ادائیگی تو نامناسب نہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اول یہ ضروری نہیں کہ ایک اداکار کو سدا نیکیوں کے کردار ہی ادا کرنے کا موقع ملے۔ دوم، چاہے کردار نیک ہی ہوں مگر ان کرداروں کی ادائیگی کے دوران میں ان اداکاروں کے اپنے ذاتی کردار تو لازماً فنا ہوں گے۔

شخصیّت کی قربانی

اس کے علاوہ کچھ لوگ یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ ایک طبقہ اداکاروں

کی حیثیت ضرور اختیار کرے تاکہ عوام ان کے ادا کردہ کرداروں سے نیکی کی ہدایت حاصل کریں۔ اگرچہ انہیں عوام کی بہتری و بہبودی ہی مقصود ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ مطالبہ غلط ہے کہ چند لوگ محض سوسائٹی کے کسی مفاد کے لیے اپنی شخصیت کی قربانی دیں، اور ذاتی کریکٹر کو ختم کر دیں حقیقت یہ ہے کہ مختلف کرداروں کا تماشا تماشائیوں کے لیے تو مفید بھی ہو سکتا ہے، لیکن ان کے لیے نہایت نامفید ہے جو خود تماشا بن رہے ہیں۔

خودی کی قربانی خودکشی ہے

میں ذاتی طور پر یہ تو گوارا کر سکتا ہوں کہ آدمی، یا لوگوں کا ایک طبقہ محض سوسائٹی کی بہتری کے لیے جان دے دے، قید ہو جائے یا سخت صعوبتیں برداشت کرے، مگر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اچھے سے اچھے مقصد کے پیش نظر بھی اپنی خودی کو ختم کر دے، شخصیت کی قربانی دے، یا اپنی فطرت اور اپنی روح سے ہاتھ دھولے۔

تراوشِ فکر

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں فلم کا مخالف ہوں۔ میرے نزدیک اگر اسلامی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کوئی فلم صحیح ہے تو وہ تعلیمی اور تدریسی فلم ہے۔ فلم سازوں کا یہ خیال غلط ہے کہ عوام کی دل جمعی کا سامان فراہم کرنے کی خاطر فلم میں غیر اخلاقی مواد ہی پیش کرنا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تعلیمی فلموں میں بہت اچھا مواد نہایت دلچسپ انداز میں سمویا جا سکتا ہے، صرف ذرا سی محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ تعلیمی فلموں سے جہاں اسکولوں کے نصاب کا کام لیا جا سکتا ہے وہاں یہ فلمیں تعلیم بالغاں کے سلسلے میں بھی حد سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ محض تعلیمی فلموں کے ذریعے سے پاکستان کے کروڑوں لاعلم عوام کا علمی معیار انڈر گریجویٹ کے برابر اونچا کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمی فلموں کا دائرہ ویسے بھی بہت وسیع ہے۔ ان فلموں کے ذریعے عوام کو ملکی دفاع کی مکمل تعلیم دی جا سکتی ہے، انہیں گوریلا جنگ، اور اے۔آر۔پی کے تمام طریقے سمجھائے جا سکتے ہیں۔ انہیں حفظانِ صحت کی تعلیم دی جا سکتی ہے، اور فلموں کے ذریعے دکھایا جا سکتا ہے کہ بیرونی ممالک میں عوام کی صحت مندی کی خاطر کون کون سے طریقے

رائج ہیں، اور ان سے کیونکر فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ جغرافیہ کی تعلیم دینے کے لیے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کے متعلق فلمیں تیار کی جاسکتی ہیں، اور دینی عقائد کو فروغ دینے، خدا کی عظمت، قدرت، ہیبت اور جلال کا نقشہ دلوں پر جمانے کی خاطر اسٹرونومی کے متعلق بہترین فلمیں پیش ہو سکتی ہیں۔ ایگری کلچر کی جدید سائنس اندازی، مثلاً ڈیری فارمنگ وغیرہ کے متعلق فلمیں بنا کر دیہاتوں کو مستفید ہونے کا موقعہ دیا جاسکتا ہے اور علیٰ ہٰذا القیاس نباتات، جمادات اور حیوانات کے علاوہ امراض اور ان کی ادویات، اور سائنس کے مختلف شعبوں کے بارے میں نہایت اعلیٰ فلمیں تیار کر کے ان مضامین کے طلبا کے مطالعہ اور مشاہدہ کو تقویت دی جاسکتی ہے۔ فلم کے فیتے کا اس سے بہتر و موزوں استعمال ممکن نہیں۔ چنانچہ اسلامی دستور کے نفاذ کے بعد فلمی صنعت زیادہ تر ایسی ہی فلمیں تیار کر سکے گی، اور فلم سازوں کو ایسی کوئی فلم بنانے کی اجازت نہ ہوگی جس میں کسی شخص کو دوسرے کا بہروپ بھرنا پڑے، جس میں کوئی مرد، غیر عورت کو اپنی بیوی، اور کوئی عورت، غیر مرد کو اپنا شوہر پکارے۔ یقیناً یہ باتیں اسلامی تعلیم کے منافی ہیں۔

نقش:- ان تعلیمی فلموں کے علاوہ فلم ساز تاریخی اور سوشل فلمیں بھی بنا سکیں گے یا نہیں؟

فلمی دائرہ عمل

مولانا: فلمیں سوشل ہوں یا تاریخی، اداکاری کے بغیر چارہ نہیں۔ آخر کسی شخص کو نقلی روپ اختیار کرنا پڑے گا۔ مسئلہ پھر اداکاری کا ہے، جس سے فرار حاصل نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس فلم میں اداکاری ہوگی وہ صحیح اسلامی دستور نافذ ہونے کے بعد تیار نہ ہو سکے گی۔ یہ درست ہے کہ ایک طبقہ فلموں سے معاشرتی اصلاح کا کام سرانجام دینا چاہتا ہے۔ میں اس معاملے میں اس طبقے سے متفق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کام کے لیے تعلیم، ادب، اور مصلحین اخلاق و تمدن کی اصلاحی کوششیں کافی ہیں آخر فلم مجلس اصلاح کے لیے سول ایجنسی کا درجہ تو نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ معاشرت کے تمام مسائل صرف مردوں سے ہی تعلق نہیں ر
معاشرے میں عورتیں بھی ہیں اور ان کے مسائل بھی۔ میں نہیں سم
مردوں کے مسائل کا حل پیش کرنے کی خاطر مردوں کو اداکار
دیا جائے تو عورتیں اس سلسلے میں پیچھے کیوں رہیں؟ اور

کہ شرعی نقطۂ نظر سے عورت کی بے پردگی کس قدر بری بات ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی ماحول میں کوئی سوشل، کوئی تاریخی فلم تیار نہیں ہو سکتی۔

نقش: اس طرح دوسری قومیں ہمیں رجعت پسند کہیں گی؟

مولانا: ان کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اداکاری کا مسئلہ لاینحل ہے۔ یا تو لوگ مجھے اس سلسلے میں دلیل سے قائل کر دیں، یا پھر میری دلیل کے مطابق اس فن کا تجربہ کریں۔

نقش: اگر ایکٹنگ والی فلمیں تیار نہ ہونگی تو پھر تعلیمی فلموں کے علاوہ کس قسم کی فلمیں بنائی جائیں گی؟

شاداب ذہن کی ایک اور تراوش

مولانا: ہم فلموں کو دنیا کی زندہ حقیقتوں سے ہمکنار کر دیں گے۔ روزمرہ کے اصل واقعات و حالات فلمائیں گے۔ جلسوں، جلوسوں، تہواروں اور تقریبوں کے پیچھے فلم بنا کریں گے اور اس قسم کی فلمیں نہ صرف ہماری زندگی اور ہمارے ماحول کی صحیح عکاسی کریں گی، بلکہ دلچسپی کے لحاظ سے

بھی موجودہ فلموں سے کئی گنا زیادہ بہتر ہوں گی۔

نقش: پروپیگنڈا فلموں کی تیاری تو ممنوع نہ ہو گی؟

پروپیگنڈے کا امتیاز۔

مولانا: یقیناً نہیں، لیکن صرف ایسی پروپیگنڈا فلمیں تیار کرنے کی اجازت ہو گی جن کا مواد حق اور صداقت پر مبنی ہو، اور جو جھوٹ کی ذرہ بھر آمیزش سے بھی پاک ہوں، اور جن سے فتنہ انگیزی کی بجائے اصلاح مقصود ہو۔

نقش: کچھ عرصہ پیشتر مصر کے علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت کی غرض سے انبیاء کرام اور خلفائے راشدین کے علاوہ ہر بڑی مسلم شخصیت کے بارے میں فلمیں تیار

کی جاسکتی ہیں؟ اس فتویٰ کے بارے میں آپ کیا
نظریہ رکھتے ہیں؟

احترام سلف

مولانا: مجھے مصر کے علماء کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ نہ تو شرعاً یہ مناسب ہے اور نہ مسلمان اسے پسند کرتے ہیں۔ مصر میں بھی جن لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے انہیں یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ مصر کے لوگ ان کی اس رائے کو سند تسلیم کریں۔ ان علماء نے اس مسئلہ کا صرف ایک ہی پہلو دیکھا ہے اور دوسرے پہلو کی اہمیت فراموش کردی ہے نہ تو کوئی مسلمان اس قسم کی فلم تیار کرنے پر آمادہ ہوسکتا ہے اور نہ گنہ گار سے گنہ گار تر مسلمان اس قسم کے بلند مرتبہ بزرگوں کے کردار ادا کرنا یا ایسی فلمیں دیکھنا گوارا کرسکتا ہے۔

(۲)

شخصیت کا ماحول

[سکوت — سکوت — سکوت !

جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر کا ماحول بہت پُرسکون سنجیدہ اور باوقار ہے۔ چھوٹے سے خوب صورت لان کے ارد گرد سبز روشیں ہیں، اور صحن میں گلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ ذیلدار پارک، اچھرہ کی ایک مختصر سی خوب صورت کوٹھی میں جماعت اسلامی پاکستان کا مرکزی دفتر ہے۔ اسی میں ایک طرف نشر و اشاعت کا شعبہ ہے، اور اسی کوٹھی کے چند کمروں میں جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رہا کرتے ہیں۔

چھوٹے سے برآمدے میں چند کرسیاں سلیقے سے لگی ہوتی ہیں، جن کے درمیان ایک میز پر اخبارات کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ اس عمارت کے احاطہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی خود بخود کچھ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے بورڈ لگا ہوا ہے کہ یہاں بات کرنا منع ہے۔ نشر و اشاعت کے

شعبہ میں چند حضرات باتیں کرتے نظر آئے لیکن بہت آہستگی کے ساتھ یہاں کی فضا کچھ مقدس سی ہے۔

مولانا کے کمرے میں ان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ الماریوں میں کتابیں آراستہ ہیں، اور ان کے بیچوں بیچ مولانا مودودی کی صاف ستھری میز ہے، جس پر لکھنے کے کاغذ اور قلم دوات سے لے کر پن لگانے کا ڈبہ تک نفاست کے ساتھ رکھا رہتا ہے۔ مولانا نے اپنے جانے پہچانے دلآویز تبسم کے ساتھ پذیرائی کی۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ اس کمرے کی آب و ہوا تمام پاکستان کی آب و ہوا سے مختلف ہے۔ یہاں ہر موسم میں بڑی خوشگوار خنکی سی ہوتی ہے، اور ماحول علمی و ادبی محسوس ہوتا ہے۔ کمرے میں ٹینکچر آیوڈین قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی — یہ بو مولانا کی پنڈلی کی چوٹ سے آ رہی تھی۔ کچھ دن ہوئے کہ لاہور سے قصور جاتے ہوئے موٹر اُلٹ جانے کے باعث مولانا کی پنڈلی میں یہ چوٹ آ گئی تھی جو اب قریب قریب اچھی ہے۔

پیشہ ورانہ سیاست

میرے اس سوال پر کہ آپ نے سیاست کیوں اختیار کی؟ مولانا

سکرا کر بولے :-

" کیا سیاست بھی کوئی پیشہ ہے، جسے اختیار کیا جائے "؟

میں نے عرض کیا :

" آج کل تو اسے زیادہ تر اختیار ہی کیا جاتا ہے۔ اس سوال کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپ نے سیاسی زندگی کیوں اپنائی ؟"

مولانا ایک تبسّم کے ساتھ بولے :-

" یہ تو پیشہ ورانہ سیاست ہے، جسے لوگ ڈاکٹری، بیرسٹری، یا اسی قسم کے دوسرے پیشوں کی طرح اختیار کر لیتے ہیں۔ آج کل یہ قسم عام ہے۔ ابھی کچھ عرصہ کی بات ہے کہ میں عرصہ دراز کے بعد اپنے ایک عزیز کے پاس گیا وہاں اُن سے میں نے دریافت کیا کہ آپ اپنے لڑکے کو کس طرف بھیج رہے ہیں؟ وہ سنجیدگی سے کہنے لگے ——— ایل۔ ایل۔ بی تو کر ہی آیا ہے اور اس نے پریکٹس بھی شروع کر دی ہے"۔ میں نے اس سے کہا کہ اب اگر تم سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دو تو تمہاری پریکٹس خاصی چل جائے گی، اور نام بھی ہو جائیگا۔ اس طرح بڑے لوگوں سے یاد اللہ بھی ہو سکتی ہے، دراصل سیاست کو تو آج کل اُوپر چڑھنے کا زینہ اور شہرت کا ہتھکنڈا اپنا لیا گیا ہے "۔

مولانا نے فرمایا :

" میں نے سیاست اختیار نہیں کی، جو لوگ اپنا کوئی مقصدِ زندگی رکھتے

ہیں، وہ اجتماعی زندگی کے معاملات میں کچھ اختیار کر کے دل چسپی نہیں لیا کرتے، بلکہ ان کے مقصد کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ہر اس مسئلے سے دل چسپی لیں جس کا اثر ان کے مقصد پر موافق یا مخالف پڑتا ہو۔"

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے

مولانا نے فرمایا کہ :

"میں نے آج سے بیس بائیس برس پہلے اپنے مطالعہ اور غور و خوض کے نتیجہ میں شعوری طور پر اسلام قبول کیا تھا۔ شعوری طور پر اسلام قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص محض نسلی مذہب پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جان بوجھ کر صدق دل سے یہ سمجھے کہ یہی راستہ حق کا ہے اور اسی میں فلاح ہے۔ اس طرح کے قبولِ اسلام کے بعد لامحالہ میری زندگی کا یہ مقصد بن گیا کہ میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے کوشش کروں اور پھر اس نشاۃِ ثانیہ کے لیے جس جس پہلو میں بھی کام کرنے کی ضرورت پیش آتی گئی، میں اس کی طرف عین اپنے مقصد کے تقاضے سے توجہ کرتا گیا۔

منطقی دور آمد

اس کام کے لیے ضرورت تھی کہ علمی حیثیت سے اسلام کی اصل حقیقت

کو غلط فہمیوں کے انبار سے نکال کر اصلی رنگ میں پیش کیا جائے اور ان تمام نظاموں پر علمی تنقید کی جائے جو فکری اور عملی حیثیت سے اسلام کے مدِمقابل ہیں۔

اس کے لیے یہ بھی ضرورت تھی کہ لوگوں پر نظری اور اخلاقی حیثیت سے دُوسرے نظاماتِ فکر و عمل کا جو اثر ہے اُسے دُور کیا جائے۔

اس کے لیے یہ بھی ضرورت تھی کہ جو لوگ، اخلاقی اور ذہنی طور پر اسلام قبول کریں انہیں منظم کیا جائے۔

اس کے لیے یہ بھی ضرورت تھی کہ اسلام کو از سرِنو غالب کرنے میں جو جو طاقتیں مزاحم ہیں، ان کی مزاحمت کو دُور کیا جائے۔

اس کے لیے یہ بھی ضرورت تھی کہ رائے عامہ کو صحیح اسلامی نظام کے لیے تیار کیا جائے۔ اس طرح یہ مختلف ضرورتیں جیسی جیسی محسوس ہوتی گئیں مجھے آپ سے آپ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ کرنی پڑی بغیر اس کے کسی روز بیٹھ کر میں ارادہ کرتا کہ مجھے فلاں چیز اختیار کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا:۔

"لیکن عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دُنیا میں سیاست سے زیادہ اہم بھی بعض مسائل ہیں، جن کی طرف آپ کی توجہ دی جانی چاہیے۔"

مستقیم خطِ فکر

مولانا مجھے سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے۔

"اس معنی میں کہ جس پہلو کو بھی ہم چھوڑ دیں گے فکر و عمل دونوں کا توازن بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اسلام انسان کی پوری زندگی سے بحث کرتا ہے اور عملاً اس کا قیام اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہر شعبۂ زندگی کو پورے توازن کے ساتھ اس کے دائرۂ عمل میں لایا جائے، اس لیے ہم کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

میں نے پوچھا:-

"لیکن مولانا! زیادہ تر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ زندگی کے بعض شعبے سیاست کے مقابلے میں اہم ہیں، اور ان کی طرف توجہ دینا زیادہ ضروری ہے، مثال کے طور پر لوگوں کی اخلاقی مذہبی اور معاشرتی اصلاح سے اگر لوگوں کو سمجھ دار اور باعلم بنا دیا جائے تو اس کے بعد وہ مسائل کو زیادہ خوبی سے سمجھ سکتے ہیں چنانچہ یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی نے پہلے سماجی اور مذہبی اصلاح کی طرف توجہ کیوں نہیں دی"؟

زندگی کے غلط نظریے

مولانا مسکرائے، اور کہنے لگے:-

"میں اس بحث کو فضول سمجھتا ہوں کہ زندگی کا فلاں پہلو زیادہ اہم ہے یا کم اہم ہے اس قسم کی تقسیم وہی لوگ بیٹھ کر سوچا کرتے ہیں جو زندگی پر کوئی جامع نظر نہیں رکھتے۔"

میں نے عرض کیا :۔

"لیکن اگر اس طرح عمل کیا جائے تو کاموں میں یکسوئی تو پیدا ہو سکتی ہے"

مولانا نے فرمایا :۔

"یکسوئی اس صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب کہ مختلف پہلوؤں کو مختلف گروہ ایک ہی مقصد سامنے رکھ کر اپنے ہاتھ میں لیں اور ان کے درمیان اشتراک اور تعاون کی کوئی صورت موجود ہو تاکہ توازن کے ساتھ کام کیا جا سکے۔ اس وقت یہ ممکن ہے کہ کوئی گروہ کسی ایک شعبہ پر اپنی تمام قوتیں صرف کر دے لیکن یہاں صورت کچھ "انار کی" کی سی ہے یعنی کوئی ایک مقصد موجود نہیں ہے مختلف مقاصد ہیں اور مختلف نظریے۔ مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کر کے لوگ زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں اور ناکام ہیں۔ کیونکہ اس طرح سے نہ کبھی زندگی میں ہمواری پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے"۔

کچھ دیر رک کر مولانا بولے :۔

"اگر اسی طرح مختلف راستوں میں مختلف گروہ اپنی قوتیں صرف کرتے گئے تو ایک عجیب قسم کی "معجونِ مرکب" تیار ہو گی جس کا کوئی جز دوسرے جز سے میل نہ کھاتا ہو گا"۔

مولانا نے فرمایا :۔

"آپ خود دیکھیں کہ تعلیم کسی ایک نظریے پر چل رہی ہو اور سیاست کسی

دوسرے نظریے پر۔ اخلاق کے لیے کوئی دوسرا نظریہ ہو اور مذہبی تبلیغ کسی اور قسم کی ہو تو آخر یہ مختلف اجزاء مل کر کیا نتیجہ پیدا کرسکیں گے۔۔۔؟ اس لیے سردست اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ کوئی ایک جامع نظریہ ایسا ہو کہ جس پر ادب اور علوم و فنون۔ قانون۔ ملکی انتظام اور اجتماعی اخلاقیات ہر چیز کی بنا قائم ہو۔ ایک مرتبہ ہماری قومی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو پھر یہ ممکن ہوگا کہ مختلف گروہ زندگی کے مختلف شعبوں کو سنوارنے اور ترقی دینے کا کام اپنے ہاتھوں میں لے کر یکسوئی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ کیونکہ اس وقت وہ سب ایک جامع سکیم کے اجزاء ہوں گے۔ سردست ہماری تمام تر کوشش یہی ہے کہ موجودہ "ذہنی انارکی" کو ختم کرکے پوری قوم کو اسلام کی ایک جامع سکیم پر جمع کر دیا جائے۔ اس لیے ہم زندگی میں ایک طرف تو اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف اسی نقطۂ نظر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عملی اقدامات بھی کر رہے ہیں۔"

نظریۂ سیاست

میں نے دریافت کیا:۔

"آپ کی نظر میں سیاست کی تعریف کیا ہے اور اس کے متعلق آپ کس طرح سوچتے ہیں؟"

مولانا چند ثانیے سوچنے کے بعد بولے :

"سیاست سے مراد ؟ ویسے تو سمجھیے کہ حکومت اور طاقت سے ملک کا انتظام کرنے کا نام سیاست ہے لیکن اس کا جو وسیع تر مفہوم ہے اس کے اعتبار سے سیاست اجتماعی زندگی کا وہ شعبہ ہے جو سوسائٹی کو اقتدار کی طاقت سے اپنے راستے پر چلانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی شخص جو کسی نظریۂ حیات پر ایمان رکھتا ہو اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ جو سیاسی اقتدار سوسائٹی پر حاوی ہے آیا وہ اس کے نظریۂ زندگی کا حامی ہے یا اس کا مخالف ؟ غیر جانب داری تو اس معاملہ میں ناممکن ہے اور اس کا ذکر ہی فضول ہے۔

اس بنا پر ہم جو نظریۂ حیات رکھتے ہیں اس کے مطابق سیاست سے بے تعلق ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ اگر سیاسی اقتدار ہمارے نظریے کا حامی ہے تو ہم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ بٹائیں تاکہ اس کی مدد سے زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح و تکمیل ہو سکے اور اگر وہ ہمارے نظریۂ حیات کے مخالف ہے تو اس کو اپنی طرف مائل کرنے یا تبدیل کرا دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔"

آخر میں مولانا نے کہا :

"اجتماعی زندگی کو بزور ہانکنے والی طاقت کسی طرح بھی نظر انداز کیے جائے

کے قابل نہیں ہو سکتی۔

اس کو اگر نظر انداز کر سکتے ہیں تو صرف وہ راہب یا سنیاسی جن کا نظریہ زندگی ہی اجتماعی زندگی سے فرار ہے۔"

تاثیرِ شخصیت

واپس لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بہت خطرناک انسان ہیں۔ ان کے آس پاس کا ماحول بڑی حد تک خطرناک ہے اور احساسات پر بُری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کا پُرکشش تبسم انسانی ذہن کے تمام گوشے خالی کرا دیتا ہے اور جب کوئی ان کے پاس سے واپس لوٹتا ہے تو اس کے دماغ کی تمام کوٹھریاں مولانا مودودی کے نظریات سے بھری ہوتی ہیں — اس جگہ آکر سارے طلسم باطل ہو جاتے ہیں۔

فکر و نظر

تاریخ فکر کے چند ابواب

(۱)

۱۹۲۰ء — ۱۹۲۴ء

سمرنا میں یونانی مظالم

اسلام کی حرمت پر مرمٹنے والوں کی داستانِ مظلومی کے یہ چند اوراق میں اپنی خونبار آنکھوں اور اپنے زخمی دل کے ساتھ بہیمیت مغربی کے اس مریخ کے آگے پیش کرتا ہوں جس نے اپنی چند شعاعیں سمرنا کی خوشحال سرزمین پر ڈال کر اسلام کے اس لہلہاتے ہوئے باغ کو ویران کر دیا ہے اور اب وہ بھی اس کے بہت سے اجڑے ہوئے وطنوں کی طرح پرستارانِ توحید کا ایک خوفناک قبرستان ہے۔

لیکن اگر وہ انہیں اپنی درندگی و غارتگری کی عظیم الشان تاریخ کے مقابلہ میں حقیر پاکر غرور سے ٹھکرا دے، تو پھر یہ ساری کی ساری داستان ہر اس مسلم سنگدل کے لیے ایک ہدیہ ہے جو اپنے ہزاروں لاکھوں مسلمان بھائیوں کی موت اور بربادی کے سننے کے بعد بھی اپنی جیبوں اور اپنے خزانوں کا منہ کھول دینے پر آمادہ نہیں!

یہ میں جانتا ہوں کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جس کی آنکھوں سے مسلمانانِ سمرنا کی دردانگیز مصیبتوں کا حال پڑھ کر آنسو جاری نہ ہو جائیں۔ لیکن سمرنا کے مظلوم تمہارے آنسو مفت کے دریا نہیں مانگتے۔ اُن کے لیے تو تمہاری جیبوں سے نکلا ہوا ایک پیسہ بھی تازہ شیطنوں کے بلاخیز ہنگاموں اور آنسوؤں کے طوفانی قلزم سے زیادہ قیمتی ہے۔

سمرنا

ولایت سمرنا ایشیائے کوچک کی ایک قدیم ولایت ہے، جو بحر ایجین کے ساحل پر واقع ہے۔ اول تو اس کی سرزمین ہی دنیا کی نہایت زرخیز زمینوں میں سے ہے جو فطرۃً اچھی فصلوں اور لذیذ پھلوں کے پیدا کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ مگر سمندر کے کنارے اس کی جائے وقوع اور سمرنا جیسے بندرگاہ کی وجہ سے وہ بحر ایجین کی تجارت کا ایک بڑا مرکز بنی ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دولت عثمانیہ میں قسطنطنیہ کے بعد سمرنا سب سے زیادہ قیمتی اور خوشحال علاقہ ہے۔

سمرنا کی یہ خوشحالی کچھ اس زمانہ ہی کی تجارتی ترقیوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ عہدِ قدیم سے وہ دنیا کے بڑے تجارتی مقاموں میں سے ہے۔ آج سے ڈھائی تین ہزار برس قبل جب یونان مغربی دنیا میں تجارت پر قبضہ کر رہا تھا اس زمانہ میں یونانی تاجروں نے اپنی بیرونی تجارت کے لیے ہر طرف بحری سواحل پر نوآبادیاں قائم کر لی تھیں، یورپ میں صقلیہ، سارڈینیہ اور مارسیلز وغیرہ ان کے تجارتی مرکز تھے۔ اور ایشیا میں سمرنا اور شام کے چند ساحلی بندرگاہ۔

تاریخی حیثیت سے سمرنا کی قسمت ہمیشہ ایشیائے کوچک کی قسمت کے ساتھ

گردش کرتی رہی ہے۔ ایشیائے کوچک عہد قدیم میں سامی اور انڈو جرمن نسل کی قوموں سے آباد تھا، انقلاب جس طرح دنیا کے دوسرے ملکوں پر آتے ہیں اسی طرح اس ملک پر بھی آتے رہے ہیں۔ اس لیے محض انقلاب اور گردش کی حیثیت سے ایشیائے کوچک کا کوئی انقلاب تاریخی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اگر بہ نظر غور تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سیاسی نقطۂ نظر سے اہل ایشیا کے لیے بہت اہم ہے کہ قدیم زمانہ میں یورپ سے جس قدر حملے ایشیا پر اور ایشیا سے یورپ پر ہوئے ان سب کا عام راستہ ایشیائے کوچک تھا، اس لیے ایشیا کی تاریخ پر جس قدر انقلاب یورپ سے متعلق ہیں ان سب کو ایشیائے کوچک سے خاص تعلق ہے۔

مثال کے طور پر دیکھیو:

دارا نے جو حملہ مقدونیہ پر کیا تھا اس کا راستہ ایشیائے کوچک سے تھا اور اس لیے تھریس اور مقدونیہ کو قابو میں لانے کے لیے اس نے ضروری سمجھا کہ ایشیائے کوچک پر اپنی قوت مضبوط کر لے۔

پھر جب اسکندر مقدونی ایشیا کی تسخیر کے لیے یورپ کی جنوبی پہاڑیوں سے نکلا، تو اس نے بھی سب سے پہلے ایشیائے کوچک کو فتح کر کے اس پر اپنے قبضہ کو مستحکم کر لیا، اور اس کے بعد جب وہ آگے بڑھا تو مصر، شام، بابل، ایران اور ہندوستان سب اس کے قدموں میں تھے۔

مقدونی قوت کے زوال کے بعد جب رومن امپائر کو عروج حاصل ہوا تو مشرقی سلطنت کے زیر اثر سب سے پہلے ایشیائے کوچک آیا جس کے بعد اس کے اثرات حدود حجاز اور بحرین تک پھیل گئے، دوسری طرف ارمینیا، کردستان کو انہوں نے چھا لیا۔

اور ایران کی عظیم الشان مشرقی سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔

رومن امپائر کا خاتمہ پوں قصر گرنے والا تھا کہ عرب سے اسلامی قوت نے بروز کیا اور شام و عراق کو فتح کرکے دنیا کے ہر حصہ کی طرف بڑھنے لگی، قسطنطنیہ اس کے فاتحانہ عزائم کا خاص مطمح نظر تھا، مگر وہ اس وقت تک فتح نہ ہو سکا جب تک ایشیائے کوچک پوری طرح مسلمانوں کے قبضہ میں نہ آگیا، پھر جب انہوں نے پورے ایشیائے کوچک کو حاصل کر لیا تو ان میں سے ایک قوم آگے بڑھی اور اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یورپ کا فلسفہ تک ہل گیا، اس نے تمام بلقان کو فتح کرکے ہنگری لے لیا اور تھریس سے نکل کر پولینڈ تک اپنی شوکت و صولت کا سکہ جما دیا۔

تاریخ کے ان چند انقلابوں پر غور کرنے کے بعد ایک شخص بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یورپ کے اقتدار و تسلط سے بچنے کے لیے ایشیا کے پاس ایشیائے کوچک ایک مستحکم دیوار ہے جس کے ٹوٹ جانے کے بعد سارا ایشیا غیر محفوظ ہے، اور یورپ پر حملہ کرنے اور اس پر حکومت کرنے کے لیے ایشیائیوں کے پاس ایشیائے کوچک ایک قدرتی راستہ ہے، جس پر قابض رہنے سے انہیں یورپ کو فتح کرنے کے مواقع مل سکتے ہیں،

اگرچہ یورپ نے اس قدرتی راستہ کو چھوڑ کر بحری راستہ سے اپنے نفوذ و اقتدار کو ہم پر قائم کر دیا ہے۔ اس لیے بعض نظروں میں ایشیائے کوچک کی اہمیت گھٹ گئی ہے: مگر واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ جنگ یورپ سے پہلے تک وہ راستہ ہمارے قابو میں تھا۔

اور ہم کو کسی وقت ایسا موقعہ مل سکتا تھا کہ اس کو بند کر کے یورپ کی غلامی کے جوئے کو اتار دیں، مگر اب تمام ایشیا کے لوگوں کو خبردار ہو جانا چاہیے کہ یورپ نہ صرف تمام بحری رستوں پر قابض ہو چکا ہے بلکہ وہ اب ایشیا کے قدرتی راستہ ایشیائے کوچک کو بھی ہمارے ہاتھوں سے چھیننا چاہتا ہے، تاکہ ہمیشہ کے لیے اپنے چنگل کو ہم پر مضبوط کر لے۔

اتحادی قوتوں کی مدد سے جو قبضہ یونان نے سمرنا پر کیا ہے، وہ اسی عظیم الشان خطرہ کو پیدا کرتا ہے۔ اسلامی حیثیت سے اس کا جو اثر ترکوں پر پڑتا ہے وہ تو مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے بالکل برباد کر دے گا، مگر محض سیاسی نقطۂ نظر سے اس کے جو مہلک اثرات ایشیا کی آزادی پر پڑنے والے ہیں، ان سے بچنے کے لیے اہل ایشیا والوں کو غفلت نہ کرنی چاہیے۔

(۲)

یہاں تک تو ایشیائے کوچک کی قسمت ایشیا کے لیے ایک مستحکم دیوار ہونے کی حیثیت سے قابل غور تھی، مگر اب دیکھنا چاہیے کہ اسلام کی سیاسی طاقت کا مرکز ہونے کی وجہ سے اس کا فیصلہ مسلمانوں کی زندگی و موت پر کیا اثر ڈالتا ہے۔

دولت عثمانیہ دنیا میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کا مرکز وحید ہے۔ اسلام کی مذہبی عزت اور مسلمانوں کی قومی حرمت کی حفاظت دینی و دنیاوی کے ذرائع میں سے اب صرف یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے، لہٰذا اس کا باقی رہنا اب مسلمانوں کی حیات قومی کے

لیے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ایک انسان کو زندہ رہنے کے لیے غذا حاصل کرنے کے ذرائع کا باقی رہنا ہے۔

مگر دیکھو دولت عثمانیہ سے یورپ خالی کرالیا گیا، عرب کو دھوکا دے کر اس سے علیحدہ کر لیا گیا، عراق، شام اور فلسطین بھی چھین لیے گئے، اور آرمینیا بھی آزاد ہو گیا، لہٰذا قدرتی طور پر اس کو اپنے وطن قدیم اناطولیہ یعنی ایشیائے کوچک میں محدود ہو جانا پڑا، اب کم از کم اس رقبۂ زمین پر اس کا آزاد رہنا اس کی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے لیکن اس چھوٹے سے ملک میں بھی اس کو چین سے رہنے نہیں دیا جاتا، اور ولایت سمرنا پر یونان کو مسلط کر دیا گیا ہے۔

سمرنا، ایشیائے کوچک کا سب سے زیادہ زرخیز اور سرسبز علاقہ ہے، اور اس کی بندرگاہ اس کے لیے سمندر کا تنہا تجارتی راستہ، لہٰذا اس کو ایشیائے کوچک سے علیحدہ کر کے مسلمانوں کے شدید دشمن (یونان) کے حوالے کرنا سارے ایشیائے کوچک کو اقتصادی حیثیت سے برباد کرنا، اور اس کی خوشحالی پر ایک شدید ضرب لگانا ہے پھر اس کے برباد ہو جانے کے بعد دولت عثمانیہ کا وجود دنیا کی دوسری سلطنتوں کے مقابلہ میں اتنا ہی ضعیف ہو گا جتنا دولت برطانیہ کے مقابلہ میں ریاست حیدرآباد کا وجود ہے۔

(۳)

مگر سمرنا کی اہمیت صرف اسی حد تک نہیں کہ اس کے نکل جانے کے بعد ایشیائے

کو جبکہ (زیادہ صحیح معنوں میں دولتِ عثمانیہ) کی اقتصادی زندگی ختم ہو جائے گی، نہیں دنیا کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ سمرنا محض ایک ولایت کی حیثیت سے یونان کا حق ہے یا ترکی کا۔

اس کا فیصلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے یونان کا دعوےٰ سن لینا چاہیے۔

۱۸ر جون سنہ ۲۱ء کے "ڈیلی ٹیلیگراف" میں یونان کے سابق وزیراعظم موسیو وینزیلوس کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، اس میں سمرنا پر یونان کے دعاوی نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہیں، وہ کہتا ہے:-

"وہ سرزمین معاہدہ ترکی کی رو سے یونان کے فوجی قبضہ میں دی گئی ہے نہ صرف سنجق سمرنا پر مشتمل ہے بلکہ اس میں منیسہ، قصابہ، ایوالیق، آق حصار کا ایک حصہ اور بالیکسر کے ضلع قمر کا ایک حصہ بھی شامل ہے، اور ان تمام علاقوں کی کل آبادی ۹ لاکھ ۵۰ ہزار ہے، ان میں سے ۳ لاکھ ایک ہزار سے کم مسلمان ہیں، ۵ لاکھ ۵۰ ہزار یونانی ہیں، ۲۰ ہزار یہودی ہیں، ۱۵ ہزار ارمن ہیں، اور ۵۰ ہزار یورپین، اس لحاظ سے ترکی آبادی کل آبادی کا مشکل سے تیسرا حصہ ہے۔

"ان اعداد و شمار کی صحت سے ترکوں کو تامل ہے، مگر امریکن ذرائع سے جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں، اور جو مجلس صلح میں پیش کیے گئے ہیں، وہ ان کو تسلیم کرتے ہیں"

اس بیان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کا دعوے سمرنا پر صرف یہ ہے:،

کہ اس ولایت کی آبادی میں یونانیوں کو اکثریت حاصل ہے۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ یہ دعوے کہاں تک صحیح ہے۔

وینیزیلوس لکھتا ہے کہ میرے پیش کردہ اعداد و شمار امریکن ذرائع سے حاصل کیے ہوئے اعداد سے مطابق ہیں، مگر یہ غلط ہے، امریکن اعداد و شمار جو مجلس صلح کے سامنے پیش گئے تھے وہ حسب ذیل ہیں:۔

مسلمان	۳۲۵۰۰۰
یونانی	۳۷۵۰۰۰
ارمن	۱۸۰۰۰
یہودی	۴۰۰۰۰

مگر یہ اعداد حقیقت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے، جن ذرائع سے یہ حاصل کیے گئے ہیں ان کے متعلق صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہ لوگ امریکن مشنری تھے جنہوں نے انہیں مرتب کیا ہے، اور امریکن مشنریوں کا یہ حال ہے کہ التوائے جنگ کے بعد سلیشیا کے ہنگاموں میں ان پادریوں نے ارمنوں کی ایک فوج مرتب کر کے ان سے مسلمانوں کا قتل عام کرایا تھا۔ صرف اسی سے ایک سچا انسان سمجھ سکتا ہے۔ یہ متعصب پادری مسلمانوں کے ساتھ دوستی کریں گے یا عیسائیوں کے ساتھ، پھر یہ جانبدارانہ شہادت یونانیوں کے دعویٰ کے ثبوت میں کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہے۔

برخلاف اس کے مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ولایت سمرنا خالص اسلامی ہے اس

سکے لیے ایک نہیں متعدد غیر جانب دار شہادتیں موجود ہیں، موسیو ڈالی کوئنیٹ ایک مشہور فرنچ مستشرق ہے اس نے اپنی کتاب "ٹرکی ڈی ایشیا" میں ولایت سمرنا کے ۵ صوبوں کی حسب ذیل آبادی درج کی ہے:

نام صوبہ	مسلمان	یونانی	ارمن	یہودی	غیر ملکی
سروخان	۲۹۱۴۶۰	۴۷۹۳۳	۳۸۸۲	۱۹۳۹	۹۳۵
ایدین	۱۸۵۸۹۸	۱۶۹۰۷	۶۳۴	۲۵۲۴	۱۱۴
دینزلی	۲۱۰۹۷۶	۲۸۶۵	۴۳۰		
سمرنا	۲۷۳۷۹۵	۱۳۰۹۵۷	۱۰۰۴۵	۱۸۱۳	۵۵۰۲۰
منیسہ	۱۳۱۴۸۴	۱۰۰۳۶	۱۱۴	۴۲۳	۱۰۷
کل	۱۰۹۳۶۱۳	۲۰۸۶۸۳	۱۵۱۰۵	۲۲۵۱۶۰	۵۶۱۷۶

سمرنا کے علاوہ جن جن شہروں پر یونانیوں نے قبضہ کیا ہے اور جن پر وینزلوس یونان کا حق جتاتا ہے ان کی آبادیاں موسیو کوئنیٹ نے حسب ذیل تفصیل سے درج کی ہیں:-

نام شہر	مسلمان	یونانی	ارمن	یہودی	غیر ملکی
منیسہ	۲۱۰۰۰	۱۰۰۰۰	۲۰۰۰	۱۰۰۰	۶۰۰

نام شہر	مسلمان	یونانی	ارمن	یہودی	غیر ملکی
قصابہ	۱۹۰۰۰	۱۵۰۰	۱۰۰۰	۶۰۰	
قرہ اغاچ	۱۸۰۰۰	۲۰۰۰			
اللہ شہر	۱۷۰۰۰	۴۳۲۴		۳۳۵	۲۳۵
چینی	۱۰۳۰۶	۶۷۳	۱		
نازلی	۱۹۵۸۵	۱۷۰۰	۲۷۴	۱۲۰	
موغلہ	۱۳۷۱۱	۱۱۱۵	۱۱۴		
میلاس	۲۶۳۲۰	۱۹۳۰	۳۱۱		
بکری	۱۹۶۲۲	۳۸۳۷		۲۶	۳۷
میزان	۱۶۴۵۴۴	۲۷۰۷۹	۳۷۰۰	۲۰۸۱	۹۹۷

پھر موسیو کوئینٹ ان اضلاع کی مردم شماری کے تفصیلی اعداد پیش کرتا ہے جو بحر آلجین کے کنارے واقع ہیں، اور جن میں یونانی آبادی دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے مگر مسلمانوں کی آبادی ان کی اس زیادتی پر بھی غالب ہے چنانچہ ذیل میں وہ اعداد درج کیے جاتے ہیں :-

نام شہر	مسلمان	یونانی	ارمن
ایواجیق	۲۹۲۱۰	۴۴۹۸	۴۶۰

ازبینہ	۱۶۸۰۶	۱۷۶۸	
اورامیت	۴۲۹۲۲	۷۴۸۲	
تمسر	۱۵۷۴۹	۳۰۶۲	
ایوالیق	۹۸	۲۱۸۵۲	۶
پرغامو	۲۳۷۳۵	۳۴۱۶	۱۵۰۰
فوچہ	۲۸۸۴	۸۴۳۵	۳۵۰
منیمن	۲۰۳۰۹	۷۷۷۹	۵۰۸
اورلا	۱۹۴۳۵	۶۹۵۸	
چشمہ	۲۰۰۰۰	۸۴۱۶	
سیوری حصار	۲۱۰۰۰	۷۵۰۰	
قوچ اوہ سی	۸۷۷۵	۶۱۸۹	۵۹
سوقبیہ	۱۴۹۸۷	۸۲۵۸	۵۹
موغلہ (ضلع)	۴۱۵۷۳	۱۱۱۵	۱۱۴
بودروم	۱۱۶۱۳	۲۲۶۴	
مرمریس	۱۲۲۲۸	۶۴۰	
قوچی غنر	۲۰۱۲۹	۲۴۰	
کل	۳۲۱۴۶۳	۹۹۸۷۲	۳۰۵۶

ان اعداد کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انفرادی حیثیت سے صرف ایوالیق اور خوچہ میں یونانی آبادی ترکوں سے زیادہ ہے، مگر مجموعی حیثیت سے ترک ان اضلاع میں یونانیوں سے بہت زیادہ ہیں۔

موسیو ڈال کوئینٹ کے تفصیلی اعداد پڑھنے کے بعد ایک شخص کو یونان کے وزیر اعظم کی صداقت اور امریکہ کے مذہبی پیشواؤں کی سچائی کا حال اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے، ان دشمنانِ حق و صداقت کی تکذیب صرف موسیو کوئینٹ ہی کی کتاب نہیں کرتی بلکہ معلوماتِ عامہ کی سب سے زیادہ معتبر کتاب "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" بھی اس مسئلہ میں ان کے خلاف شہادت دیتی ہے، چنانچہ اس کی ۱۹۱۰ء والی اشاعت میں سمرنا کے پانچوں صوبوں کی آبادی میں یونانی آبادی کا تناسب اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

صوبہ سمرنا	کی کل آبادی	۶۳۰۰۰۰	ہے	اس میں یونانی	۱۳۰۰۰	ہیں۔
" ایدن	" "	۳۰۰۰۰۰	" "	" " "	۱۵۰۰۰	"
" سروحان	" "	۴۵۰۰۰۰	"	" "	۲۳۰۰۰	"
" ڈینزلی	"	۲۷۰۰۰۰		" "	۲۶۰۰	"
منیسہ	"	۱۹۰۰۰۰		" "	۱۰۵۰۰	"

یہ ۱۹۱۰ء کے اعداد ہیں، ان سے زیادہ جدید اعداد ۱۹۱۴ء کی مردم شماری سے حاصل کیے گئے ہیں، اور وہ حسبِ ذیل ہیں،

مسلمان	۱۱۹۵۳۳۵
یونانی	۲۰۴۲۹۵
ارمنی	۱۲۵۰۰
دیگر	۱۸۰۰۰۰
کل	۲۳۴۷۹۵

ان اعداد کا نتیجہ خود یونانیوں کے دعوائے غلط کا بہترین جواب ہے۔

(نہم)

یونانیوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ شہر سمرنا کی غالب آبادی یونانی ہے اور ک وہاں بہت کم ہیں، مگر یہ دعویٰ بھی اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا ان کا پہلا دعویٰ ات اس کے لیے بھی معتبر کتابوں کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ٹرکی ڈی ایشیا میں شہر سمرنا کی آبادی حسب ذیل ہے:

مسلمان	۹۶۲۸۰
یونانی	۵۷۰۰۰
ارمن	۷۶۲۸
یہودی	۱۶۴۹۰
	۸۱۱۱۸

سنہ ۱۲ء کی مردم شماری کا نتیجہ یہ ہے:-

مسلمان	۱۰۰۳۵۶
یونانی	۷۳۶۳۶

ارمنی ۱۱۱۲۷

یہودی ۱۷۵۰۰

۱۰۲۲۶۳

ان اعداد کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سمرنا میں مسلمان نہ صرف یونانیوں سے زیادہ ہیں، بلکہ اگر ان کے ساتھ ارمنی اور یہودی بھی ملا دیئے جائیں تو ان کی مجموعی تعداد بھی مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر تسلیم کر لیا جائے کہ شہر سمرنا میں یونانی زیادہ ہیں تب بھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ملک، جو خالصتہً مسلمانوں سے آباد ہے، مسلمانوں کے پاس رہے مگر اس کی بندرگاہ محض اس لیے کہ اس میں باہر کے تاجر بہت زیادہ آ گئے ہیں، ان تاجروں کے حوالہ کر دی جائے۔ اگر یہ انصاف کا تقاضا ہے تو پھر وہائٹ چیپل میں ایک یہودی ریاست اور مانچسٹر میں ایک یونانی حکومت کیوں نہیں قائم کر دی جاتی۔

اس کے بعد اب یونانیوں کے پاس سمرنا کے لیے ایک دعویٰ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ سمرنا پر یونان کے تاریخی حقوق ہیں، عہد اسکندر سے قبل یونانیوں نے اسے آباد کیا تھا، پھر اس کے بعد اسکندر نے تمام ایشیائے کوچک کے ساتھ اسے بھی فتح کیا، اور اسکندر کی وفات کے بعد یہ ملک اس کے جانشینوں کی حکومت میں رہا۔ اگر اس دعویٰ کا لحاظ کر کے اتحادیوں نے سمرنا کو یونان کے حوالے کیا ہے تو ایک عرب کھڑا ہو کر اسپین کا دعویٰ کر سکتا ہے، ایک یونانی ایران اور ہندوستان

کا مطالبہ کرسکتا ہے، ایک اٹالین برطانیۂ عظمیٰ اور فرانس پر اپنا حق طلب کرسکتا ہے اور ایک ترک اپنی اس تمام سلطنت کو مانگ سکتا ہے جو افریقہ میں الجزائر تک، ایشیا میں قفقاز تک، یورپ میں پولینڈ اور آسٹریا تک پھیلی ہوئی تھی۔

مسلمانانِ ہند سے خطاب

برادرانِ ملت: سمرنا میں تمہارے بھائیوں پر جو کچھ گزر گئی، اس کی دردناک داستان تم سن چکے، سینکڑوں مسجدوں کی بے حرمتی اور ہزاروں مومن مسلم بستیوں کی بربادی کا حال بھی تم نے پڑھ لیا۔ اب مجھے بتلاؤ کہ تمہارے دلوں کا کیا حال ہے؟ کیا ابھی تک ان پر جمود و بے حسی کی وہی کیفیت طاری ہے جو اس سے پہلے تھی؟ کیا تم محمد بن عبداللہ روحی فداہ کے باغ کو اجڑتا دیکھ کر کسی چارہ گری کے لیے تیار نہیں؟ اور کیا اب مجھے یقین کر لینا چاہیے کہ رسول کی روحانی بیٹیوں کی بے حرمتی تمہاری حمیت ملی میں ایک ذرا سی حرکت بھی پیدا نہیں کرسکتی۔

آہ میں کیونکر اپنے خون شدہ دل کو سمجھا لوں کہ وہ کسی مسلمان کو اتنا بے حمیت ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میری تمہاری شناسائی تو ایثار و قربانی کے صدیق و فاروق نے کرائی تھی اور میں تو تمہیں صرف اس حیثیت سے جانتا ہوں کہ تمہارے عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے بادشاہ بھی جب غیر مسلم کی قید میں مسلمانوں کی مظلومی کا حال سن لیتے تھے تو بے چین ہو کر اپنے کاشانۂ طرب و نشاط سے نکل آتے تھے اور دنیا کا ہر لطف ان پر حرام ہو جاتا تھا جب تک ظالموں سے ایک ایک مسلمان کا بدلہ نہ لیتے تھے۔

مگر آہ! آج میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم نے وہ سب کچھ سنا جسے سننے سے پہلے ایک مسلمان کو موت آجانی چاہیے، اور تمہاری زندگی میں وہ سب کچھ ہو گزرا جو کبھی زندہ مسلمانوں کی زندگی میں نہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تم سوتے رہے، اور تم نے اتنی ٹیس بھی محسوس نہ کی، جو ایک سوئی چبھ جانے کے بعد ہر جاندار محسوس کرتا ہے۔

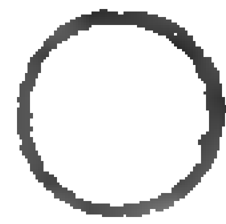
عزیزو! تم ضرور اتنے پرستاران توحید کے خاک و خون میں لوٹ جانے پر آنکھوں سے آنسو بہا چکے، اور یہ بھی مجھے یقین ہے کہ اپنی مسلمان بہنوں کی خانہ بربادی پر تمہاری ماتم گساریاں حد سے بڑھ جائیں گی۔ مگر عورتوں کی طرح رونے سے فائدہ؟ میں تم سے کبھی نہ پوچھوں گا کہ تم نے آنسوؤں کے کتنے دریا بہائے، اور میرا دل ہرگز یہ سننے کے لیے بیتاب نہیں کہ تم ماتم گسار و فغاں سنج ہو، مگر میں تو تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنے بھائیوں کو مصیبتوں سے بچانے کے لیے کیا کیا؟

تم کہو گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟

ہاں مجھے بھی معلوم ہے کہ تم ایک قیدی ہو، زنجیروں میں جکڑے ہوئے، اور ایک غلام ہو، بے بس اور پابند۔ مگر تم سے کس نے کہا کہ یونان پر حملہ کرو، اور تلوار نیام سے نکال کر مردوں کی طرح اپنے بھائیوں کا بدلہ لو۔ تم سے تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ مہاجرین سمرنا کے چھوٹے چھوٹے بچوں پر رحم کرو، جو قسطنطنیہ اور اناطولیہ میں فاقوں سے سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ اور ان شریف عورتوں اور مردوں پر ترس کھاؤ جو سمرنا سے ہجرت کر کے یونانی آتش سے محفوظ علاقہ میں چلے گئے ہیں، اور سڑکوں پر

فاقوں سے پریشان، بیماریوں سے خستہ اور مفلسی سے تنگدل پڑے ہوئے ہیں۔

تم سے صرف آٹھ لاکھ روپیہ مانگا جا رہا ہے۔ اور اگر تم چاہو تو یہ رقم ایک منٹ میں جمع کرکے وہاں بھیج سکتے ہو۔ اس کے لیے تم کو اپنے گھروں کے اثاث البیت بیچنے کی ضرورت نہیں، اپنی گاڑھی کمائی کا وہ حصہ جسے تم ایک رقاصہ کے کمالِ رقص اور ایک تماشاگر کے حسنِ تمثیل پر قربان کردیتے ہو، اسے اسلام کی حرمت پر قربان کرو اور فرزندانِ اسلام کو موت کے منہ سے بچالو۔



مزدوروں کی جمعیت صرف مزدوروں تک ہی محدود نہ رہنی چاہیے۔

آج کل تمام دنیا میں سب سے زیادہ مزدوروں کا طبقہ تکالیف و مصائب میں مبتلا ہے۔ اخراجاتِ زندگی کی ناقابلِ برداشت زیادتی اور اسبابِ حیات کی بے اندازہ گرانی نے اگرچہ ہر شخص کو ایک مستقل پریشانی اور تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے، لیکن غریب مزدور جو صبح سے شام تک سرمایہ داروں کی خاطر اپنا خون پانی کر دیتے ہیں، اور اس کے معاوضے میں بمشکل اتنی اجرت پاتے ہیں کہ پیٹ کو روٹی، تن کو کپڑا بھی پوری طرح میسر نہیں آتا، سب سے زیادہ مصیبتوں کا شکار ہیں۔ حالانکہ سرمایہ دار ہر جگہ اپنے فائدے حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، ہر قسم کے فائدے حاصل کرتے ہیں، اور مزدوروں سے محنت

لے کر خود مزے اڑاتے ہیں، اسی لیے اس وقت دنیا میں اس سرے سے اس سرے تک مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان ایک مستقل جنگ، اور ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش جاری ہو گئی ہے۔

جب تمام دنیا اس کشمکش میں مبتلا ہے، تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہندوستان، جو مزدوروں کا گھر سمجھا جاتا ہے، اور جہاں سے زبردستی کرایہ پر نوآبادیاں بسانے کو مزدور دُور دُور بھیجے جاتے ہیں، اس جنگ سے محفوظ رہتا۔ اسے تو دنیا کے اور ممالک سے زیادہ اس کشمکش میں مبتلا ہونا چاہیے تھا کہ اس کی آبادی کا پچانوے فیصدی ایسا حصہ ہے جو قسم قسم کے سرمایہ داروں کی خود غرضانہ خواہشات اور اسباب زندگی کی شدید گرانی کے تصادم سے پسا جا رہا ہے ہاں مصائب کے لحاظ سے اگرچہ ہندوستان کے مزدوروں کی بیداری ابھی کچھ زیادہ وقیع نہیں، لیکن جس حد تک وہ پہنچ گئی ہے، اس سے آئندہ بہت سی توقعات قائم ہوتی ہیں۔

اس بیداری کے اثرات ہر روز ہڑتالوں کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن معلوم ہے کہ ہر تحریک کی کامیابی کا راز اجتماع اور مرکزیت میں ہے۔ جب تک یہ نہ ہو اس وقت تک تمام ہڑتالیں، تمام مظاہرات محض ایک شور اور ایک بے اثر ہنگامہ ہیں۔

اسی ضرورت کو محسوس کر کے بمبئی کے مزدوروں اور محنت کرنے والوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی اس طرف رہنمائی کی ہے، اور ایک جمعیت مزدوران ہند

کے قیام کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس جمعیت کا پہلا سالانہ جلسہ ۳۱ر اکتوبر کو بمبئی میں ہوا جس میں تمام ہندوستان کے مزدوروں کے نمائندے جمع ہوئے تھے۔ اس جلسے کی صدارت کے لیے لالہ لاجپت رائے جیسے روشن خیال بزرگ کا انتخاب درحقیقت ایک نہایت موزوں انتخاب تھا۔ اس کے لیے ہم منتظمین جمعیت کو مبارکباد دیتے ہیں۔

لالہ صاحب نے شرکائے جلسہ کے سامنے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اس کا خلاصہ آئندہ اشاعتوں میں درج کریں گے۔ اس میں لالہ صاحب نے بہت بلند خیالات اور صحیح مشوروں سے مزدور پیشہ جماعت کو مستفید کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے لیے ایک "ٹریڈ یونین کانگریس" بہت قبل از وقت ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ زمانے میں مزدوروں کے مصائب بہت شدید ہیں۔ اور غیر منظم ہڑتالیں ان کے مصائب کو ہرگز دور نہیں کر سکتیں۔ اس ضرورت اور پھیلی ہوئی بے چینی کا اقتضا ہے کہ تمام مزدوروں کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی جائے، پہلے سے نقصان رساں دروازوں کو بند کر دیا جائے ــــ ہندوستان میں سرمایہ اور محنت کی کشمکش دنیا کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔ ہر جگہ سرمایہ داروں سے تاجروں اور کارخانہ داروں کا طبقہ مراد لیا جاتا ہے، جو اگرچہ حکومت پر اثر رکھتا ہے، لیکن صاحب حکومت نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں جیسا کہ لالہ صاحب نے فرمایا، خود حکومت ہی سب سے بڑی سرمایہ دار ہے جو ہندوستان پر

نہر، ڈاک، تار، دفاتر اور دوسرے شعبوں میں محنت لے کر دولت حاصل کرتی ہے۔ اس کا نظامِ عمل اُجرت کم، کام بہت اور فائدہ زیادہ حاصل کرنے کے اصول پر مبنی ہے۔ پھر اس پر بھی طرفہ یہ ہے کہ "گورے" اور "کالے" کے ساتھ جداگانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ گورے عزتیں پاتے ہیں اور کالے ذلتیں۔ گوروں کو دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کے اعلیٰ عہدیداروں سے بھی زیادہ تنخواہیں دی جاتی ہیں؛ اور کالوں کو دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی سلطنتوں کے عمّال سے بھی کم۔ گوروں کی بیش قرار تنخواہوں کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہوگا:-

وائسرائے ہند	۱۶۷۲۰	پونڈ	سالانہ
پریزیڈنٹ امریکہ	۱۵۶۲۵	"	"
وزیر اعظم برطانیہ	۵۰۰۰	"	"
پریزیڈنٹ ارجنٹائن	۶۰۰۰	"	"
" پرتگال	۲۶۰۰	"	"
" چلی	۲۰۶۲	"	"
وزیر اعظم جاپان	۱۲۳۱	"	"
" اٹلی	۱۰۰۰	"	"
ہندوستان کی اکزیکٹو کونسل کا ہر ممبر	۵۳۳۳	"	"

ہندوستان کا وائسرائے پریزیڈنٹ امریکہ سے، اور اگزیکٹو کونسل کا ہر ممبر وزیر اعظم

برطانیہ سے زیادہ تنخواہ حاصل کرتا ہے، حالانکہ اگر ملک کی عام دولت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ:۔

- ہندوستان کے وائسرائے کی تنخواہ ۸۳۶۰ ہندوستانیوں کی سالانہ آمدنی کے برابر ہے
- پریزیڈنٹ فرانس " " ۸۵۸ فرانسیسیوں کی " " " "
- وزیر اعظم برطانیہ " " ۱۲۵ انگریزوں کی " " " "
- " اٹلی " " ۸۳ اطالیوں کی " " " "
- پریزیڈنٹ پرتگال " " ۱۰۰ پرتگالیوں کی " " " "

یعنی سب سے زیادہ فضول خرچی ہندوستان میں کی جاتی ہے، حالانکہ ہندوستان دنیا کا غریب ترین ملک ہے۔

اب ایک نظر محکموں کے افسروں پر بھی ڈالنی چاہیے جہاں انگریز افسر زیادہ تنخواہ پاتے ہیں۔

- عام دفاتر کے اعلیٰ افسروں کو ہندوستان میں ۳۲۰۰ پونڈ سالانہ
- " " " انگلستان میں ۲۵۰۰ " "
- " " " امریکہ میں ۱۰۴۲ " "
- " " " اسکاٹ لینڈ میں ۱۰۰۰ " "
- محکمۂ تعلیمات کے اعلیٰ افسروں کو ہندوستان میں ۲۴۰۰ " "
- " " " انگلستان میں ۱۸۰۰ " "

• محکمہ تعلیمات کے اعلیٰ افسروں کو امریکہ میں ۱۰۴۲ پونڈ سالانہ
• " " " " اسکاٹ لینڈ میں ۱۲۰۰ " "
• محکمۂ تجارت " " " ہندوستان میں ۳۴۰۰ " "
• " " " " انگلستان میں ۲۰۰۰ " "
• " " " " امریکہ میں ۱۰۴۲ " "
• " " " " اسکاٹ لینڈ میں ۱۲۰۰ " "

یہ ان محکموں کا حال ہے جو گوروں کے لیے مخصوص ہیں۔ جو محکمے کالوں کے لیے ہیں ان میں انتہائی قلیل تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ ذیل کے اعداد ملاحظہ فرمائیے:-

• ایک ابتدائی مدرسے کا استاد امریکہ میں ۳۱۲ پونڈ اور ایک سپاہی ۲۱۹ پونڈ سالانہ پاتا ہے
• " " " " انگلستان میں ۱۰۰ " " " " "
• " " " " آسٹریلیا میں ۳۶ " "
• " " " " جاپان میں ۳۱ " " " ۱۶ " " "
• " " " " پرتگال میں ۲۰ "
• " " " " ہندوستان میں ۱۰ " " " ۸ " " "

اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانی مقرر نہیں کیے جاتے۔ ذیلی عہدوں پر بھی انگریز زیادہ ہیں بعض ایسے عہدے ہیں جن پہ ہندوستانیوں کو کم اور انگریزوں کو زیادہ تنخواہیں دی جاتی ہیں۔

• یوروپین ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ پانے والے ۱۴۵۴ ہیں
• ہندوستانی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۳۱۴ 〃
• یوروپین ۱۰۰۰ سے زیادہ پانے والے ۱۰۳۰ 〃
• ہندوستانی 〃 〃 〃 〃 ۶۹ 〃
• فوجوں میں گورہ سپاہی شادی شدہ ۲۰۶ اور غیر شادی ۱۵۰ مہینہ تنخواہ پاتا ہے۔ اور
• ہندوستانی سپاہی بہرحال ۲۴ روپے۔

اس مقابلے اور ان اعداد وشمار سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہندوستان میں مزدور پیشہ جماعت صرف وہی نہیں ہے جو کارخانوں میں کام کرتی ہے، بلکہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سرمایہ دار حکومت کے کارخانوں (دفتروں) میں رات دن کام کرتے ہیں، اور محنت کے مقابلے میں کم ازکم تنخواہ پاتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہر وہ شخص مزدور ہے جو سرمایہ دار کی خود غرضی کا شکار ہو، تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حکومت سرمایہ دار ہے، اور اس کے محکموں میں ہر کام کرنے والا (ہندوستانی) مزدور ہے، جو یہاں کام تنفیذ کرتا ہے اور اپنے اہل وعیال کی پرورش بھی نہیں کرسکتا۔

پس ہندوستان کی مزدور جمعیت کو صرف تجارتی کارخانوں کے مزدوروں تک محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس میں دفتری کارخانوں کے مزدوروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے اور ایک کامل متحدہ قوت سے سرمایہ داروں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

(۲۴ر نومبر ۱۹۲۰ء "تاج" جبل پور)

اعتدال پسندوں سے خطاب

ہمارے اعتدال پسند بھائی جس غلط راستے پر چل رہے ہیں، ہماری تمنا ہے کہ گرنے سے پہلے اس راستے کو چھوڑ دیں۔

حکومت نے ملک کی آواز کا جو جواب دیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے، اور اس لیے ہم اپنے اعتدال پسند بھائیوں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کریں۔ یا ملک کا ساتھ دے کر متحدہ قوت سے آزادی کی جنگ میں ایک شاندار فتح حاصل کرنے کی کوشش کریں، یا حکومت کے ساتھ مل کر اپنے بھائیوں کو کچلنے اور امن و سکون کے فریب میں آکر ملک کی تباہی و پامالی کی سعی کریں۔ ان دو راہوں کے سوا کوئی تیسری راہ نہیں ہے، اور اگر ہے تو انسانیت کی نہیں درندگی کی، شرافت کی نہیں ذلت کی راہ ہے۔

یاد رکھو! یہ موت و حیات کی فیصلہ کن کشمکش ہے، جس کا نتیجہ خواہ کسی کی کامیابی کی شکل میں ہو، مگر وہ ایک عرصہ دراز کے لیے آخری اور قطعی ہوگا پس اگر عناصر قومی میں تشتت و افتراق رہا، اور حکومت اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئی، تو سوراج ایک حرف گشتہ آرزو کا نام رہ جائے گا، اور اصلاحات کی وسعت، اور ڈومینین ہوم رول — جس کی تمنائیں تم کر رہے ہو — اک افسانہ ہو جائے گا!

تم امن کے شیدائی ہو، اور بے شک امن ایسی ہی چیز ہے، لیکن ایسا امن

جو پینتیس کروڑ انسانوں کو روند کر قائم کیا جائے، اور جس کا وجود انسانی آبادی کے پانچویں حصے کو بے چین کر رہا ہو، وہ قطعاً اس کا مستحق نہیں ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی زندہ رکھا جائے۔

تم قانون کے حامی ہو، اور حقیقتہً قانون اسی لیے ہے کہ ہر معقول آدمی اس کی حمایت کرے، مگر ایسا قانون جو ایک قوم کو دوسروں کی غلامی پر مجبور کرے، اور جو ایک پوری انسانی آبادی کو اس کی مرضی کے خلاف غلام سازی کے کام میں لایا جا رہا ہے، اسے ایک منٹ کے لیے بھی قانون نہیں کہا جا سکتا۔

امن اس لیے ہے کہ انسانوں کو چین اور آرام بخشے، لیکن جب اس کا قیام عین اپنے مفہوم کے خلاف ہو، اور وہ بنی آدم کے لیے آرام کی جگہ بے آرامی اور چین کی جگہ بے چینی کا باعث ہو جائے، تو امن کے سچے شیدائیوں میں کون ہے جو ایسے امن کو پسند کرے گا؟ — قانون اس لیے ہے کہ عدل و انصاف قائم کرے اور مظلوموں کو ظالموں سے بچائے، لیکن جب قانون ظلم کے لیے ایک آلہ ہو جائے، اور عدل و انصاف کی بیخ کنی کرنے لگے تو خدارا بتلاؤ کہ ایسا قانون کتنی دیر اللہ کے بندوں پر مسلط رہنا چاہیے؟

پس جب امن و قانون کا منشاء و مفہوم ہی بدل گیا ہے تو ان الفاظ کا فریب کب تک قائم رہے گا؟ — اس وقت ضرورت ہے کہ امن و رفاہیت کے سچے حامی کھڑے ہوں، اور اس پُر فریب امن کو بدل کر ملک کے لیے سچا امن

حاصل کریں۔

ہمارا نصب العین

محترم سید حسرت موہانی نے مطالبہ کیا ہے کہ یہ بات صاف کر دینی چاہیے کہ سوراج سے ہماری مراد کیا ہے؟ — انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں بھی اس پر زور دیا ہے۔ اور صاف لفظوں میں یہ کہدیا ہے کہ ہمارا مقصود حریت کاملہ ہے، ایسی حریت کاملہ جو ہر بیرونی اثر سے غیر متاثر، اور اپنے اندرونی و بیرونی معاملات میں بالکل آزاد و خود مختار ہو۔ مولانا آزاد سبحانی نے اس مضمون کی دو قراردادیں مسلم لیگ اور کانگریس میں پیش کی تھیں، لیکن لیگ میں مسٹر رضا علی اور مسٹر جناح نے، اور کانگریس میں مہاتما جی اور حکیم صاحب[1] نے مخالفت کی اور تحریکیں مسترد ہو گئیں۔

مہاتما جی نے اس کے خلاف جو دلائل پیش کیے ہیں وہ بالکل بے حقیقت ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ مہاتما جی کی زبان سے ایسی باتیں کیسے نکل سکیں۔ انہوں نے کہا "سوراج کی تعریف، تحدید نامناسب ہے۔ اگر ہم سوراج کی یہ تعریف کریں کہ یہ نام ہے آزادیٔ کامل کا تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ ہم اپنے اوپر بہت سی اور ذمہ داریوں اور مصیبتوں کو دعوت دیتے ہیں۔ اور اگر یہ معنی لیں کہ اس کا مطلب

---

[1] حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم

زیر سایہ دولت برطانیہ اندرونی آزادی ہے، تو اس کا اظہار غیر ضروری ہے پہلی صورت میں خود حکومت ہی سے ہمیں جو توقعات ہو سکتی ہیں، اور اس کے ماتحت رہتے ہوئے رفع شکایات کا جو امکان ہے، وہ منقطع ہو جائے گا، اور پھر سوائے قطعی آزادی حاصل کرنے کے چارہ کار باقی نہ رہے گا۔ اس لیے بحالات موجودہ سوراج کی تعریف و تعین مناسب نہیں ہے۔"

مہاتماجی نے دوسری دلیل یہ پیش کی کہ ہمیں اس وقت ان باتوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ کام کا وقت ہے، پہلے سوراج حاصل کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد اس کی صورتیں متعین کر لی جائیں گی۔

لیکن کیا ہماری جدوجہد کا نصب العین تاریکی میں ہونا چاہیے؟ اور کیا ہماری یہ قربانیاں اک موہوم شے کے لیے ہیں؟ ہم آزادی کے لیے جان دینے کو تیار ہیں، لیکن اس آزادی کے لیے جان دیں گے جو واضح اور متعین ہو۔ جس میں کسی قسم کا شک و تزلزل نہ ہو، اور جو ہر قسم کی غلامی و اثر پذیری سے پاک ہو۔ ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ ہندوستان برٹش حکومت کے حاکمانہ اثرات سے قطعاً پاک ہو۔ ہم اپنے تمام معاملات میں کلیتہً آزاد ہوں، اور ہمارا ملک بھی آزاد ملکوں کے دوش بدوش جگہ پا سکے۔

پھر یہ کہنا کس قدر بے معنی ہے کہ ہمیں پہلے سوراج حاصل کر لینا چاہیے اس کے بعد اس کی صورتیں متعین کر لی جائیں گی۔ حالانکہ جب آپ کے سامنے

کوئی متعین شکل ہی نہیں، یعنی بالفاظ دیگر سوراج کے کوئی معنی ہی نہیں، تو آپ کس چیز کو حاصل کریں گے؟ اس بے جان لفظ میں کونسی جان ڈالیں گے؟ —

سوراج کے لفظ، یا اس کے غیر متعین و غیر معلوم مفہوم کو منزلِ مقصود بنا لینا کسی طرح بامعنی فعل نہیں ہو سکتا۔ ایسی تگ و دو بالکل بے سود و غیر معقول ہے۔ اور اگر سوراج کی وسعتوں میں کسی ایسے مفہوم کی گنجائش بھی ہے جس میں کسی قسم کی بیرونی نگرانی و حمایت داخل ہو، تو یہ وہ سوراج ہے جو ہمارا مطلوب و مقصود نہیں ہے، اور اس سے ہمیں قطعاً کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ہم اس سوراج کے لیے لڑ رہے ہیں جو ہمیں برطانیہ کا دوست بنا دے، اس سوراج کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں جو ادنیٰ غلام سے اعلیٰ غلام بنائے۔ جو سوراج آپ کا مقصد ہے وہ وہ طبل بلند بانگ در باطن ہیچ ہے۔ وہ آزادی نہیں، غلامی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ پس اگر موجودہ جدوجہد کا مقصود یہ ہے کہ "بھاری غلامی" سے نکل کر "ہلکی غلامی" حاصل کر لی جائے تو ایسا حصول، اور ایسی جدوجہد کسی تعریف کی مستحق نہیں ہے۔

یہ کہنا کہ اگر دولت برطانیہ سے علیحدگی اختیار کیے بغیر ہماری شکایات رفع ہو جائیں تو ہمیں آزادی کامل کے اعلان سے اس امکان کو ناممکن نہیں بنانا چاہیے، کھلی نادانی ہے۔ برٹش گورنمنٹ کی دو سو برس کی روایات کا جس نے بھی مطالعہ کیا ہے، وہ اس سے ہرگز ایسی غلط توقع نہیں رکھ سکتا۔ اور اگر یہ ممکن ہوتا، اس کے

انصاف و انسانیت سے ہم بالکل مایوس نہ ہو چکے ہوتے، تو ترک موالات
کی راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوتے۔ اس کی کونسلوں، تعلیم گاہوں، خطابوں،
ملازمتوں کو نہ چھوڑتے، اور آئینی جدوجہد سے ایسی غلامانہ آزادی حاصل کر لیتے۔
پس جب ہم اس کی طرف سے پوری طرح مایوس ہو چکے ہیں، تو اب اس سے
کسی قسم کی کوئی منصفانہ توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے، اور یک دلی کی سرگرمی سے
اپنے انتہائی مطمحِ نظر کا اعلان کر دینا چاہیے۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے بلند ترین
نصب العین کا اعلان کر دیں اور یہ کہنے میں کانگریس کیمپ کا ایک فرد بھی باک
نہ کرے کہ ہندوستان سے برطانوی تعلق رہنا ہی ایک مستقل شکایت ہے جسے
دور کرنا ہر ہندوستانی کی غیرت و انسانیت کا سب سے بڑا فرض ہے۔

مہاتما جی کی گرفتاری

مہاتما جی کے متعلق عرصے سے یہ خبر مشہور تھی کہ وہ عنقریب گرفتار کیے جانے
والے ہیں۔ خود مہاتما جی بھی اپنی گرفتاری کے منتظر تھے۔ آخر وہ وقت منتظر آیا،
اور ۱۰ مارچ کو مہاتما معہ شنکر لال بنکر احمد آباد میں گرفتار کر لیے گئے۔ اگرچہ
انگلستان کے اخبارات، اور خصوصاً ہندوستان کے مشہور دوست لارڈ سڈنہم اینڈ
کمپنی عرصے سے چیخ پکار کر رہے تھے کہ گاندھی کو گرفتار کر لینا چاہیے، اسی طرح
ہندوستان میں بھی اینگلو انڈین حضرات اس پر زور دے رہے تھے، لیکن حکومتِ ہند

نے اس شور و غل کے باوجود اپنے حواس کو مختل نہ ہونے دیا، اور مہاتما پر ہاتھ نہ ڈال کر اپنے تدبر کا ثبوت دیتی رہی لیکن آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اپنے نام کے ساتھ تدبر و عقل مندی کے الفاظ نہیں رکھنا چاہتی، اور اس لیے اس شخص کو گرفتار کر لیا جو ہندوستان کے پیمانہ صبر کو لبریز ہونے سے اب تک روکے ہوئے تھا۔

لارڈ ریڈنگ کی حکومت نے ابتدا سے لا اور آرڈر کا راگ گایا ہے ہر موقع پر اس کی زبان سے نظم و استوار کے الفاظ نکلے ہیں لیکن اب تک اس نے جو کام کیے ہیں، ان سے نظم کی جگہ بدنظمی کے جراثیم پیدا ہوئے ہیں — ۱۰ مارچ اس کے مشن کی تکمیل کی آخری تاریخ تھی۔

یہ غلط ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ ہمیں مہاتما کی گرفتاری سے رنج نہیں ہوا ہمیں رنج ہے کہ ایک ایسا آدمی ہم سے چھین لیا گیا جو پرامن طریقوں سے ہماری رہنمائی کر رہا تھا، اور ہم اس کے پیچھے چل کر منزل مقصود سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ لیکن اس کا برا اثر ہم سے زیادہ ان پر پڑے گا جو امن و قانون کا شور مچاتے ہیں اور جن کا وجود اسی وقت تک یہاں قائم ہے جب تک یہاں والوں میں صبر و ضبط کی قوت ہے۔

لارڈ ریڈنگ شاید اپنی کامیابی پر فخر کریں گے کہ انہوں نے ہندوستان کے سب سے بڑے رہنما کو گرفتار کر لیا، اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایک جگہ بھی کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا — لیکن درحقیقت یہ کامیابی نہیں ناکامی ہے! اس نے

آغاز ناکامیوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔

غالباً حکومت یہ سمجھتی ہوگی کہ گاندھی جی ہندوستان کی ان اصولوں پر سپاہی کرتے ہیں جن کے ذریعے وہ کامیابی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے ان کو گرفتار کرلینا چاہیے تاکہ ملک سنجیدہ اور پرامن راہوں کو چھوڑ کر شورہ ہنگامے، اور پھر اسی بدنظمی میں مبتلا ہو جائے۔ اور پھر اسلحہ کی قوت سے قومیت کی روح کو کچلا جاسکے۔ لیکن وہ اپنے اس منصوبے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ کوئی شک نہیں کہ ڈسپلن اور نظام کی قوت ضائع ہو جانے کے بعد ملک میں بدنظمی کا پھیل جانا ممکن ہے، اور ایک ہوشیار حکومت کے لیے بدنظمی کو کچل دینا بہت آسان ہے۔ لیکن اس کے علم میں یہ بات بھی آجانی چاہیے کہ ہندوستان میں تشدد کی جانب عام میلان پیدا ہوگیا ہے، اور انہیں یہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ کامیابی صرف تشدد میں ہے۔ پھر ہم میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو آناً فاناً ملک کو تشدد کے لیے تیار کر دیں گے، اور ہندوستان نہایت سرگرمی سے اس راہ پر چل کھڑا ہوگا جس کو آئرلینڈ اور مصر نے اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس دن تشدد ملک میں بنیادوں پر قائم ہوگیا، وہ دن انگلستان کے مستقبل کے لیے بہت خطرناک ہوگا۔

تشدد اور اس کے نتائج

گرفتاریوں کا سلسلہ دو ہفتے سے مسلسل جاری ہے۔ تمام صوبوں کے

رہنما جیل پہنچ چکے ہیں، اور جب تک یہ سطریں قارئین تک پہنچیں گی اور بہت سے فدائیانِ ملک اپنے بھائیوں سے مل چکے ہونگے۔

۱۹۱۹ء میں ملک کے ہر دلعزیز رہنما کی گرفتاری کا جو سبق ملا تھا، اور دہلی، احمد آباد اور پنجاب میں جو حوادث رونما ہوئے تھے، ان کو یاد کرکے حکومت ڈرتی تھی، اور آج سے چند مہینے پہلے تک اس کا یہ رویہ تھا کہ وہ ممتاز لیڈروں پر ہاتھ نہیں ڈالتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کارکنوں کو پکڑتی اور من مانی سزائیں دیتی تھی لیکن لارڈ ریڈنگ نے مسٹر محمد علی اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرکے ہندوستان کی امن پسندی اور غیر انشدادی ترک موالات کا امتحان لیا، اور جب انہیں اسمیں خلاف توقع کامیاب نتیجہ نظر آیا، تو اب انہوں نے نظم و قانون کو قائم کرنے کے نام سے چھوٹوں کو چھوڑ کر بڑوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا ہے۔ بنگال میں مولانا ابوالکلام اور مسٹر داس، پنجاب میں لاجپت رائے اور صوبہ متحدہ میں پنڈت نہرو گرفتار کیے جا چکے ہیں۔

ان گرفتاریوں پر ہندوستان کی خاموشی کو لارڈ ریڈنگ اپنی انتظامی خوبی اور اپنی قوت سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ان کا حسن ظن ہے! فسادات کو جس قوت نے روکا ہے، شورشوں کو جس چیز نے دبایا ہے، ہنگامے جس وجہ سے نہیں اٹھے وہ حکومت کی قوت نہیں، بلکہ ہماری امن پسندی ہے، ہماری قانون دوستی ہے اور خود ان اسیرانِ نظم و قانون، ان مجرمانِ جرم بے جرمی کی تعلیمات ہیں۔ اور اگر

ہندوستان کو پُرامن اور تشدد سے باز رہنے کی تلقین نہ کی جاتی، اگر وہی لوگ جن کو نام نہاد امن عامہ کے لیے گرفتار کیا گیا ہے سکون اور شانتی کا پرچار نہ کرتے تو یہ نارمل کی بندش، یہ فوجیوں کی مستعدی، یہ پولیس کی مطلق العنانی، یہ اردھاڑ یہ ہوائی جہازوں کی پرواز، ان کو نہیں روک سکتی تھی۔ یہ سب قوتیں بیکار ثابت ہوتیں اور یہ دن نہ آنے پاتا، بلکہ ہندوستان ایک مستقل بدامنی اور ایک غیر محدود طوائف الملوکی کا گھر بن چکا ہوتا۔

گرفتاری کے اس سلسلے کا آغاز پرنس آف ویلز کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے ساتھ شروع ہوا ہے۔ اس سے حکومت کا یہ مطلب ہے کہ امن پسند ہندوستانی گرفتاریوں سے ڈر کر شہزادہ کا استقبال کریں، اور ایک مصیبت زدہ مفلس، پریشانیوں سے گھری ہوئی قوم پر ایک فضول سیاحت کے خیر مقدم کا بار ڈالا جائے۔ لیکن اگر حکومت کے پاس دوراندیشی کا تھوڑا سا سرمایہ بھی ہوتا تو وہ دیکھ سکتی تھی کہ تشدد سے ۳۲ کروڑ انسانوں کے جذبات کو دبا کر نہ شہزادہ کے قدموں کو مسعود و محبوب بنایا جاسکتا ہے اور نہ اس قسم کی کسی کوشش میں حکومت کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کامیابی حاصل کر سکتی ہے۔ لارڈ ریڈنگ نے گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر کے شہزادے کو اک عذاب، اک بلا، اک مصیبت بنا دیا ہے۔

لیکن کیا ارباب حکومت یہ جانتے ہیں کہ ان گرفتاریوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟

جو سختیاں اب تک ہو چکی ہیں، اور جن کی تیاریاں کی جا رہی ہیں، وہ ہم پر نہیں بلکہ حکومت خود اپنے اوپر کر رہی ہے۔ اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا، خود اسی کا مستقبل خراب ہو گا ــــ اس وقت لارڈ ریڈنگ نے جو پالیسی اختیار کی ہے وہ شاید ان کے نزدیک مدبرانہ ہو، اور بہت ممکن ہے کہ فی الحال اس سے انگریزی قوم ہندوستان میں اپنی حکومت کا پھریرا قائم رکھنے میں کامیاب بھی ہو جائے، لیکن غافل نہ رہنا چاہیے کہ یہی تدبر اس کے مستقبل کے لیے سخت خطرناک ہو گا۔ لارڈ ریڈنگ اقتدار کے جوش میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے، لیکن ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ جن بنیادوں کو لارڈ چیمس فرڈ نے کھوکھلا کیا تھا، لارڈ ریڈنگ ان میں سرنگ لگا رہے ہیں۔ اور آج نہیں تو کل اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجے گی۔

لارڈ ریڈنگ خوش ہیں کہ انہوں نے کامیابی سے ہندوستان کی تحریک آزادی کے رہنماؤں کو پکڑ لیا ہے۔ انہیں اس خیال سے بے اندازہ مسرت ہو رہی ہو گی کہ ان کی یہ پالیسی ترک موالات کی جڑوں کو اس سرزمین سے عنقریب اکھاڑ پھینکے گی۔ لیکن فطرت ان کی اس کامیابی کو مستقبل کی ناکامی بنانے پر تل رہی ہے، اور قانون قدرت ان کی اس مسرت پر ہنس رہا ہے، اور اسی کے ساتھ وہ پکار رہا ہے کہ اگر یہ آئینی اور پرامن تحریک ان سختیوں سے ناکام ہو گئی، اگر وہ سب لوگ جو بغیر اک قطرہ خون بہائے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں بندی خانوں میں بھر دیئے گئے، تو یقین رکھو کہ جس تاریخ کو یہ کام انجام پائے گا، اسی تاریخ سے نظم و قانون کی ناکامی کا عہد شروع ہو گا، اور

غیر خوں ریز انقلاب خواہوں کو دعوت دے گا کہ وہ اس خلا کو پُر کر دیں۔

کسی حکومت پر جب برے دن آتے ہیں تو اس کی عقل معطل ہو جاتی ہے، حواس قائم نہیں رہتے، حقائق کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ حکومت کا بھی یہی حال ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں، عقل پر بے ہوشی کے پردے ڈال لیے ہیں، اور باوجود یہ جاننے کے کہ فرانس، روس، اٹلی، آئرلینڈ، اور مصر میں کس طرح انقلابی تحریکیں شروع ہوئیں، اسی راستے پر چل رہی ہے، اور ہندوستان کو مجبور کر رہی ہے کہ یہی راستہ اختیار کرے۔

اس بحث سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ ہم حکومت کو نصیحت کریں، اور اسے بے تحاشا گرفتاریوں سے روکیں۔ ہم گرفتاریوں سے خوف زدہ نہیں ہیں۔ ہم اس کے سلاح خانے کے کسی ہتھیار سے نہیں ڈرتے، اور وہ ہمیں اپنی اس نمائش قوت سے کسی طرح نہ ڈرا سکے گی ——— بلکہ اس لکھنے سے ہمارا مقصود یہ اور صرف یہ ہے کہ ہم دل سے یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین خون سے رنگین نہ ہو۔ ہمارا اور ہماری حکومت کا دامن خوں ریزی کی گناہ گاریوں سے آلودہ نہ ہو، ورنہ یہ یقینی ہے کہ پُرامن تحریک کو دبانے سے، ہندوستان کے ہر حصے میں بارود کمار گھوش پیدا ہوں گے، آزادی کے طالب ان کی آواز پر لبیک کہیں گے، اور ہر طرف سازشوں کی گرم بازاری ہو جائے گی، جس کا نتیجہ لازمی طور پر سقوط ہو گا۔

کانگریس کا آخری فیصلہ

کانگریس نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔ باردولی میں جو ریزولیوشن پاس کیا گیا تھا، اس میں کلیتہً اسی کو تسلیم کر لیا گیا ہے، اور جو ترمیم کی گئی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ مقامی کانگریس کمیٹیوں کی اجازت سے خاص خاص حالات میں انفرادی قانون شکنی کی جا سکتی ہے۔ ایک ترمیم یہ بھی ہے کہ ان خاص خاص مقامات پر، جہاں بدیشی کپڑے کی دوکانوں پر پہرہ کی ضرورت ہو، اعلیٰ اخلاق کے رضا کار، جنہیں کانگریس کمیٹی منتخب کرے، پہرہ دیں۔ لیکن ترمیمیں کچھ اہم نہیں ہیں، اور ان سے اصل ریزولیوشن کے جمود پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

ہمیں باردولی ریزولیوشن کے ساتھ اصولی حیثیت سے پورا اتفاق ہے لیکن اسی کے ساتھ ہمیں مدافعانہ قانون شکنی ملتوی کرنے سے اختلاف ہے، اور یہ سخت غلطی کی گئی ہے کہ وہ ریزولیوشن، ایک ناقابل لحاظ ترمیم کے بعد، بعینہٖ پاس کر دیا گیا، حالانکہ اس سے اعتدال پسند جماعت کے گنے چنے افراد کے علاوہ راس کماری سے لے کر پشاور تک ایک ہستی بھی ایسی نہیں ہے جو خوش ہو، اور اس فیصلے سے رنجیدہ و مایوس نہ ہو۔

تعمیری کام کے بہتر اور مفید ہونے سے انکار نہیں۔ پرامن فضا کی ضرورت، اور تحریک کے کلیتہً غیر متشدد رہنے کی اہمیت ہمیں تسلیم ہے، اور جماعت کو ترتیب

منظم کرنے کے بھی ہم منکر نہیں، لیکن ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آپ اگر عین بارش میں مکان بنائیں گے تو شاید کوئی بے وقوف بھی آپ کو عقلمند کہنے کی غلطی نہیں کریگا! آپ کو سوچنا چاہیے کہ جس وقت تعمیر کی تیاری کی جارہی ہے، وہ وقت اس کے لیے موزوں بھی ہے یا نہیں؟ — پھر یہ تو کوئی عقلمندی نہیں کہ آپ ایک مکان بنا چکے ہیں، عنقریب اس کی تکمیل بھی ہو جائے گی، مگر یہ معلوم ہوتے ہی کہ اس کی چھت ایک جگہ سے ٹپکنے لگی ہے، آپ دفعتہً عین بارش کے زمانے میں اس کو ڈھادیں، اور از سر نو تعمیر شروع کردیں۔

تحریک کی بنیاد پہلے اصولوں پر تھی، لیکن اب اس کی کامیابی اور ترقی، بلکہ اس کی زندگی کا انحصار رائے عامہ پر ہے۔ جب رائے عامہ پر اس پسپائی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ہر شخص اس کو شکست سمجھتا ہے، تو یہ سخت غلطی ہے کہ آپ نے رائے عامہ کو نظر انداز کر دیا، اور اصولوں کی جانب لوٹ گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اپنی نئی تجویزوں کے کسی شعبے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ آپ کانگریس کے لیے ایک کروڑ ممبر مانگتے ہیں، لیکن لوگ اس قدر بددل ہو گئے ہیں کہ ممبر ملنے تو الگ رہے، موجودہ ممبروں کی ایک پرجوش جماعت بھی علیحدہ ہو جائیگی۔ آپ تلک سوراج فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنا چاہتے، مگر اب آپ کو عوام سے ایک پیسہ ملنے کی بھی توقع نہ رکھنی چاہیے، کیونکہ آپ نے خود اپنے ہاتھوں شکست قبول کی ہے۔ آپ پنچائتیں قائم کرنے کی تبلیغ کرتے ہیں، لیکن جب آپ نے رائے عامہ

کی موافقت کی قوت کو کھو دیا تو اب آپ کا فیصلہ کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ آپ کھدر کو فروغ دینا چاہتے ہیں، مگر آپ کو جاننا چاہیے کہ عوام نے کھدر کو اقتصادی فوائد کے لیے نہیں پہنا تھا، اور آپ نے بھی ان کے جذبات سے اپیل کی تھی، پھر جب جذبات پر اوس پڑ چکی ہے تو آپ یہ امید نہ رکھیے کہ وہ ولایتی کپڑے سے اجتناب کریں گے۔ آپ پر امن جدوجہد قائم کرنی چاہتے ہیں، لیکن امن کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کے ہاں ان لوگوں کے جوش کے لیے کوئی گنجائش ہوتی جو اپنے مذہب و ملک کی آگ سے مشتعل ہو رہے ہیں، پھر جب آپ نے ان کے جوش، اور ان کی حرارت کو اپنے قابو سے نکال دیا ہے تو کیوں یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اب بھی اسی راہ چلتے رہیں گے جس راہ آپ نے ان کو چلایا ہے، اور جب منزل بالکل سامنے تھی تو ایک اندھے کنوئیں میں گرا دیا۔

ہم نے جو کچھ کہا وہ امکانی باتیں نہیں ہیں، بلکہ وہ باتیں ہیں جو پیدا ہو چکی ہیں اور اگر یہی رنگ رہا تو اس سے زیادہ پیدا ہوں گی۔ علانیہ کہا جا رہا ہے کہ تحریک مردہ ہو گئی، حسبِ عادت بیٹھ گئے۔ کھدر جسموں سے اتر رہا ہے، لاکھوں کے آرڈر لنکا شائر جا چکے ہیں، اور امید نہیں کہ جمنالال جی کے علاوہ کوئی اور بزاز بھی سودیشی کے عہد پر قائم رہے۔ ہزاروں رضاکار، جو محض اس توقع پر جیل گئے تھے کہ مہاتما سے بعد ملک بڑھتا رہے گا، اب اس کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر بددل ہو گئے ہیں اسی ہفتے کی بات ہے کہ فرید پور جیل سے ۱۶۰ رضاکاروں نے معافی مانگ کر رہائی

حاصل کی ہے۔ سینکڑوں قومی خادم جنہوں نے اپنا کاروبار تحریک پر تج دیا تھا، جو اپنے چین آرام کو سوراج پر فدا کر چکے تھے، اب سوچ رہے ہیں کہ کونسی راہِ عمل اختیار کریں۔

اس بارے میں ملک پر نا سمجھی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ اس طرف خود نہیں گیا، بلکہ اسے زبردستی اس طرف دھکیلا گیا ہے۔ اسے جس راہ پر ڈالا گیا تھا، اور جو توقعات دلائی گئی تھیں، ان کی بنا پر وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا جہاز آزادی کے ساحل کے سامنے پہنچ چکا ہے۔ اور اس کے بعد اسے امید تھی کہ اس کے عزیز و محبوب قیدی جیل خانوں سے باہر آ جائیں گے، غیروں کی غلامی کا طوق اس کے گلے سے اتر جائے گا، اور اس کے فرزند انسانیت کے صحیح مفہوم کے مطابق آزاد انسان ہو جائیں گے۔ لیکن عین اس وقت جب وہ ان امیدوں سے لبریز تھے، جب وہ ان تمناؤں پر جی رہے تھے، دفعتہً جہاز کی واپسی کا حکم ملتا ہے اور لنگر اٹھا کر اسی جانب چلا دیا جاتا ہے جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ پس اس توقع شکن رجعت قہقری کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ کوئی مایوس ہو کر جہاز سے اتر جائے، اور کوئی تختۂ جہاز سے سمندر میں کود کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی متہورانہ کوشش کرے۔ اس کا الزام نہ مایوس ہو کر بیٹھ جانے والوں پر لگایا جا سکتا ہے، نہ بددل ہو کر سمندر میں کود پڑنے والوں پر، بلکہ اس کے ملزم جہاز کے چلانے والے ہیں۔ جنہوں نے منزلِ مقصود کے تمنائیوں کو وہاں تک پہنچ جانے کی قطعی و یقینی توقع

دلائی، اور پھر عین ساحل کے سامنے پہنچ کر امیدوں پہ پانی پھیر دیا اور جہاز کو واپسی کا حکم دے دیا۔

کہا جاتا تھا کہ مسافروں کے لیے جو قواعد مقرر کیے گئے ہیں انہوں نے ان کی پابندی نہیں کی۔ سوال یہ ہے کہ مسافروں میں سے اگر کسی ایک نے ان کی پابندی نہیں کی تو اس ایک کو جہاز سے نکال دیا جاتا، سارے جہاز کے مسافروں کو جنہوں نے سخت سے سخت اوقات میں بھی قواعد کی پابندی کی تھی، اس کی سزا دینا کونسا انصاف ہے؟ یہ منطق کہ ایک شخص کے قانون توڑ دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسافروں میں ابھی جہاز کے قانون کی خلاف ورزی کا امکان باقی ہے، ایک لغو اور احمقانہ منطق ہے یعنی دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوتے کہ اگر ایک ہندوستانی چوری کرتا ہے، تو یقیناً اس بات کا امکان ہے کہ ہندوستان کا ہر باشندہ چوری کرے، لہٰذا سارے ہندوستانیوں کو اس کی سزا دینی چاہیے۔ اگر ایک اُستاد کے شاگردوں میں سے کوئی شاگرد فیل ہو جاتا ہے تو ضرور ہے کہ تمام شاگرد کامیاب نہ ہوں، لہٰذا اس کو سبق نہ پڑھانا چاہیے۔ اگر ایک حکومت میں کسی جگہ بدامنی ہوتی ہے تو اس کا امکان ہے کہ ساری حکومت میں بدامنی ہو، لہٰذا یا اس حکومت کو معطل ہو جانا چاہیے، یا تمام رعایا کو سزا دینی چاہیے۔ اگر اس امکان کے وہم میں ساری دنیا مبتلا ہو جائے تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ پس اگر یہ کوشش اس لیے ہے کہ تشدد اور بدامنی کا امکان قطعاً مٹا دیا جائے

تو یقیناً یہ فطرت سے ایک مضحکہ انگیز جنگ ہے، جس میں کامیابی کی توقع جنون اور دیوانگی ہے۔ امکان کا مٹانا مہاتما جی کے بس کا کام نہیں۔ اس کو ساری دنیا کی متحدہ قوت بھی نہیں مٹا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ بار دولی ریزولیوشن کی بعینہٖ تصدیق کرنے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سخت غلطی کی ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے ریزولیوشن کے ایک حصے میں تسلی دینے کی بھی کوشش کی ہے، اور یہ بتلا دیا ہے کہ اس التوا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تحریک مردہ ہو گئی، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی بنیادوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ لیکن یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن میں جان نہیں۔ کانگریس نے جو تجاویز پاس کی ہیں ان کا عملی نتیجہ تحریک کی موت ہے ہمیں یاد آتا ہے کہ لارڈ چیمس فرڈ نے کہا تھا کہ یہ تحریک خود اپنی موت کا باعث ہو گی اب دیکھتے ہیں کہ وہ جان توڑ رہی ہے، نبض ساقط ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے" اور کانگریس عملاً لارڈ چیمس فرڈ کے قول کی تصدیق کر رہی ہے۔ اس نے خود اپنے لیے موت کو بلایا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ملک کے ممتاز رہنماؤں میں سے اکثر بار دولی ریزولیوشن کے مخالف ہیں۔ بنگال اور مہاراشٹرا پارٹیاں آخر وقت تک اختلاف کرتی رہیں۔ قید شدہ بزرگوں نے بھی اختلافی خطوط بھیجے، لیکن ملکی رائے کے اس زبردست اظہار کو صرف گاندھی جی کی شخصیت پر نثار کر دیا گیا، اور ریزولیوشن کثرت آراء سے

پاس کر دیا گیا۔ شخصیت سے اتنا متاثر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم آزادی کی جدوجہد میں بھی غلام ہیں، اور ایک استبداد کی لعنت کو مٹا کر دوسرے استبداد کی لعنت کو اپنے گلے میں ڈال رہے ہیں۔ کانگریس کمیٹی کے جن ارکان نے محض مہاتما جی کی خاطر ان کی موافقت میں رائے دی، انہوں نے ملک کی نمائندگی نہیں کی اور ان لوگوں کے ساتھ، جنہوں نے ان کو اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، دھوکا اور غدر کیا ہے۔ غالباً خود مہاتما بھی اس کو پسند نہیں کریں گے کہ کوئی شخص اظہارِ حق صرف اس لیے نہ کرے کہ مہاتما اسے حق نہیں سمجھتے۔

(یکم مارچ ۱۹۲۳ء)

ملک پر کانگریس کے فیصلے کے بُرے اثرات

کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کی تجاویز میں جو نقائص ہیں، ان سے ہم اربابِ حل و عقد کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں ان پر غور کریں، اور ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

کوئی شک نہیں کہ ایک جرنیل کو جب وہ غنیم کے ملک میں بڑھا چلا جا رہا ہو، اپنی کسی کمزوری سے آگاہ ہونے پر پسپا ہونا چاہیے، مگر فتح کی آرزومند اور جذبات سے لبریز فوج کو دفعتہً پسپائی کا حکم دے دینا درحقیقت شکستوں کو اپنے اوپر آپ دعوت دینا ہے۔ ہماری فوج عوام سے مرکب ہے، اور

ظاہر ہے کہ عوام ان ذمے داریوں کو نہیں سمجھ سکتے جو ان کے رہنما پر عائد ہوتی ہیں۔ اور نہ ان نزاکتوں کو محسوس کر سکتے ہیں جن سے ایک تحریک چلانے والے کو واسطہ پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں، خواہ پسپائی کتنی ہی ضروری ہو، لیکن اس نفسیاتی اثر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو اس سے فوج پر پڑے گا۔

عام لوگوں پر، بلکہ چند خاص لوگوں کو چھوڑ کر، تمام ملک پر اس پسپائی کا یہ اثر پڑا ہے کہ ہر شخص مایوس ہے۔ نہایت تعلیم یافتہ اور سمجھ دار حضرات بھی اس کو شکست سے تعبیر کرتے ہیں۔ کام کرنے والوں کے دل ٹوٹ گئے ہیں، اور سرگرم قومی خادموں کی ہمتیں پست ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مایوسی اور عام ناراضی ایسی چیز نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ہم کو اس کا لحاظ کرنا پڑے گا، ورنہ یقیناً ہمارا شیرازہ بکھر جائے گا، اور ہم خواہ کتنے ہی ہوشمندانہ فیصلے کریں، مگر ان کی تعمیل کرنے والے ہاتھ ہم سے کٹ جائیں گے، پس اس طرف سے آنکھیں بند نہیں کر لینی چاہئیں۔

اس عام بددلی کے نتائج نہایت خطرناک ہیں۔ سب سے پہلا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ جو قبیلے کارکن جماعت تک ترک موالات کی پُرامن تحریک میں صرف اس وجہ سے شریک تھے کہ ان کو اس کے ذریعے جلد سے جلد اپنا مقصود حاصل ہونے، اور اپنی مساعی کا نتیجہ برآمد ہو جانے کی امیدیں تھیں۔ لیکن اب کانگریس کی رفتار کو سست دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اس سے تو پچاس برس میں بھی نزرب مقصود

تک پہنچنا مشکل ہے اس سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ اس وقت وہ خالی نہ بیٹھیں گے، کچھ نہ کچھ کریں گے، اور جو کچھ کریں گے اس کے متعلق یہ امید کرنا کہ وہ پُرامن ہوگا، سخت حماقت ہے۔ نوجوانوں کا ایک بڑا گروہ ادھر سے مایوس ہو کر تشدد پر اُتر آئے گا، اور ایک شدید بدامنی برپا کر دے گا۔ یعنی جو کام اس وقت امن قائم رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے وہی اس کو توڑنے، اور اب سے زیادہ توڑنے کا باعث ہوگا۔

دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ سودیشی تحریک بڑی حد تک سرد پڑ جائے گی۔ جتنے لوگ اب گاڑھا پہنتے ہیں، اور جتنے گھروں میں اس وقت چرخا چل رہا ہے، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے کھادی اور چرخے کی خوبیوں کو سمجھ کر نہیں بلکہ جذبات سے متاثر ہو کر اختیار کیا ہے۔ جب یہ جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا تو وہ گاڑھا پہننا اور چرخا چلانا چھوڑ دیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوگا کہ جن سوداگروں نے بدیشی کپڑا نہ منگانے کا عہد کر لیا تھا، پھر اس کی تجارت شروع کر دیں گے۔ وہ گذشتہ چند مہینوں میں شدید نقصانات اٹھا چکے ہیں، اور اب جب کہ سوراج ایک غیر محدود اور غیر معین زمانے کے لیے ملتوی ہو گیا ہے، ان سے یہ امید رکھنا کہ برابر نقصان برداشت کریں گے، سادہ لوحی ہے۔

یہاں اس عام مایوسی کے نتائج بالتفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں، لیکن اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ عوام اور کارکنوں کی مایوسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ملک کو جتنا آگے بڑھا دیکھ چکے ہیں، وہ اس سے بہت زیادہ پیچھے ہٹ جائے گا، اور اس حالت

میں تعمیری کام کرنے کا بھی موقع نہیں رہے گا۔ آپ عوام کو ایک ہنگامہ جنگ میں مبتلا کر چکے ہیں، اور ان کو شور و غوغا، اور ہجوم و اقدام کا مزہ پڑ چکا ہے۔ پھر یہ کیسی غلطی ہے کہ آپ دفعتہً ان کو اس میدان سے ہٹا کر ایک خاموش اور ٹھوس فضا میں لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا نفسیات اجتماعی کی اس سے زیادہ کوئی افسوسناک غلطی ہو سکتی ہے؟ — یا تعمیری کی ہوتی اور ملک کو ہنگامے میں نہ ڈالا ہوتا، آپ جو کچھ کر چکے ہیں اس کو جاری رکھتے ہوئے، اقدام و تخریب کے پہلو بہ پہلو تعمیری کام سرگرمی سے جاری کیجیے، اور ملک کو ایسی فضا میں نہ لے جائیے جہاں اس کی آنکھوں پر اندھیرا چھا جائے اور اس کا دل، مایوسیوں سے لبریز ہو جائے لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ فطرت سے جنگ ہوگی، جس میں آج تک کوئی کامیاب ہوا ہے، نہ آئندہ ہوگا۔

اس وقت جو مایوسی ملک پر طاری ہے وہ تعمیری کاموں سے دور نہیں ہو سکتی۔ دلائل کی وہ پوری قوت، جو آغاز تخلیق سے اب تک انسانوں کو دی گئی ہے اگر وہ کسی ایک زبان میں جمع ہو جائے، اور وہ عوام کو سمجھانے کی کوشش کرے تب بھی ان کی مایوسیاں دور نہیں ہو سکتیں، اس لیے رہنمایان ملک کا فرض ہے کہ وہ ملک کے عام جذبات کی رعایت کے ساتھ اپنی کمزوریوں کو رفع کرنے اور تازہ قوت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ پسپا ہونے سے بہتر یہ ہے کہ جس تیز قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے، اس میں ذرا آہستگی پیدا کریں، اور جو تمام قوتیں تخریب اور اقدام میں لگی ہوئی تھیں ان میں تقسیم عمل کر کے کچھ اقدام کی طرف، کچھ تخریب کی طرف اور

ایک بڑا حصّہ تعمیر میں لگا دیا جائے۔

امید ہے کہ اربابِ حل و عقد اس مشورہ پر غور کریں گے۔

ہمیں اپنی پالیسی نہیں بدلنی چاہیئے

ترک موالات حکومت کی موجودہ پالیسی سے کامل مایوسی کا نتیجہ تھا۔ ایک شخص جب کسی حکومت سے علیحدگی اختیار کرتا ہے تو گویا وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ اس کے انصاف اور قانون سے مایوس ہو گیا ہے۔ اور اس لیے وہ اس سے موالات نہیں کرنا چاہتا۔ پھر جو لوگ موالات کے حامی ہیں، جو ادنیٰ ادنیٰ ناکامیوں پر ترک موالات سے بدعقیدہ ہو جاتے ہیں، انہیں واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے، اور مستقل مزاجی سے ایک راہ اختیار کر لینی چاہیے۔ تلون اور ڈگمگاہٹ کسی راہ میں بھی ہو مذموم ہے۔

پے در پے تجربوں سے ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ موجودہ حکومت سے ہندوستان کو کسی فائدے کی امید نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو ہندوستان کے ساتھ انصاف نہیں کرنا چاہتے، دوسری طرف سرے سے اس کا نظام ہی ایسی بنیادوں پر مبنی ہے جس میں رہ کر کوئی شخص ملک کی سچی خدمت نہیں کر سکتا۔

وہ نظام جس پر یہ حکومت ہندوستان میں قائم ہے، لوٹ مار، نوچ کھسوٹ

ظلم و زیادتی، اور ملک کی متفقہ مرضی کے خلاف ملک پر حکمران ہے۔ پھر کیا ایسے نظام سے کسی فائدے کی توقع، زہر کھا کر زندہ رہنے کی توقع سے کچھ کم احمقانہ ہے؟ ـــ ظاہر ہے کہ لوٹ مار، نوچ کھسوٹ، ظلم و ناانصافی ایک برائی ہے جس کو مٹانا ہر انسان کا پہلا انسانی فرض ہے۔ لیکن اگر ہم کسی وجہ سے اس برائی کے نظام کو مٹانے سے قاصر ہیں، تو کیا ہمیں اس سے علیحدگی بھی اختیار نہیں کرنا چاہیے؟ برائی کو برائی سمجھتے ہوئے نہ مٹانا، اور اس کے ساتھ محض اغراض و خواہشات کے لیے موالات کرنا، شیطانی عمل ہے۔ پس جو لوگ اس شیطانی نظام کا آلۂ کار بنتے ہیں وہ پاپی ہیں، گناہ گار ہیں۔ اور نہ صرف اپنی مادرِ وطن سے بغاوت کرتے ہیں، نہ صرف اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے کی ذلیل زندگی کرتے ہیں، بلکہ وہ انسانیت کے لیے ایک ننگا داغ ہیں۔ ان کا وجود ایک لعنت ہے، اور وہ مذہب و قانون دونوں کے شدید ترین مجرم ہیں۔

مسلمانوں کی راہِ عمل اور علماءِ کرام کا فرض

کانگریس کمیٹی کے فیصلے پر اگرچہ بہت کچھ بحث کی جاسکتی ہے، لیکن اب یہ بالکل بے سود ہے۔ آخری فیصلہ ہو چکا، اور جب تک کوئی دوسرا جلسہ ہو کر فیصلہ نہ کیا جائے یہ فیصلہ نافذ رہے گا۔

اب ملک کے لیے دو راہیں ہیں: ایک یہ کہ اپنے جذبات و حسیات کے

مطابق کانگریس کے فیصلے کو نہ مانے، اور جس طرف قدم بڑھ رہے تھے اس طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے رہیں۔ دوسری یہ کہ کانگریس کے فیصلے پر عمل کیا جائے، اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنے دل میں اس کی خلاف ورزی کا خیال نہ لایا جائے پہلی راہ اختیار کرنے کا نتیجہ ہمارے مقصد کے خلاف ہے۔ وہ افتراق اور پھوٹ کی راہ ہے اس میں ملک کی قوتیں منتشر ہو جائیں گی، شیرازہ بکھر جائے گا، اور بدامنی، تباہی، طوائف الملوکی کی نحوست چھا جائے گی۔ دوسری راہ گو جذبات کے خلاف ہے اور اگرچہ اس کی ترکیب آرزوؤں کے خون، اور ترجیحات کی پامالی سے ہوتی ہے تاہم وہ جماعت اور یکجہتی کی راہ ہے۔ ہمیں ان دونوں میں سے ایک راہ منتخب کر لینی چاہیے۔ اس کے لیے کسی سوچ اور کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ جماعت بہرحال فرقہ بندی سے بہتر ہے۔ ایکا بہر صورت پھوٹ کے مقابلے میں برتری رکھتا ہے، اور یکجائی کو ہر حیثیت سے علیحدگی پر ترجیح ہے۔

لیکن اس ملک میں ایک قوم مسلمان نام بھی بستی ہے جس نے اس تحریک کو مذہبی حیثیت سے اختیار کیا تھا، اور اسی کی خاطر اس نے مصائب برداشت کیے۔ موجودہ حالات میں اس کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ وہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے کہ آگے بڑھنا تباہی کی طرف پیش قدمی کرنا ہے۔ نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے کہ وہ ملکی اغراض کے لیے اس میدان میں نہیں آئی تھی بلکہ اس کی جنگ کا مقصد متاعِ دین و ایمان کو بچانا تھا، جو اب تک اسی طرح خطرے میں ہے۔ اور تنہا اس نقطہ پر

لمحہ کی بھی نہیں رہ سکتی۔ یہ وقت مسلمانوں کے لیے نہایت تکلیف دہ اور پریشان کن ہے۔

جمعیت العلماء کو اس طرف جلدی توجہ کرنی چاہیے اور ایسی راہ بتلانی چاہیے جس میں نہ تو وہ آزادی کی جدوجہد میں ملک کی اور قوموں سے علیحدہ ہوں، اور نہ خلافت اسلامی اور مقامات مقدسہ کے مطالبے سے عملاً دست بردار ہوں۔ یہ مہلک غلطی ہوگی اگر ہم آزادی کے نام پر اپنی انفرادیت کو قربان کردیں۔ خود جمعیت العلماء کا وجود ہماری انفرادیت کا کھلا نشان ہے، اور یہ بات اسی نوبت پر صاف اور واضح ہو جانی چاہیے کہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں اور اپنی اسی حیثیت کے استقرار کے ساتھ ہم آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیں گے — اول و آخر ہندوستانی، یا اول ہندوستانی اور پھر سب کچھ، اس قسم کے نظریے ہمارے لیے قطعاً ناقابل قبول ہیں۔

ہمیں ترکوں سے کیوں محبت ہے؟

صلیب کے مقابلے میں اسلام کے لیے کون سینہ سپر ہوتا؟ — اگر جان باز ترک نہ ہوتے تو افریقہ سے اسلام مٹ چکا ہوتا، بلقان میں صدائے تکبیر کبھی کی بند ہو چکی ہوتی، شام، عراق میں ناقوسِ کلیسا گونجتا، اور دنیا پر مسیحی صلیب چھا جاتی۔ مسلمانوں کو مسلمان رہ کر جنگلوں میں بھی پناہ نہ ملتی۔ ترک نہ ہوتے، ان کی خارا شگاف تلواریں نہ ہوتیں، تو روس و انگلستان کی حکومتیں مسلمانوں کو زندہ درگور کر دیتیں۔

ایران کی کمزوری و عیش پرستی نے مشہد مقدس پر وہ قیامت ڈھائی کہ آج تک اس کی دیواریں اس پر نوحہ کررہی ہیں لیکن ترک اگرچہ کمزور تھے، مصیبتوں میں مبتلا تھے، دشمن جونک بنے ان کا خون چوس رہے تھے، تاہم وہ ہمیشہ میدان جنگ کے لیے تیار رہے، اور ساری دنیا میں ایک وہی تھے جو اسلام کی خدمت و حفاظت کے لیے سینہ سپر و شمشیر بکف تھے۔ جسد اسلامی کو ان ہی نے نرغۂ اعداء سے بچایا، اور ان ہی کی تلواروں کی چھاؤں نے جزیرۂ عرب کو مسلمانوں کے لیے پُرامن مسکن بنائے رکھا۔ کیا یہ واقعات ایسے نہیں ہیں کہ ہم ترکوں سے محبت کریں؟ ترکوں سے ہماری محبت اخوتِ اسلامی سے زیادہ ان کی ان خدمتوں اور ان جاں سپاریوں کی وجہ سے ہے۔ سات سو برس سے وہی اسلام کے خادم ہیں، وہی خالد و ابو عبیدہ کے فرزند ہیں، وہی مردانہ وار اپنی جانیں قربان کررہے ہیں، ان ہی نے نصرانی یورشوں کا تنہا مقابلہ کیا ہے، اور یورپ و ایشیا میں ان ہی کی تلوار نے اسلام کو عیسائیت کے پنجۂ استبداد میں دم توڑنے سے بچایا ہے۔

ظالم کون ہے؟ — ترک یا یونانی؟

یورپ کے رہنمان سیاسی ترکوں کے جتنے مظالم بیان کرتے ہیں وہ سب جھوٹ ہیں۔ ہم لوگوں کو اس فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ یہ دراصل ایک سازش ہے جس کا مقصد ترکوں کے دوستوں کو چپ کرنا، اور عیسائیوں کو ان کی مخالفت

پر ابھارنا ہے۔ اس کے مقابلے میں یونانیوں کے مظالم بالکل یقینی اور واقعی ہیں۔ وزیر اعظم انگلستان ہمیں بتائیں کہ موریا کے تین لاکھ مسلمان کہاں گئے؟ تھسلی کے دو لاکھ مسلمانوں میں اب کتنے زندہ ہیں؟ کریٹ کی ستر ہزار مسلمان آبادی کہاں چلی گئی؟ اور مقدونیہ کے دس لاکھ مسلمان کن قبرستانوں میں دفن ہو گئے؟ — موریا، تھسلی اور اپیائرس پانچ سو برس ترکوں کے قبضے میں رہے ہیں، ان کے چپے چپے پر اسلام کے آثار قائم تھے، اور ان کی آبادیوں میں غیر مذاہب کے افراد بھی اسی طرح بستے تھے جس طرح خود مسلمان لیکن ابھی ان صوبوں کو مسلمانوں کے قبضے سے نکلے ایک صدی بھی پوری نہیں ہوئی کہ اب وہاں نہ مسلمان باقی ہیں، نہ ان کی یادگاریں۔ کریٹ تین سو برس مسلمانوں کا مسکن رہا، اور ۱۸۹۸ء میں یونان کے حوالے کیا گیا، مگر اب اس کی ستر ہزار مسلمان آبادی میں سے صرف پندرہ ہزار باقی ہے۔ مقدونیہ سات سو برس سے مسلمانوں کا وطن تھا۔ اور وہاں مسلمانوں کی ساٹھ فیصدی آبادی تھی لیکن اسلامی حکومت سے نکلنے کے بعد آٹھ برس کے اندر ہی اس کے دس لاکھ مسلمان پانچ لاکھ سے بھی کم رہ گئے — یونان کے مظالم کے یہ زندہ ثبوت ہیں، جنہیں تعصب کے کسی پردے میں نہیں چھپایا جا سکتا، خواہ یونان چھپائے، یا اس کے مشفق مکرم مسٹر لائڈ جارج:

جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا!

ممالکِ اسلامیہ کا مستقبل اور برطانیہ عظمیٰ

اس ہفتے ممالکِ اسلامیہ سے جس قسم کی وحشت ناک خبریں آئی ہیں، انہوں نے ان کے مستقبل کو پہلے سے بہت زیادہ نازک بنا دیا ہے۔ اگرچہ اسلامبول پر انگریزی قبضے نے ہمارے دلوں کو رنج و اندوہ سے بھر دیا تھا لیکن اناطولیہ میں نائب خلیفہ کے قیام، قومی جدوجہد، تھریس میں جعفر طیار کی حرکت، اور بلغاریا کی متحدہ قوت فاجعیہ کا اثر، روسی ترکستان میں مسلمان آبادیوں کا ہیجان، اور شام میں موتمر سوری کا جمہوری حکومت کو تاسیس کرنا، یہ سب ایسی باتیں تھیں جنہوں نے ہمارے سامنے امید کی ایک جھلک پیدا کر دی تھی لیکن اس ہفتے نے جو خبریں سنائی ہیں ان سے امیدوں کی جھلک پھر ناامیدیوں کی تاریکی بن جاتی ہے ـــ آدرنہ پر یونان کا قبضہ، جعفر طیار کی گرفتاری، درۂ دانیال پر دشمنانِ اسلام کا تسلط، سلیشیا میں ترکوں کی شکست، دمشق پر فرانس کا استیلاء، اور شام سے امیر فیصل کا فرار، ایسی خبریں ہیں جن سے ایک مسلمان یکسر پریشان و سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ آدرنہ کے مفتی صاحب فرشتہ بن کر بھی یہ یقین دلائیں کہ جامع سلیم اب تک مسجد ہی ہے، تو ہمیں یقین نہیں آئے گا، بلکہ ہم یہی سمجھیں گے کہ نہ سلانیک میں کسی مسجد کا نشان باقی ہے، نہ سمرنا میں کسی مسلمان کا گھر سلامت ہے ـــ رپوٹر ہمیں اطمینان دلانا چاہتا ہے کہ شام میں فرانس کے قبضے سے کامل صبر و سکون طاری ہے، لیکن ہم کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں جب کہ اسی کے

ساتھ ہمارے کانوں میں شامیوں کی یہ آوازیں بھی آرہی ہیں: "یا آزادی یا موت"۔
رپورٹر کہتا ہے کہ شام اور عراق میں پُرامن فضا پیدا ہوگئی ہے، کوئی شور و ہنگامہ نہیں، نئی حکومتیں دلجوئی کر رہی ہیں، مگر ہم ان باتوں کو کیونکر مانیں جب کہ موریا کا یونانی قتل عام ہمیں یاد ہے، جب کہ کریٹ کے مقتول مسلمانوں کی مصیبت ہمیں یاد ہے، جب کہ سمرنا پر یونانی مظالم ہمیں یاد ہیں، اور جب کہ ہم حریت و جمہوریت کے علمبردار فرانس کے ان مظالم کو بھی نہیں بھولے ہیں جو اس نے تونس اور الجزائر میں کیے تھے — پھر جب یہ واقعات ہمیں یاد ہیں، اور ان کی یاد میں اب تک ہمارا دل خون ہے، تو کیا ہمیں یقین دلانے والے یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہم مطلق اب شام کے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے؟ —

لیکن، عزیزو! جانتے ہو کہ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ — یہ نتیجہ ہے صرف برطانیہ کی دشمنِ اسلام سیاست، اور اس کے دیرینہ طرزِ عمل کا — آج سے نہیں، کامل ایک صدی سے مسلمانوں اور ان کے ملکوں کے ساتھ اس کا رویہ ایسا رہا ہے، جس کو دیکھتے ہوئے اب ہمارے دل میں اس کی نسبت کسی قسم کی خوش فہمی باقی نہیں رہ سکتی، اور اگر رہ سکتی ہے تو صرف اس صورت میں جب ہم اللہ اور اس کے رسول سے باغی ہو جائیں — ہاں! وہ برطانیہ ہی تھا جس نے یونان کی ہمت افزائی کر کے اسے کریٹ اور موریا میں مسلمانوں کے قتلِ عام پر اکسایا، وہ برطانیہ ہی تھا جس نے بلغاریا سے مل کر اسے مشرقی رومیلیا کو دبا لینے پر جری کیا۔

وہ برطانیہ ہی تھا جس نے مصر و قبرص پر قبضہ کر کے فرانس کو تونس اور الجزائر لے لینے پر مجبور کیا، وہ برطانیہ ہی تھا جس نے اٹلی کو اپنی پالیسی سے طرابلس کے احتلال پر دلیر کیا، وہ برطانیہ ہی تھا جس نے روس سے سازش کر کے ایران کی حریت و قومیت کو روندا، اور پھر آج بھی برطانیہ اور صرف برطانیہ ہی ہے جس نے اسلام کی پامالی پر کمر باندھ رکھی ہے، جو یونان کا حامی ہے، رومانیا کا دوست ہے جو فرانس کو ورغلاتا ہے، اور اٹلی کی پیٹھ ٹھونکتا ہے۔ ایک طرف اسے دولت عثمانیہ پر یونان کو پورے امتیازات دیئے جانے اور سیلیشیا کو چک میں اس کی مطلق العنانی پر اصرار ہے، اور دوسری طرف قسطنطنیہ پر قابض ہے۔ عرب لینڈ کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رہا ہے، عراق، موصل اور فلسطین پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، اور فرانس کو شام میں فوجی کارروائیاں کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

امیر فیصل اور اس کے غدار باپ سے ہم کتنے ہی بدظن ہوں، لیکن ان کا مسئلہ ایک داخلی مسئلہ ہے، اور بہر صورت ہم ان پر بھی غیروں کی دست درازی کو پسند نہیں کر سکتے۔ شام میں فرانس کی پیش قدمی، دمشق کا سقوط، حلب و حماۃ ریلوے پر فرانسیسی تسلط ہمارے لیے حد درجہ تکلیف دہ ہے — مگر ہمیں فرانس سے شکایت نہیں، اس کی ذمہ دار ہماری حکومت برطانیہ ہے — یورپ میں دول کی قوتوں کے توازن، اور فتح میں برابر کے حصے کا سوال، بہت اہم

سوال ہے۔ برطانیہ نے عثمانی ممالک میں عراق و فلسطین پر قبضہ کر لیا ہے۔ موصل کے معاملے میں فرانس کو دھوکہ دے کر دولت کی اس کنجی کو بھی لے لیا ہے۔ ایران پر بھی اپنی حمایت قائم کر دی ہے۔ اور قسطنطنیہ بھی ایک حد تک اسی کے قبضے میں ہے۔ ان حالات میں فرانس شام کے قبضے پر مجبور ہے۔

پس جب صورت حال یہ ہے، جب مطلع گرد و غبار سے پاک ہے جب ممالک اسلامیہ کے مستقبل کا مسئلہ صاف ہے، اور یہ حقیقت آفتاب کی طرح روشن ہے کہ برطانیہ ہی ان تمام باتوں کا ذمے دار ہے، تو اب زیادہ عرصے تک اسے مہلت دینا، اپنے ہاتھ سے اسلام کے مستقبل کو تاریک کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ لہٰذا اب یہ ہماری عزت ملی ہی کا سوال نہیں بلکہ ہمارے پاک مذہب کی موت و حیات کا سوال ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ اس حکومت سے کامل علیحدگی اختیار کریں۔ "آسمانی حکومت" کے وفادار ہو کر زمین کی تمام حکومتوں سے باغی ہو جائیں۔

برطانیہ اور ترکی

فرانس کی طرح اٹلی بھی ترکی سے ایک علیحدہ معاہدہ کرنا چاہتی ہے۔ ایک اطالوی مدبر عمل نے ایک اتحاد کوچک کا خواب دیکھنا شروع کیا ہے۔ اسے ان دونوں سے مدد کی توقع نہیں رہی۔

یہ اتحاد کوچک کیا ہے؟ — وہ ریاستیں ہیں جو آسٹریا اور روس کے تباہ ہونے کے بعد قائم ہوئیں — مگر کیا یہ ریاستیں مشرق قریب کے مسائل طے کرنے میں برطانیہ کی مدد کر سکتی ہیں؟ — اس کا جواب لارڈ کرزن کا حریص دل نہیں دے سکتا۔ ان کی منطق ہمیشہ غلط، اور ان کے دلائل سراسر بے بنیاد ہوتے ہیں۔

ان ریاستوں میں بلغاریہ بھی شامل ہے۔ بلغاریہ سے یہ امید کرنا کہ وہ مشرقی تھریس یونان کو دلانے کی کوشش کرے گا، صریح حماقت ہے۔

رومانیا، جو اس اتحاد کا دوسرا رکن ہے، اس مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ خصوصاً بحر اسود میں ایک اور رقیب کی مداخلت اس کو ہرگز گوارا نہ ہوگی۔

اسی طرح یوگوسلاویا (سربیا) بھی یونان کی حمایت میں اپنا کوئی فائدہ نہیں دیکھتا۔ اسے کسی طرف اپنے حدود کی وسعت کا امکان نظر نہیں آتا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ یونان سے رقیبانہ مخالفت بھی رکھتا ہے۔

اتحاد کوچک کے یہی تین رکن ایسے ہیں جنہیں مشرق قریب کے مسئلے سے کچھ دلچسپی ہو سکتی تھی لیکن ان حالات میں انہیں مطلق دلچسپی نہیں ہے اور وہ کسی طرح اپنے تئیں برطانیہ کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے۔

پھر سوال یہ ہے کہ برطانیہ کو آخر اتنی بے قراری کیوں ہے؟ — اور وہ فرانس و اٹلی سے جدا ہونے کے بعد ترکوں کا گلا گھونٹنے کو دوسروں کا ساتھ کیوں تلاش کر رہی ہے؟ — ترکوں کی سیاست نے برطانی سیاست کو ایسی خاش

شکست دی ہے کہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ایک مفتوح و مغلوب، بے یار و مددگار، دست و پا بریدہ قوم کا برطانیہ جیسی زبردست قوت کو شکست دینا جو دولت، قوت، سیاسی چال بازی اور بری و بحری طاقت میں دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے، ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ لارڈ کرزن اور مسٹر لائڈ جارج دنیا کے ہر دروازے کو کھٹکھٹا لیں، لیکن اب انہیں یونان کی حمایت اور ترکوں سے لڑنے کے لیے کہیں کوئی "اتحادی" نہ ملے گا۔ اور اگر بفرضِ محال کوئی آنکھوں کا اندھا مل گیا، تو وہ زیادہ عرصے تک برطانیہ سے اتحاد نہ رکھ سکے گا، اور جس طرح موجودہ اتحاد ٹوٹ گیا اسی طرح وہ اتحاد بھی ٹوٹ جائے گا۔

ماتحت اقوام کے ساتھ ترکوں کا حسنِ سلوک

یونانیوں کے قتلِ عام پر برطانی پارلیمنٹ میں ایک شور مچا ہوا ہے۔ گو اس شور کا نام حق پرستی اور بنی نوعِ انسان کی ہمدردی بیان کیا جاتا ہے، مگر یہ غلط ہے۔ یہ شور بالکل مذہبی تعصب اور سیاسی دسیسہ کاری پر مبنی ہے۔ ورنہ اگر یہ حقیقتہً بنی نوعِ انسان کی ہمدردی اور ظلم و تعدی کے لیے ہوتا، تو یہ شور اس وقت بھی مچنا چاہیے تھا جب یونانیوں کے ہاتھوں ترک تباہ و برباد ہو رہے تھے، جب تھریس اور سمرنا کی آبادیوں میں ان پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، اور جب ان کے بچے ان کے سامنے قتل، اور ان کی عورتیں ان کی آنکھوں کے آگے بے حرمت

کی جا رہی تھیں۔ لیکن اس وقت سب چین سے بیٹھے رہے، سب پر موت نما سکوت چھایا رہا۔

اس بے معنی شور کے الزامی جواب بہت ہو سکتے ہیں، لیکن اس صحبت میں ہم تحقیقی جواب دیں گے، اور واقعات کے اٹل دلائل سے یہ ثابت کریں گے کہ ترکی قانون عیسائیوں کے ساتھ اتنی زیادہ رعایت کرتا ہے جتنی عظیم الشان دولت برطانیہ کے ماتحت مسلمانوں کے ساتھ نہیں کی جاتی۔ یہ ثابت ہونے کے بعد یہ بحث صاف ہو جائے گی کہ عیسائیوں پر ترکی مظالم کے افسانے محض بے بنیاد ہیں، اور یہ صرف یورپ کو ترکوں کے خلاف ابھارنے کے لیے گھڑے گئے ہیں۔

۱۴۱۹ء میں جب ہیناڈی شاہ ہنگری نے ترکوں کے خلاف عیسائی قوموں اور سلطنتوں کو متحد کرنا چاہا تو برانکووچ شاہ سرویا نے اس سے سوال کیا کہ اگر تم اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے ساتھ کیا کرو گے؟ اس نے کہا کہ "میں تمام سرویوں کو رومن کیتھولک عقائد اختیار کرنے پر مجبور کروں گا۔"

برانکووچ نے بالکل یہی سوال سلطان محمد (اول) سے کیا۔ سلطان نے جواب دیا:

"اگر میں سرویا میں کوئی مسجد بناؤں گا تو اس کے ساتھ ایک گرجا بھی تعمیر کروں گا اور اس بات کا اعلان کر دوں گا کہ میری حکومت میں ہر شخص کو اس کی آزادی ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے۔"

سلطان محمد ثانی نے جب قسطنطنیہ فتح کیا تو اس نے سب سے پہلے یونانیوں کے نام یہ فرمان جاری کیا کہ

"تم جس طرح قیاصرہ کے زمانے میں آزاد تھے اسی طرح اب بھی آزاد ہو گے تمہارے مذہب میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی"

اس نے نہایت فراخ حوصلگی سے انہیں اپنا مذہبی سردار بھی منتخب کرنے کی اجازت دی۔ انہوں نے جارج اسکولاریوس کو اپنا سردار منتخب کیا۔ جارج جب پہلی دفعہ دربار سلطانی میں گیا تو سلطان نے تخت سے اتر کر دس قدم آگے بڑھ کے اس کا استقبال کیا، اور تخت پر اپنے برابر جگہ دی؛ حالانکہ سلاطین کسی کے استقبال کو کھڑے نہیں ہوتے۔

۱۸ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطان عبدالحمید خاں کی طرف سے عیسائیوں کے لیے یہ فرمان جاری کیا گیا کہ

"فرمان گل خانہ میں ہم نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لیے جو وعدے کیے تھے، ان کی پابندی کی جائے، اور ہمارے اسلاف نے ان کو جو رعایات عطا کی تھیں، ان کو ایک نظام و قانون کے ماتحت منظم کر دیا جائے"

فرمان گل خانہ کا خلاصہ یہ ہے:۔

تمام غیر مسلم قومیں اپنے اندرونی انتظامات اپنے بطرالقیوں کے ذریعہ کرنے میں آزاد ہیں، اور ان کی سول کونسل کو پورا اختیار ہے کہ اپنے

معاملات میں جو چاہے کرے۔

کیا یورپ کے یہ بلند بانگ سیاسی عمائد و اکابر اپنی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش کر سکتے ہیں، جس میں انہوں نے اپنی غیر عیسائی محکوم اقوام کے ساتھ ایسا شریفانہ برتاؤ کیا ہو؟

یہ واقعات محمد فرید بک کی تاریخ دولت عثمانیہ سے ماخوذ تھے۔ کہا جائیگا کہ یہ یک طرفہ داستان ہے لیکن اب جادو سر پہ چڑھ کے بولتا ہے۔ مسٹر اوبی سنی جدید ٹرکی کا مصنف لکھتا ہے:۔

"ترک نہ مذہبی مظالم سے واقف ہیں، نہ ان کے ہاں عہد متوسطی کی خونخوار پاپائیت کا کوئی نمونہ ہے۔ ان کا ملک آج سے نہیں صدیوں سے بے گناہ مجرموں کے لیے پرامن مسکن ہے۔ تاریخ کو دیکھو! پندرہویں صدی میں ہزاروں یہودی اسپین و پرتگال سے جلاوطن کیے گئے، لیکن انہیں ترکوں کی سلطنت کے سوا کہیں جگہ نہ ملی۔ اس وقت کے نکلے ہوئے وہ یہودی آج تک دولت عثمانیہ کے ماتحت امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں، اور اس بیسویں صدی کے روشن زمانے میں، ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان میں ایسٹر کے دن کوئی یہودی اپنے گھر کی کھڑکی سے سر نکالنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عیسائی ممالک سے مقابلہ کر کے دیکھو! خود عیسائی مذہب کی ایک شاخ کیتھولک کو پیرس

سے زیادہ قسطنطنیہ میں آزادی حاصل ہے۔ ترکی کا کوئی قانون مذہبی رسوم برسرعام ادا کرنے سے نہیں روکتا، اور نہ کسی مذہب کو اس کے عبادت خانے میں قید کرتا ہے۔"

"ٹرکی اور تنظیمات" کا مصنف، ٹرکی میں مذہبی آزادی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اس کے مقابلے میں دیکھو کہ تہذیب جدید کے مرکز میں مذہبی آزادی کا کیا حال ہے؟ — اسپین میں اب تک کیتھولک فرقے کو اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے سے روکا جاتا ہے۔ ابھی کچھ زمانہ گزرا کہ ٹسکی اور نیپلز میں حکومت کے ذمہ دار افسروں کے سامنے لوگوں کو زبردستی پروٹسٹنٹ بنایا جاتا تھا۔ حال کا واقعہ ہے کہ سوڈن میں ایک لوتھرین کو کیتھولک ہو جانے پر جلاوطنی اور جائداد کی ضبطی کی سزا دی گئی۔ یونانی قانون تبدیل مذہب کو روکتا ہے۔ پرلینڈ میں گریک چرچ کے خلاف جیسے سخت احکام جاری ہوتے تھے، وہ سب کو یاد ہونگے۔ خود انگلستان میں پوپ کی سرداری کا اعتراف اور پارلیمنٹ میں یہودیوں کا انتخاب جاری ہوتے کتنا عرصہ گزرا۔"

ایک کیتھولک عالم، مسٹر جوزف ڈیٹائس، لکھتا ہے:۔

"ترکی سپاہی ہمارے مذہبی جلوسوں کے ساتھ اعزازی دستے کی

حیثیت سے نکلتے ہیں۔ ہمارے پادریوں کی عزت کرتے ہیں اور اصطباغ کی رسم میں اپنے ہتھیار پیش کرتے ہیں۔ یہ ہیں ان لوگوں کے حسن اخلاق کے مظاہر جو دنیا میں وحشی اور متعصب مشہور ہیں۔"

پرنس ٹاؤن امریکہ کی یونیورسٹی کے معلم قانون بین الاقوام (مسٹر فلپ مارشل براؤن) لکھتے ہیں:۔

"ترکی قانون غیر مسلموں کو اپنے بطریق کے ماتحت، اپنے اندرونی انتظام خود کرنے کے لیے تمام امکانی آزادیاں اور قوتیں عطا کرتا ہے بطریق عثمانی افسروں کی جگہ اپنی قوم کے افسر، یا دوسرے الفاظ میں بااختیار دنیا ہوتے ہیں۔ یہ بات یقیناً قابل قدر ہے کہ ترک باوجود فاتح ہونے کے نہایت فیاضی اور فراخ دلی سے مفتوحوں کو ان کے حقوق عطا کرتے ہیں، اور ان کو اپنے رسم و رواج اور اپنے مذہبی قانون کے مطابق خود اپنا اندرونی انتظام کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔"

ترکوں کے جانی دشمن، ایم پالی ٹس نے، جو ۱۹۱۹ء میں یونان کا وزیر خارجہ اور صلح کانفرنس میں یونان کا نمائندہ تھا، ۱۸۹۷ء کے ریویو پالٹیک انٹرنیشنل میں لکھا تھا:۔

"کسی سلطنت کے ماتحت یونانیوں کے مفاد و مصالح اس قدر محفوظ نہیں رہ سکتے جس قدر ترکی حکومت میں ہیں۔"

۱۸۵۶ء کے عہد نامہ پیرس کے مباد یات طے کرنے کے لیے جو کمیشن قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا، اس نے دوران مباحثہ یہ بات تسلیم کی کہ:۔

"ترکی میں رعایا کو جو حقوق و مراعات حاصل ہیں، وہ اس قدر غیر معمولی ہیں کہ کوئی خود مختار حکومت بمشکل ان کو گوارا کر سکتی ہے"

۱۷۷۲ء میں پولینڈ کی پہلی تقسیم کے بعد پولوں کی ایک جماعت نے روس کی سیادت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور بیس ہزار کی تعداد میں ہجرت کر کے ترکی میں آ گئے۔ سلطان نے بڑی خوشی سے ان کو اپنے ہاں جگہ دی۔ ڈینیوب کے کنارے انہیں وسیع زمینیں عطا کیں، اور ان کو پوری اجازت دے دی کہ اپنے مذہبی قانون کے مطابق اپنا اندرونی انتظام خود کریں۔

یہ تاریخی شواہد، یہ بے لاگ اعترافات، ان لوگوں کی زبانی ہیں جو اپنے مذہب غیر ہیں، جو مسلمان نہیں عیسائی ہیں، جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی پھر کیا یہ کہنا غلط ہے کہ یہ حشر انگیز مظالم کی فسانہ طرازی برطانیہ کی عیاری ہے جس کا مقصد یورپ کو ترکوں کے خلاف مشتعل کرنا ہے۔

پیرس کانفرنس کی تجاویز اور اس کے بنیادی اصول

گذشتہ دو اشاعتوں میں پیرس کانفرنس کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا تھا، وہ پوٹر

کی اطلاعات پر مبنی تھا۔ اب حکومت ہند نے بھی ان تجاویز کو شائع کیا ہے، جس میں کچھ باتیں ریوٹر سے کم اور کچھ زیادہ ہیں۔ لیکن جس چیز نے ان کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے وہ حکومت کی تشریح و توضیح ہے، جس میں اس نے بڑی کوشش سے ان کو منصفانہ تجاویز ثابت کرنا چاہا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمارے سامنے وہ بنیادی اصول آتے ہیں جن کے متعلق کمیونک میں لکھا ہے کہ وہ کانفرنس کے مباحث کا مبنیٰ و اساس تھے۔ یہ اصول گنتی میں آٹھ ہیں، مگر قابلِ ذکر صرف چار ہیں، اور وہی اس صحبت کا موضوعِ گفتگو ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ جنگ اس طرح ختم کی جائے کہ فریقین میں سے کسی کو فتح و شکست محسوس نہ ہو۔ اصول واقعی نہایت عمدہ ہے لیکن دریافت طلب یہ ہے کہ یونان کی فتح کی صورت میں بھی یہی اصول بنیادِ صلح ہوگا؟ — دولِ یورپ کی مشرقی سیاسیات کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ اصول صرف ان جنگوں کے لیے ہے جن میں ترک فتحیاب ہوتے ہوں۔ مگر جب انہیں شکست ہوتی ہے تو فاتح کو فتح کا ثمرہ دلوایا جانا ضروری ہوتا ہے، اور کوئی قانون و اخلاق انہیں اس سے محروم نہیں رکھ سکتا — گذشتہ جنگوں میں ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ ۱۸۹۷ء کی جنگ روم و یونان، جس کا انجام ایتھنز کے سقوط تک پہنچ گیا تھا، دول نے بیچ میں پڑ کر اسی فتح و شکست محسوس نہ ہونے دینے والے اصول پر صلح کرائی، اور نہ صرف ترکوں کو زبردستی ان کے

جائز ثمراتِ فتح سے محروم رکھا، بلکہ اسے کریٹ پر ایتپسمہ دلوایا، اور ترکی کو مجبور کیا کہ وہ یونانیوں کے امتیازی حقوق برقرار رکھے — ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان میں جب بلغاریوں کو پے در پے کامیابیاں ہوئیں، اور وہ بڑھتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچ گئے، تو یہ زریں اصول رخصت ہو گیا، اور لندن کانفرنس میں صاف کہہ دیا گیا کہ فاتح کو فتح کے ثمرات سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اب چونکہ ترکی کو فتح حاصل ہوئی ہے اس لیے اس روایت کو تازہ کیا جا رہا ہے: دونوں میں سے کسی کو فتح و شکست محسوس نہ ہو، ترک سمرنا لے لیں اور یونانی ایڈریانوپل میں رہیں۔

دوسرا اصول مسلمانوں کے ساتھ خیراندیشانہ برتاؤ، اور خلافتِ عثمانیہ کی برقراری ہے۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ اتحادیوں کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہیں لیکن یہ اصول شرمندۂ عمل نہیں ہے — مسلمانوں میں ابھی اتنی قوت پیدا نہیں ہوئی کہ یورپ ان کے آگے جھکے، اس لیے صرف لفظی اعتراف کر لیا گیا ہے، ورنہ کانفرنس کی کارروائیوں میں کوئی تجویز ایسی نہیں ہے جسے اس اصول کی تفسیر و تعبیر کہا جا سکے۔ جزیرۃ العرب کا مسئلہ، جو اس اصول کا اولین تابع ہے، اس طرح فراموش کر دیا گیا ہے جیسے اس کا وجود ہی نہیں۔

تیسرا اصول اتحادیوں کی احسان مندی کا جذبہ ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ یونانیوں کو ان کی قربانیوں کا معاوضہ دیا جائے جو کم از کم ایسا ہونا چاہیے جس سے ان کی قومی و اقتصادی ترقی کو مدد ملے۔ یہ ایک نہایت مضحکہ خیز دعویٰ ہے۔ جو اس قربانی والی

ہے۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ یونانیوں نے قربانیاں کس لیے کیں؟ — اپنے لیے یا ترکوں کے لیے؟ — لیکن یہ معاوضہ ان قربانیوں کا ہے جو یونانیوں نے اتحادیوں کے لیے کیں! اگر وہ کیا تھیں؟ — اتحادیوں کے حکم کی تعمیل میں تھریس اور سمرنا پر فوجیں بھیجنا، وہاں کی آبادی کو تباہ و برباد کرنا، عورتوں، بچوں، جوانوں، بڈھوں کا قتل عام، اور اس کے اخراجات تھے — یہ اس سوال کا ایک اور اٹل جواب ہے، کیونکہ آغاز جنگ میں یونانی کابینہ کی پالیسی پرو جرمن تھی قسطنطین اتحادیوں کا ساتھ دینے پر تیار نہ تھا، اور اتحادیوں نے جب سالونیکا پر قبضہ کر کے اسے تخت سے اتار دیا، اس وقت بھی یونانی گورنمنٹ نے اتحادیوں کی مدد نہ کی — پھر کیا یہ غلط ہے کہ یہ معاوضہ مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی بستیوں کو جلانے کا معاوضہ ہے

شاعر نے تعجب سے کہا تھا ؎

یہ عجب رسم دیکھی بروز عید قرباں
وہی ذبح کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ہم سیاسی فیصلوں میں اس کو دیکھتے ہیں!

اس اصول کا دوسرا حصہ پہلے سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ اتحادی یونان کو ایسا معاوضہ دینا چاہتے ہیں جو اس کی قومی و اقتصادی ترقی میں ممد و معاون ہو، اور یہ معاوضہ تھریس اور سمرنا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ قومی و اقتصادی ترقی کس شئے کو قرار دیں؟ — یہی الفاظ جب یونان کے لیے بولے جاتے ہیں تو ان کے معنی یہ ہوتے ہیں

کہ یونان کو علاوہ جزائر ایجین، مقدونیہ و کریٹ کے اڈریانوپل اور پورا مشرقی تھریس بھی ملنا چاہیے لیکن جب ترکی کے لیے بولے جاتے ہیں تو ان کے یہ معنی ہو جاتے ہیں کہ ان کو ترقیوں سے محروم ہو جانا چاہیے، خلیج کا گوشہ ان کے لیے سب سے بڑی اقتصادی فلاح ہے، عراق کی اسے ضرورت نہیں، فلسطین کے دوسرے مستحق ہیں، شام اس کے پاس نہیں رہنا چاہیے، حجاز پر اس کی حکومت ناروا ہے۔ اور مشرقی تھریس اس کو کسی طرح نہیں مل سکتا۔ اناطولیہ اور قسطنطنیہ اس کے لیے بہت ہے۔ سمرنا بین الاقوامی ہوگا۔ ایشیائے کوچک کے لیے اس اقتصادی دروازے کے کھلے رہنے کی ضرورت نہیں، دردانیال اور آبنائے ترکی اقتدار سے آزاد رہنی چاہئیں، ان راستوں سے اس کا اپنے قلب کی حفاظت کرنا مفاد عام کے منافی ہے!

چوتھا اصول یہ ہے کہ آئندہ کے لیے ترکی سے جنگ کا دروازہ بند ہو جائے اس اصول کا ہم بہت پُر جوش خیر مقدم کرتے، اگر اس سے غلامی کی بو نہ آتی! اس اصول کے معنی یہ ہیں کہ ترکی کی تمام قوتوں کو سلب کر کے اتنا کمزور و بے بس کر دیا جائے کہ وہ آئندہ یورپ کی مستعمرانہ کارروائیوں کی مطلق مزاحمت نہ کر سکے۔

قارئین کرام غور کریں کہ جب اصول اس قدر پُر فریب اور بے بس ٹھہرے ہیں تو صلح کا ہونا کس قدر ناممکن ہے۔

اب ایک نظر ان تجاویز اور دفاعی دلائل پر ڈالنی چاہیے جو حکومت کے

کمیونزم ، میں درج ہیں:

"قلیل التعداد اقوام کی حفاظت کے معاملے میں لکھا ہے "ترکی اور یونان کے ماتحت رہنے والے پورپ میں جتنی قلیل التعداد اقوام بستی ہیں ، بلا امتیاز عیسائی و مسلم ان کی حفاظت کی جائے "۔۔ اس سے پہلے ہم نے یورپ کی زبان سے کبھی مسلمانوں کی حفاظت کے بول نہیں سنے ۔ ان کی زبان پر ہمیشہ ترکی کے عیسائیوں کی دردناک حالت اور مظلومی کا مرثیہ رہا ہے ۔ لیکن کیا ان کا یہ احساس واقعی اور حقیقی ہے ؟ ۔۔۔ کیا یہ سچائی سے مسلمان اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرینگے ؟ ۔ یہ وہی ہیں جن کی نگاہوں کے سامنے کریٹ میں یونانی درندوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے ، اور انہوں نے ان کو پناہ دینے کے بجائے ان سے اسلحہ بھی لے لیے ہیں ۔ یہ وہی ہیں جن کے سامنے جنوبی مقدونیہ سے چار لاکھ مسلمان زبردستی جلاوطن کیے گئے ، ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ، اور یہ فرسے سے تماشا دیکھتے رہے ۔ یہ وہی ہیں جو تھسلی کے ۹۰ ہزار مسلمانوں کو خانہ ویران کیا جانا دیکھتے رہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کا نہیں ، بلکہ ان کی جانوں کی حفاظت کا جذبہ بھی ان میں پیدا نہ ہوا ۔ پھر کیا ان سے مسلمان قلیل التعداد جماعتوں کی حفاظت کی توقع کی جاسکتی ہے؟ کہا جائے گا کہ اب زمانہ بدل گیا ۔ ان باتوں کو بھول جاؤ ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب بھی سب کچھ ہو چکا ہے ۔ دو برس کے اندر اندر سمرنا کے چار لاکھ مسلمان برباد ہو گئے ، مشرقی تھریس سے ۴۰ ہزار مسلمانوں کو جلاوطن کر دیا گیا ، بروصہ ، بالی کیسر ، قرہ مرسل

دردانیال، اور اسمارک کے ۱۲۰ ہزار مسلمانوں کو اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، مگر کسی اتحادی قوت کی زبان پر ان کی حفاظت اور ان کے ساتھ انصاف کا لفظ نہ آیا جب اتحادیوں کی شرافت کا یہ حال ہے تو مسلمان اقلیتوں کی حفاظت کی توقع ان سے بے جا حسن ظن ہے مشرقی تھریس کا جو فیصلہ کیا گیا ہے، وہ سب کو معلوم ہو چکا ہے لیکن اس سے زیادہ وہ وجوہ ظالمانہ ہیں جن کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ سرکاری کمیونکس کے الفاظ یہ ہیں :-

"عہدنامہ سیورے کی رو سے مشرقی تھریس کا یونان کے حوالے کر دیا جانا جائز سمجھا جائے یا ناجائز، مگر یہ واقعہ ہے کہ یونانی فوجیں پوری طرح اس پر قابض ہو چکی ہیں، اور یونانی حکومت وہاں اپنا نظام قائم کر چکی ہے اس کے علاوہ اس علاقے میں قابل لحاظ اس کی آبادی اور اس کی اکثریت ہے۔ اور پھر یونان سے اناطولیہ خالی کرا لینے کے بعد، جس پر قبضہ کرنے کی ۱۹۱۹ء میں خود ہم نے اسے دعوت دی تھی، اب اسے مشرقی تھریس کے تخلیہ پر بھی مجبور کرنا، ایسی نازک ذمے داری ہے جسے وزراء اپنے ذمے لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی تھریس یونان کو اس لیے نہیں دیا جاتا کہ اس میں یونانیوں کی اکثریت ہے، بلکہ اس لیے دیا جاتا ہے کہ یونانی اس پر قبضہ کر چکے ہیں، اور اتحادی اس سے سمرنا خالی کرانے کے بعد نہیں کہہ سکتے کہ تھریس خالی کر دو۔

اللہ اکبر! کیسی عظیم الشان نیک نیتی اور وفاداری ہے!! ایک شخص زبردستی دوسرے کے کھیت پر قبضہ کر لیتا ہے، آپ بھی اس کو ناجائز سمجھتے ہیں، لیکن چونکہ وہ قبضہ کر چکا ہے، اس لیے کھیت اس کا ہے۔ ایک چور کسی کا مال چرا لیتا ہے لیکن جج یہ فیصلہ کرتا ہے کہ گو چوری ناجائز ہے، مگر مال پر قبضہ چور کا ہے، اس لیے اب وہ مالک کو نہیں دلایا جا سکتا۔ اگر دنیا میں یہی قانون جاری ہو جائے، تو دنیا پر چوروں اور ڈاکوؤں کی ملکیت قائم ہو جائے گی۔

لیکن سب سے زیادہ بڑی وجہ یہ ہے کہ اتحادیوں نے خود یونان کو تھریس و سمرنا پر قبضہ کرنے کا حکم دیا تھا، اس لیے اب وہ اسے وہاں سے نکلنے کا حکم نہیں دے سکتے!

اس قسم کے نامعقول دلائل پیش کر کے اتحادیوں کو معقولیت کا دعوےٰ ہے پھر اس نامعقولیت کے بھی صغریٰ کبریٰ درست نہیں! — اتحادی وزراء تھریس اور سمرنا کو نہیں لے سکتے — لیکن اس کی وجہ صاف یہ ہے کہ ترک اس وقت کمزور تھے، اس لیے ان کے مقبوضات ان سے چھین لیے گئے، اور یونان چونکہ عیسائی ہے اس لیے یہ واپسی ناممکن ہے یعنی اس تجویز میں وہ دو اصول کام کر رہے ہیں جن میں ایک کا منشا یہ ہے کہ قوت ہی حق ہے، اور دوسرے کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز ہلال کے قبضے سے صلیب کے پاس آجائے وہ واپس نہیں کی جا سکتی۔

مالی نگرانیوں کے متعلق لکھا ہے:۔

وہ ترکی سے اتحادی مفاد و مصالح کی حفاظت، قبل جنگ کے قرضوں کی ادائی، اور اس قدر تاوانِ جنگ کی جسے وہ بآسانی ادا کر سکیں، ضمانت لی جائے گی۔ عہد نامے پر دستخط ہونے کے تین ہفتے بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جس میں برطانیہ، جاپان، فرانس، اٹلی، اور ترکی کے نمائندے اور ان سلطنتوں کے اقتصادی ماہرین ہونگے، جنہیں ترکی میں امتیازات حاصل ہیں۔ یہ کمیشن امتیازات پر نظرثانی کرے گا، اور غیر ملکی باشندوں کو بے جا ٹیکسوں سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کرے گا۔"

یہ عنایت یقیناً مستحقِ شکریہ ہے۔ مگر کیا نگرانی اٹھانے کے بعد جو کچھ کیا جائیگا، بصورتِ نگرانی اس سے کچھ زیادہ کیا جاتا؟ ترکی سے اتحادیوں کے اقتصادی مفاد و مصالح کی حفاظت کے لیے ضمانت، اس قدر وسیع شے ہے جس میں ترکی کا پورا انتظامِ مالیات آسکتا ہے۔ اگر ترک اس ضمانت کے لیے تیار ہو جائیں تو انہیں اپنے تمام اقتصادی مصالح کو قربان کر دینا پڑے گا۔ پس جب تک اس اصطلاح کی پوری تحدید نہ کر دی جائے، اس وقت تک یہ کمیشن ناقابلِ قبول ہے۔

امتیازات کے متعلق بھی اس کمیشن کا تصور بالکل بے معنی ہے۔ امتیازات کا کسی مہذب ملک میں وجود نہیں ہے، اور نہ اس چیز کو کوئی خود دار و خود مختار قوم ایک لمحے کے لیے برداشت کر سکتی ہے۔ ان پر نظرِ ثانی، اور ان کی اصلاحات،

جاہل فریب جمہوریت گری ہے۔ یہ چیز کلیتہً منسوخ ہونی چاہیے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ترکی گزشتہ ۱۲ سال سے ہولناک لڑائیوں میں تباہ ہو چکا ہے، ان امتیازات کا باقی رہنا ایک نحیف و نزار شخص کے جونکیں لگانا ہے۔

مصر کی اندرونی آزادی کا اعلان

اور

ایک لمحۂ عبرت و بصیرت

عین اس زمانے میں جب کہ آئرش قوم کی صریح ناراضی اور علانیہ بغاوت کے باوجود برطانی فوجیں آئرلینڈ میں گولہ باری کر رہی ہیں، اور ٹھیک اس زمانے میں جب کہ وزیر اعظم انگلستان دنیا کی آزادی اور دولت پر ڈاکے ڈال رہے ہیں مصر کو اندرونی آزادی دینے کا فیصلہ حیرت انگیز ہے۔ وہ ملک جسے چالبازیوں سے لیا گیا، جس کے لیے سیاسی بداخلاقی کی قابل شرم سنت جاری کی گئی، اور جس کی خاطر جھوٹ کی مذموم عادت کے جال پھیلائے گئے، اس کو اس طرح آزاد کر دینا یقیناً اس دور کا محیر العقول واقعہ ہے۔

لیکن جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ — مصری تمہاری ہی طرح محکوم، بےبس، اور تم سے زیادہ قلیل التعداد تھے تاہم انہوں نے ۴۰ برس کی مدت میں وہ چیز حاصل کر لی جسے ہم نے ایک صدی سے کھو رکھا ہے، اور جس کے لیے

مسلسل ۳۶ برس سے کوشش کر رہے ہیں، مگر اب تک حاصل نہیں کر سکے اس کی وجہ صرف ان کی قوت ارادی، ان کی ہمت، ان کی غیرت اور سچی وطن پرستی ہے۔ جان و مال کو انھوں نے آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا، غلامی کی زنجیریں کاٹیں، ایوانِ حکومت میں زلزلہ ڈالا، اور برطانیہ کو اپنے مطالبات کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔

فرانس و انگلستان نے سب سے پہلے ۱۸۷۹ء میں مصر کی آزادی کو سلب کرنا چاہا، اور حکومت پر اپنے نگران کار بٹھا دیئے۔ اس پر ۱۸۸۲ء میں احمد عرابی نے تل الکبیر پر چڑھائی کر کے مادرِ وطن پر اپنی جان قربان کی۔ اس کے بعد مصطفیٰ کامل اٹھا، اور مصر کے مصائب کو دول یورپ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے اپنی تحریر و تقریر سے دنیا کو یہ بتا دیا کہ مصر پر انگریزوں کا قبضہ مصری قوم پر صریح ظلم و بے انصافی ہے۔ اس زمانے میں مصر پر لارڈ کرومر کی حکومت تھی، اور وہ مصریوں کو غلام بنانے، ان کی روحِ حریت کو دبانے، اور ان کو لوٹنے کے لیے ایسی شرمناک حرکتیں کر رہا تھا کہ شاید انگلستان کی شاندار تاریخ میں ان سے زیادہ شرمناک حرکتوں کی مثال نہ ملے۔ کرومر نے مطابع کی آزادی کو سلب کیا، حریت پسندوں پر اخلاقی الزامات قائم کر کے سزائیں دیں، خدیو کو اپاہج کر دیا، محبانِ وطن سے بندی خانے بھر دیئے، اور تمام بڑے بڑے عہدے مصریوں سے چھین کر انگریزوں کو دے دیئے۔ ایک طرف کرومر کی یہ مسلق العنان زیادتیاں تھیں، اور دوسری طرف

انگلستان کے داعیانِ حکومت کے یہ اعلان تھے کہ ہم مصر کو ترقی دینا چاہتے ہیں، خدیو کی حکومت کو قائم کرنے، اور آزادی کی اعلیٰ نعمتوں سے متمتع کرنے کے لیے گئے ہیں۔ اور اس مقصد میں بہت جلد کامیاب ہو کر واپس ہو جائیں گے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں مصریوں کی چیخ پکار پر ان کو ایک قانونی کونسل بھی دی گئی جو سرکاری و غیر سرکاری ممبروں سے مرکب تھی۔ خارجی معاملات پر اس کا مطلق اثر نہ تھا، اور نہ انتظامی حکومت اس کے قبضے میں تھی۔ یہ صرف قانون بنانے کی مشین تھی، مگر حکومت مجبور نہ تھی کہ اس کے بنائے ہوئے قانون پر عمل بھی کرے۔

سنہ ۱۴ء میں، اعلانِ جنگ ہوتے ہی یہ کونسل برخاست کر دی گئی، اور باقاعدہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ مصر دولت برطانیہ کا غلام ہے۔ اس اعلان کے ساتھ یہ اور زیادتی کی گئی کہ فوجی حکومت بھی قائم کر دی گئی۔ جب مصریوں نے اس پر بہت غل مچایا تو سنہ ۱۵ء کے اوائل میں ملک معظم کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ فوجی حکومت عارضی ہے۔ اس وقت مصالح جنگ کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد کامل آزادی دے دی جائے گی۔

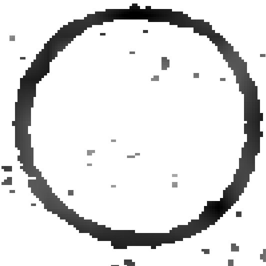
سنہ ۱۸ء میں جب جنگ ختم ہو گئی، اور پریسیڈنٹ ولسن کے حق انتخاب حکومت کے پیغام کے ساتھ دنیا کو اس مصیبت سے کسی قدر نجات ملی، تو مصریوں نے آزادی کا مطالبہ کیا۔ مطابع نے پر زور مضامین لکھے، انجمنوں نے جماعتوں میں نظام اور ڈسپلن قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ وادیٔ نیل آزادی کے پُر جوش نعروں

سے گونجنے لگی لیکن انگلستان نے سنہ ۱۵ء کا وعدہ پورا کرنے کے بجائے آزادی کی خواہش کو سختی سے دبانا شروع کر دیا۔ اخبارات سے ضمانتیں لی گئیں، آزادی خواہ گرفتار کیے گئے، قومی رضاکاروں کو سزائیں دی گئیں۔ یہ حالت دیکھ کر رشدی پاشا نے وزارت خارجہ سے مستقبل مصر پر گفتگو کی درخواست کی، لیکن وزارت خارجہ نے گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر رشدی پاشا (وزیر اعظم) کی حکومت نے استعفا دے دیا۔ رشدی کے بعد وزارت کے لیے کوئی تیار نہ تھا، اس لیے کئی مہینے تک کوئی حکومت نہ رہی۔ اسی زمانے میں سعد زغلول نے (جو سنہ ۱۹۰۶ء میں وزیر تعلیمات تھے) یورپین دول کے سامنے اپنے معاملے کو پیش کرنے کے لیے ایک وفد مرتب کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ مجلس صلح میں جگہ حاصل کرنے، اور اس کے ارکان کو مصر کے معاملات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن اس سفر کے لیے انہیں پاسپورٹ نہیں دیا گیا اور اس ارادے کی پاداش میں ان کو مع تین ہمراہیوں کے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ یہ گرفتاری شریف مصریوں کی حمیت ملی کے لیے تازیانہ بیداری تھی، جس نے انہیں ان کاموں پر آمادہ کر دیا جو خواہ کیسے ہی خلاف قانون ہوں، مگر آزادی، اور انگریزوں کی گرفت سے آزادی صرف انہی کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے۔ مارچ سنہ ۱۹ء میں انہوں نے ایک عام بغاوت کی۔ انگریز افسروں کو قتل کیا، تار کاٹے، ریلوں پر حملے کیے، پولیس نے گولی چلانے سے انکار کیا، نوکروں نے نوکریاں چھوڑ دیں، اور

مظالم سہنے کے بعد بھی اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ ان پر مشین گنوں سے آتش باری کی گئی، ہزاروں گھر جلا دیئے گئے، سینکڑوں کو جیل خانوں میں بند کر کے سخت سخت سزائیں دی گئیں، عورتوں کو بے حرمت کیا گیا، گاؤں کے گاؤں اور بستیوں کی بستیاں تباہ کر دی گئیں، ہزاروں آدمی بے خان و مان، سینکڑوں بچے یتیم اور بیسیوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، انگریز افسروں کو زبردستی سلام کرائے گئے، شریفوں کو سڑکوں پر پیٹ کے بل رینگوایا گیا، لیکن شرافت و آزادی کے عاشق مصریوں نے یہ سب گذر جانے کے بعد بھی انگریزوں کی غلامی پسند نہ کی، غیر ملکی حکومت اور اس کے ایک ایک فرد سے کامل علیحدگی اختیار کر لی، ہڑتالیں کر کے حکومت کی مشین بیکار کر دی، مزدوروں نے کام چھوڑ دیا، کئی مہینے دفتر محرروں سے خالی پڑے رہے، پورٹ سعید مہینوں کوئلہ دینے والے مزدوروں کی آمد و رفت سے چین میں رہا، مدرسوں سے لڑکے اٹھ آئے، کسانوں نے ٹیکس بند کر دیا، اور حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کے مطالبات کے آگے سر جھکائے۔ سب سے پہلے اس نے قیدیوں کو رہا کیا، لیکن مصر ہندوستان نہ تھا کہ قیدیوں کو لے کر خوش ہو جاتا۔ اس کے بعد لارڈ ملنر ایک تحقیقاتی وفد لے کر آئے۔ لیکن مصریوں نے ان کا بھی بائیکاٹ کر دیا۔ وکلا، طلبا، اور مزدوروں نے عام نفرت کا اظہار کر دیا، وزارت مستعفی ہو گئی، علمائے ازہر نے آزادی کا اعلان دے دیا، غرض اس طرح ذلیل و خوار ہو کر، اور فوجوں، توپوں، ہوائی جہازوں کی حفاظت میں رہ کر لارڈ ملنر انگلستان واپس تشریف

گئے۔ اس کے بنا ہی فوراً مصریوں نے بھی ایک وفد مرتب کیا، اور یورپ و امریکہ عوام و حکومت تک اپنی مظلومی اور برطانی مظالم کے واقعات پہنچائے جگہ جگہ ریریں کیں، اخبارات میں مضامین شائع کرائے ظلم و مظلومی کی تصویریں اور فعات کے رسالے شائع کیے، یہاں تک کہ حکومت برطانیہ مجبور ہوگئی۔ لارڈ ملز سعد زغلول کو آزادیٔ مصر پر گفتگو کرنے بلایا، اور آخر وہ معاہدہ تحریر پایا جو آزادی کا اعلان ہے، اور جس میں آئندہ آزادی کے واضح نشان ہیں۔

عزیزانِ ملت! یہ واقعات تمہارے لیے عبرت و بصیرت کا بہت وافر مان ہیں، ان کو پڑھو اور سبق حاصل کرو۔ دیکھو کہ آزادی کے لیے انہوں نے کس رح اپنا جان و مال قربان کیا۔ بیشک ان کے بھی تھے، عزتیں وہ بھی رکھتے تھے اولاد کے بھی تھی، جائدادوں کے وہ بھی مالک تھے، عہدے اور خطابات ان کو بھی تے تھے، عیش و آرام اور شان و شوکت کی زندگی کے وہ بھی عادی تھے، لیکن آزادی لیے ان سب کو تج دیا۔ اور وہ چیز حاصل کر لی جسے تم بھی حاصل کرنا چاہتے ہو، اپنی بزدلی بے غیرتی، کم ہمتی، اور موت نما آرام پسندی سے حاصل نہیں کر سکتے ۔۔ یاد رکھو! زندگی وہی ہے جو آزاد ہو، جس میں کسی کی غلامی و محکومی نہ ہو، اور جو گی ایسی نہ ہو وہ زندگی نہیں موت ہے۔



سو برس پہلے کا ہندوستان

برطانویوں کے تسلط نے ڈیڑھ سو برس کی مدت میں ہمارے ملک کی تمدنی
معاشی اور اخلاقی حالت کو جس حد تک بدل دیا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے
لیے ہمارے سامنے اس عہد کے اجتماعی حالات کا مفصل نقشہ ہونا چاہیے
اس تسلط کی ابتدا ہو رہی تھی۔ ہم آج سے سوا سو برس پہلے کے ہندوستان کے
خدوخال کو دیکھے بغیر مشکل سے اپنے ذہن میں ان نقوش کی حقیقت کا کوئی تص
قائم کر سکتے ہیں جو ایک اجنبی نقاش کے موقلم نے بنائے ہیں۔ اجمالی حیثیت
تو ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ آج ہماری صنعت، تجارت، تہذیب، طرز
کو سمندر پار سے آئے ہوئے تاجروں نے اس حد تک متاثر کیا ہے کہ ہماری اجت
زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا شعبہ بھی ایسا باقی نہیں رہا ہے جس پر خالص د
ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ لیکن تحقیقی طور پر اس اثر کی کیفیت و کمیت کو
اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ جب ہم اپنے
آقاؤں کے غلبہ سے مغلوب نہ ہوئے تھے، اس وقت ہمارا کیا حال تھا،
کیونکر رہتے تھے، ہماری معیشت کس قسم کی تھی، شہری و دیہاتی زندگی میں کی

تھا، عورتیں کیا کرتی تھیں، مردوں کا کیا کام تھا، جماعت کی شیرازہ بندی کس نہج پر تھی، تمدنی زندگی کے مختلف شعبوں میں کونسے معاشی قوانین کارفرما تھے، قومیت کے جملہ عناصر میں کس قسم کا تعلق تھا، اور ملک کی صنعت و تجارت اور عام معاشی حالت کیسی تھی۔

اس موضوع پر دیسی ذرائع سے ہمیں جو مواد ملتا ہے وہ زیادہ تر اس عہد کے حالات پر مشتمل ہے جو ہماری وطنی تہذیب کا درخشاں عہد تھا، اور اس اعتبار سے وہ ہمارے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ ہمیں جس عہد سے خاص طور پر بحث کرنی ہے وہ انگریزی تسلط کا ابتدائی زمانہ ہے اور وہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک زمانہ ہے۔ اول تو اس زمانے کے حالات میں ہمیں کوئی ایسی تاریخ نہیں ملتی جو ملک کے اس نازک دور کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہو۔ لیکن مختلف مقامات اور واقعات کے متعلق جتنی تاریخی تحریریں دستیاب ہوتی ہیں ان سب میں ملک کے ذہنی انحطاط کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ تحقیق و کاوش کی کمی، لفاظی و انشاپردازی کی فراوانی، واقعات میں صحت کا فقدان، روایات میں راوی کی صداقت پر اعتماد، اور خصوصیت کے ساتھ ملک کے معاشی و اجتماعی حالات سے بے اعتنائی! یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہمارے لیے اس مواد کی افادیت کو قریباً بالکل زائل کر دیتی ہیں اور ہمیں ان تصریحات پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو خود "فاتح" قوم کے ـــــ اگر حقیقت میں مکروفریب سے

غلبہ حاصل کرنے والے کو "فاتح" کہا جا سکتا ہے ـــــ سرکاری دستاویزیں اور رسمی تحریریں ملتی ہیں۔ ان تحریروں میں اس موضوع پر اس قدر وافر مواد موجود ہے کہ اس سے زیر بحث عہد کی جزئی تفصیلات تک مرتب کی جا سکتی ہیں۔ مگر ان سب میں مستند ترین دستاویز وہ روداد ہے جو ڈاکٹر فرانسس بکینن (BUCHANAN) نے جنوبی اور شمالی ہندوستان کے معاشی حالات کے متعلق چھوڑی ہے۔ ان صفحات میں اس روداد پر تلخیصی تبصرہ مقصود ہے۔

ڈاکٹر بکینن طبیب کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں کام کرتا تھا۔ اس کو معاشی تحقیقات سے خاص دلچسپی تھی اور قدرتاً ان استخراجی ملکات سے بہرہ ور تھا جو ایک اچھا اعداد نویس (STATISTICION) بنانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ لارڈ ولیزلی کے عہد میں جب اٹھارہویں صدی ختم ہو کر انیسویں صدی شروع ہوئی تو انگریزی قوم کی فطری تاریخ پسندی نے تحریک کی کہ اس صدی کی ابتدا میں ہندوستان کے عام اجتماعی و معاشی حالات کی اعدادی تحقیقات کر کے ایک جامع و مبسوط روداد مرتب کی جانی چاہیے تاکہ اس ملک کی صحیح کیفیت آئینہ ہو جائے، جسے ان کو اپنے "تابع فرمان" کرنا ہے۔ گورنر جنرل نے اس کام کے لیے ڈاکٹر بکینن کو منتخب کیا اور ۲۴ فروری ۱۸۰۰ء کو اسے حکم دیا کہ جنوبی ہندوستان میں سیاحت کر کے اہل ملک کی حالت اور ان کے زراعتی و صنعتی امور کے متعلق مفصل روداد پیش کرے۔ اس حکم کے مطابق

اس نے ۲۳ اپریل کو مدراس سے اپنی سیاحت شروع کی اور کرناٹک، میسور، کوئمبتور، ملیبار، کنارا میں تقریباً سولہ مہینے تک پھرنے کے بعد ۱۸ جولائی ۱۸۰۱ء کو اپنا دورہ ختم کیا۔ ۱۸۰۷ء میں اس کی رپورٹ (JOURNEY THROUGH MYSORE, CANARA AND MALABAR) کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوئی اور کمپنی کے ڈائرکٹر دل نے اس تحقیقات کی افادیت کو محسوس کر کے اس کو شمالی ہندوستان کی سیاحت پر مامور کیا اور اس نے ۱۸۰۷ء میں اپنا کام شروع کر کے ۱۸۱۴ء میں ختم کیا۔ اس دوسری سیاحت کے نتائج اس نے ایک مبسوط روداد کی شکل میں حکومت ہند کے سامنے پیش کیے اور وہ انگلستان بھیج دیئے گئے، مگر یہاں ایک مدت تک یہ روداد ایسٹ انڈیا ہاؤس کی الماری میں پڑی رہی اور کسی نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ بیندرہ برس بعد مشہور مورخ مانٹ گری مارٹن نے کمپنی سے ڈاکٹر بکینن کے مسودے حاصل کر کے ان کو مرتب کیا اور ۱۸۳۸ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ یہ دونوں رپورٹیں انیسویں صدی کے ابتدائی ہندوستان کی سب سے زیادہ مستند، مفصل اور جامع تاریخ شمار کی جاتی ہیں۔ اور ان کے مطالعہ سے ہمیں اس زمانے کے معاشی و اجتماعی حالات کا ایسا علم حاصل ہوتا ہے کہ شاید خود ان لوگوں کو بھی اتنی جامعیت کے ساتھ حاصل نہ ہو گا جو اس زمانے میں زندہ تھے۔

جاگیر مدراس

ڈاکٹر بکینن ۲۳ اپریل کو مدراس سے روانہ ہوا۔ شہر کے نواح میں تمام زمینیں

سرسبز تھیں مگر ان کا ایک بڑا حصہ بارانی تھا۔ پرانے زمانے کے تالاب صرف ایک قلیل حصہ کی آبیاری کر سکتے تھے۔ رستے میں سڑکوں پر جگہ جگہ سرائیں بنی ہوئی تھیں جن میں مسافروں کو بلا کسی خرچ کے آرام کرنے کی اجازت تھی۔ کچھ دور مغرب کی طرف آگے چل کر لق و دق میدان پڑا ہوا تھا، جس میں کہیں کہیں صرف تاڑ کے درخت نظر آتے تھے۔ گونڈوانہ میں پرانے وقتوں کا آب پاشی کا ایک بہت بڑا تالاب تھا، جو دو پہاڑوں کے بیچ میں بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا، طول میں سات آٹھ میل اور عرض میں تقریباً تین میل وسیع تھا۔ جگہ جگہ سے چھوٹی بڑی نہریں نکلی ہوئی تھیں جن سے خشک موسم میں کھیتوں کو پانی دیا جاتا تھا۔ برسات میں تنگ ندی جب چڑھتی تھی تو اس کا سارا پانی اس تالاب میں آجاتا تھا۔ مختلف مقامات پر بیس بیس تیس تیس فٹ چوڑے دہانے بنے ہوئے تھے اور ان میں اس طرح سے ڈھلوان پتھر لگا دیئے گئے تھے کہ جب مقررہ حد سے پانی بڑھنے لگے تو باہر نکل جائے۔ اس تالاب میں اتنی گنجائش تھی کہ وہ خشک سالی میں اٹھارہ مہینے تک ۳۲ گاؤں کو پانی دے سکتا تھا۔

پچھم طرف آگے چل کر سری پرناٹورو کا علاقہ ویران پڑا تھا، زراعت بالکل نہ تھی اور اکثر مقامات پر فصل سے بیجوں کے دام بھی نہیں اٹھ سکتے تھے۔ البتہ سیندھی اور تاڑی کے خودرو درخت کثرت سے تھے جن سے دیسی باشندوں کی مرغوب طبع شراب (سیندھی اور تاڑی) خوب پیدا ہوتی تھی۔ خاص سری پرناٹورو میں بھی ایک قدیم تالاب تھا جس سے تقریباً دو ہزار ایکڑ چاول کی زمین سیراب ہوتی تھی۔ اس سارے علاقہ میں بس

یہی ایک جگہ سرسبز و شاداب تھی، ورنہ کانجی ویرم تک کہیں لہلہاتی کھیتیوں کا پتہ نہ تھا۔

کانجی ویرم میں، جہاں پہلے ہندوؤں کا قدیم دارالحکومت کانجی آباد تھا، دو بڑے تالاب تھے۔ ایک پرانے زمانے کا تھا جس سے دور دور تک چاول کی زمین سیراب ہوتی تھی اور ایک نواب محمد علی کے دیوان نے بنوایا تھا جس میں چاروں طرف تہہ تک پختہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ کنارے پر سنگین سرائیں مسافروں کی آسائش کے لیے تعمیر کی گئی تھیں جن کے ستون سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے تھے۔ کانجی ویرم ایک بڑا قصبہ تھا مگر کچھ زیادہ آباد نہ تھا۔ اکثر عمارتیں خالی پڑی تھیں اور کوئی مکان ایک منزل سے زیادہ اونچا نہ تھا۔ تاہم بستی کی ترتیب بتاتی تھی کہ اس کو سوچے ہوئے نقشے پر بنایا گیا ہے۔ مکانات ایک وضع کے تھے۔ گارے کی چنائی اور اس پر کھپریل۔ سڑکیں چوڑی، صاف اور سیدھی تھیں۔ جگہ جگہ چوراہے بنے ہوئے تھے اور دونوں جانب ناریل کے درخت تھے۔ یہاں کے برہمن زیادہ تر شنکر اچاریہ یا راما نج اچاریہ کے پیرو تھے۔ دونوں پکے ویدانتی تھے مگر ایک روح اول کا پجاری تھا اور دوسرا مجسم خدا کا۔

کانجی ویرم سے روانہ ہو کر ڈاکٹر بکینن ڈامرلہ پہنچا، جو جاگیر مدراس کا آخری گاؤں تھا۔ راستے میں اس کو ویسے ہی ویران جنگل سے گزرنا پڑا جو کانجی ویرم سے پہلے ملا تھا۔ یہاں دریائے پالر کی ایک نہر سے آب پاشی ہوتی تھی اور اس کی بدولت آدرلو سے پامرلہ تک تمام زمینیں چاول کی کاشت سے سرسبز تھیں۔ آدرلو کی زمین اچھی تھی مگر

خشک اناج کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ کھیتوں کے بیچ میں جھاڑیاں اور خودرو درخت تھے۔

مجموعی حیثیت سے مدراس کی جاگیر، جو پچاس سال سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں ہے کسی طرح خوش حال نہیں کہی جا سکتی۔ آئے دن کی لڑائی، مالگزاری کی سختی اور جاگیر کی آمدنی خود جاگیر کی فلاح پر خرچ ہونے کی بجائے کمپنی کی تجارت میں صرف ہونے سے سارا علاقہ اور باشندے تباہ حال ہیں۔ کونڈا لور کے کلکٹر مسٹر پلیس نے اپنے دوران ملازمت میں پرانے تالاب کو درست کر کے آب پاشی کا انتظام درست کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مالگزاری بڑھا دی تھی۔ باقی کہیں آب پاشی کا انتظام نہیں۔ آبادی بہت کم ہے اور ساری جاگیر "جنگل" بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان کی صنعتی تباہی

مورخین ہند نے، جو زیادہ تر انگریز ہیں، ہندوستان میں برطانیہ کے سیاسی و فوجی کارناموں اور حسن انتظام کی مدح میں نہایت قابلیت سے اعلیٰ معلومات کا ایک کثیر ذخیرہ بہم پہنچایا ہے۔ لیکن تاریخ باشندگان ہند نے، ان کی تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور ان کی معاشی حالت کے متعلق تقریباً خاموشی اختیار کی ہے۔

سلطنت برطانیہ کی ترقی مشہور ولیم پٹ (۱۷۵۷ء سے ۱۷۶۱ء) کے عہد وزارت میں ہوئی۔ فریڈرک اعظم (حلیف انگلستان) نے پروشیا کو زیر کیا اور فرانس کو شکست دی

وولف نے ۱۷۵۹ء میں کوبیک (کناڈا) فتح کیا اور تمام کناڈا فرانسیسیوں سے لے لیا۔

کلائیو نے ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فتح حاصل کی اور جنرل آئرکوٹ نے فرانسیسیوں کو ۱۷۶۱ء میں شکست دی۔ اس قلیل مدت میں انگلستان یورپ کی ایک طاقتور سلطنت شمار کیا جانے لگا اور ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اب محض تاجروں کی تجارتی کمپنی ہی نہ تھی بلکہ ہندوستان کے سیاسی امور میں بھی کسی نہ کسی طرح حصہ لینے لگی۔ بنگال اور مدراس کے نوابوں اور راجاؤں کا لڑائیوں میں — جو اکثر اسی کی حرکتوں کا نتیجہ ہوتی تھیں — ساتھ دیا اور انجام کار ایک دوسرے کو آپس میں لڑا کر ان کو سخت نقصان پہنچایا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔

آج کل قحط و گرانی کا غیر مختتم سلسلہ اور عام افلاس ملک پر ایسا حاوی ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہندوستان کبھی خوش حال بھی رہا ہے، کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ ملک غیر زرعی ہے یا یہاں کے باشندے کاہل ہیں۔

نہایت فخر سے کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بہت سے احسان کیے ہیں جو دوسرے ملکوں میں دوسری حکومتوں کے تحت حاصل نہیں۔

۱۔ کسی ملک کی بہبودی کے لیے جو چیز سب سے بڑی نعمت ہو سکتی ہے وہ امن و امان ہے۔

۲۔ نظام حکومت ایسی بنیادوں پر قائم کیا ہے کہ دوسرے ملک کے حملہ کا اندیشہ قریب قریب ناممکن ہے اور اندرونی فتنہ و فساد کا بہت کم خطرہ ہے۔

۳۔اعلیٰ اور بہترین قوانین بنائے اور عدالتیں قائم کیں۔

۴۔ہندوستان کی قدیم تہذیب کو مغربی تہذیب اور جدید علوم و فنون سے متمتع کر دیا۔

۵۔ہر شخص کو اس کا فطری حق ـــــ آزادی ـــــ عطا کر دیا، رفاہ عام، آسائش عامہ اور اتحاد و یگانگت کے ایسے کام کیے جن سے یہ ملک محروم تھا۔

آج کل ہندوستان کا ہر شخص ـــــ جاہل سے جاہل بھی ـــــ جانتا ہے کہ ان تمام احسانات سے وہ کس قدر متمتع ہوا ہے اور دوسرے ممالک کے مقابلے میں وہ کس قدر خوش حال زندگی بسر کر رہا ہے۔

برطانیہ کے نیک مقاصد ہم نے بارہا سنے ہیں، لیکن ان نیک مقاصد کے زیر سایہ ہندوستان میں جو افلاس پیدا ہوا ہے وہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے۔ کیا کبھی ایمانداری کے ساتھ یہ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان اس قدر مفلس کیوں ہے؟ اور ۱۸۷۷ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک پندرہ ملین آبادی ـــــ یعنی انگلستان کی نصف آبادی کے برابر ـــــ کیوں فنا ہو گئی؟ اس کا سبب قحط بتایا جاتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی پیداوار کے تناسب سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اور کبھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ کاشت کاروں کی ناواقفیت اور بے پروائی اس کا سبب ہے، اور جہاں جنوں کی طرح بڑھتی ہوئی شرح سود وغیرہ اس کا سبب ہے لیکن اگر اس کا واقعی جواب حاصل کرنا ہو تو مندرجہ ذیل امور میں اصلی سبب ہندوستان کے

افسوسناک افلاس کا ملتا ہے۔

۱۔ ناقابلِ برداشت مالگزاری، اس کے وصول کرنے کے مختلف طریقے اور بے محل خرچ۔

۲۔ تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ کی تباہی اور برطانیہ کی خود غرضانہ پالیسی

۳۔ نظام حکومت میں اہل ملک کا دخل نہ ہونا۔

۴۔ انگلستان کے لیے امتناعی قانونِ تجارت کا اصول اور ہندوستان کے لیے آزاد تجارت۔

۵۔ ہندوستان کا قومی قرض۔

ان میں سے ہر مد مستقل بحث چاہتی ہے کیسی ملک کی ترقی و بہبود کا دارومدار زیادہ تر تجارت اور صنعت و حرفت پر ہوتا ہے، اس لیے ہم سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی زمانے اور مابعد کی حالت پر نظر کرتے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی انگلستان کی ایک تجارتی جماعت تھی جو دوسری یورپی قوموں کی تجارتی جماعتوں کی طرح ہندوستان میں آئی تھی۔ ہندوستان کی زرخیزی اور کثیر پیداوار نے ہر گروہ کو اس ملک کا گرویدہ کر لیا تھا، لیکن انگلستان کی جماعت ہندوستان سے انتفاع میں کامیاب رہی۔ فرانسیسی اور ڈچ کمپنیاں نیست و نابود ہو گئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے صرف ساٹھ ہزار پونڈ کے سرمایہ سے تجارت شروع کی تھی اور ایک صدی کے اندر ہی اندر نہ صرف بے انتہا منافع حاصل کیا

بلکہ اپنی حکومت کی بنیاد بھی ڈال دی اور یہاں کی فرمانروا بن گئی۔ بنگال اور جنوبی ہند کے نوابوں اور راجاؤں سے شروع میں چند مراعات حاصل کیں اور پھر جارحانہ پالیسی سے کام لینا شروع کر دیا۔

بنگال کے نواب میر قاسم نے انگریزوں کو اندرونِ ملک تجارت پر محصول معاف کر دیا اور کلکتہ میں ایک فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دے دی اور ان کی درخواست پر اس کی حفاظت کے لیے انگریزوں کی ایک جماعت کے رکھنے کا بھی حکم دے دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کو آہستہ آہستہ دست درازی کا موقع ہاتھ آ گیا۔ جن جن طریقوں سے عوام اور نواب کے ملازموں کو پریشان اور ذلیل و رسوا کیا اس کی داستان بہت طویل ہے۔ نواب میر قاسم نے اس کو روکا تو انگریزوں نے میر جعفر سے مل کر اس کو معزول کر دیا۔ اس کے صلہ میں میر جعفر نے ۵۷۹۸۳۲۱ پونڈ عطا کیے اور اس کے علاوہ کلائیو نے ایک اعلیٰ جاگیر اور ۳۱ ہزار پانسو پونڈ نقد حاصل کیے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد میر جعفر سے بگڑ گئی، میر قاسم دوبارہ تخت نشین ہوا۔ کمپنی نے اس کے معاوضے میں ۲۰۰۲۶۹ پونڈ حاصل کیے۔ کمپنی کی دست درازیاں جاری رہیں، میر قاسم ان سے تنگ آ گیا اور اس نے کمپنی پر سختی شروع کی۔ میر قاسم کو معزول کر دیا گیا اور میر جعفر کو نواب بنایا گیا، اس دفعہ ۵۰۰۱۶۵ پونڈ کمپنی کو ملے۔ اس کے بعد ۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور ۲۳۰۳۵۶ پونڈ کمپنی کو ملے۔ غرض آٹھ سال کی مدت میں بنگال کے نوابوں سے کمپنی نے ۵۹۴۰۴۹۸ پونڈ وصول کیے اور

بنگال ہمیشہ کے لیے دیوالیہ ہو گیا۔ کمپنی بہت مالدار ہو گئی۔ ۱۷۶۸ء میں بادشاہ دہلی سے دیوان کا فرمان حاصل کر کے کمپنی بنگال کی مالک بن گئی۔

اب کمپنی کو پورے اختیارات حاصل تھے اور تجارت کو جائز و ناجائز طریق سے بے انتہا فروغ دیا جس کی وجہ سے مقامی کاریگری کو بہت نقصان پہنچا اور ان وجوہ سے قحط کی سی حالت پیدا ہو گئی۔ ۱۷۷۰ء میں بنگالہ کی ایک تہائی آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔ اس کے بعد ہسٹنگز نے کٹرہ اور الہ آباد بھی حاصل کر لیا اور اودھ کے نواب کو پانچ لاکھ پونڈ کے عوض دے دیا۔ یہ قبضہ عارضی ہی تھا۔ روہیلوں کے خلاف نواب اودھ کو ایک فوجی دستہ دے کر چار لاکھ پونڈ وصول کیے۔ جنوبی ہند میں بھی یہی حال تھا غیر ملکی قبضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مقامی تجارت کی تباہی کی کوشش بھی جاری تھی۔ انگریزی مال — جو ساخت میں بھدا اور کمزور تھا — بازار میں بکنے لگا۔ لوگ مجبوراً اس مال کو خریدتے اور گراں قیمت پر خریدتے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی تک ہندوستان نہ صرف ایک اعلیٰ زراعتی ملک تھا بلکہ دنیا کے بہترین تجارتی ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ کپڑے کی تجارت کے لیے دنیا میں اس سے بہتر کوئی ملک نہ تھا۔ یہاں کا اونی، سوتی، ریشمی زربفت کا کپڑا سارے ایشیا، یورپ حتیٰ کہ امریکا کے بازاروں میں بکثرت جاتا تھا۔

پلاسی کی جنگ (۱۷۶۵ء) کے بعد جو واقعات و تغیرات ظہور پذیر ہوئے ان کی تیزی رفتار حیرت انگیز ہے۔ انگلستان کو — جو اس زمانے میں مختلف قسم

کی ایجادیں کر رہا تھا ۔۔۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ خام پیداوار خاصکر کپاس وغیرہ حاصل کرے ۔ ہندوستان اس کے لیے بہت موزوں نظر آیا ۔ اب کیا تھا انگلستان میں بکثرت کارخانے کھل گئے ۔ ہندوستان میں کپڑے کی تجارت بالکل ختم ہوگئی اب وہ صرف کپاس پیدا کرنے لگا ۔ سستے داموں ۔۔۔ ایجنٹوں کے ذریعے ۔۔۔ روئی خریدی جاتی اور انگلستان سے سوتی مال ہندوستان میں درآمد ہو کر گراں قیمت پر فروخت کیا جاتا ۔

ہندوستان کی معاشی حالت یونہی کچھ کم خراب نہ تھی کہ نئی اسکیم کا نفاذ ہوگیا ۔ یعنی انوسٹمنٹ اسکیم ۔ ۱۸۱۳ء میں دارالعوام میں جو رپورٹ پیش ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کی مالگزاری کا ایک حصہ خام پیداوار خریدنے کیلئے الگ کر لیا جاتا جو انگلستان بھیج دی جاتی تھی اور حکومت انگلستان اس کو گراں قیمت پر فروخت کرکے کثیر منافع حاصل کرتی تھی ۔ ہزاروں جہاز یہاں کی خام پیداوار سے بھرے ہوئے انگلستان جاتے تھے ۔

کمپنی کے انگریز ملازم ہندوستان میں اپنے گماشتوں کے ذریعے مقامی اشیاء سستی خریدتے اور مہنگی فروخت کرتے ۔ حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی ان کے قبضے میں تھیں ۔ جو اشیاء انگریز فروخت کرتے ، ہندوستانی ان کو نہیں فروخت کر سکتے تھے ۔ یہ کوئی سرکاری قانون نہ تھا ، لیکن بُری طرح انسانیت سوز سزائیں دے کر یہی کیا جاتا تھا ۔ کپڑا وغیرہ تو ولایتی ہی کا فروخت ہونے لگا تھا ، ہندوستان کے تاجر اپنا مال

باہر ملکوں میں بھیجتے اس پر محصول آتنا زیادہ تھا کہ فائدہ تو درکنار مال کی قیمت بھی مشکل سے ملتی تھی، بخلاف اس کے ولایتی مال پر محصول بہت کم تھا۔ دیسی صنعت کو تباہ کرنے کی کوئی صورت نہ تھی جس کو چھوڑا گیا ہو۔ مقامی کاریگروں پر محصول لگا دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ کمپنی کے ملازموں نے یہاں کارخانے کھولے اور کاریگروں کو جو محصول ادا نہیں کر سکتے تھے طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں، اور اگر یہ نہ ہوتا تو کم تنخواہوں پر (جو ضروریات زندگی کے لیے ناکافی ہوتی تھیں) ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔ خام ریشم بہت طیار ہوتا تھا جو انگلستان بھیج دیا جاتا۔ انویسٹمنٹ کا روپیہ ۱۷۹۳ء سے ۱۸۱۳ء تک ۲۵۱۲۴۶۷۲ پونڈ ہوا۔ اس زمانے میں امیر دو نے اپنی شہادت میں پارلیمنٹ کے سامنے بیان کیا کہ ہندوستان کی معاشی حالت بالکل تباہ ہوگئی ہے۔ ہندوستان جس کی ماہوار اوسط آمدنی چار شلنگ یعنی تین روپیہ ہے وہ کیونکر انگریزی مال خرید سکتا ہے ۱۸۱۳ء میں چارٹر کی رو سے کمپنی کا اجارہ موقوف کر دیا گیا اور انفرادی تجارت کا عام استحقاق حاصل ہوگیا۔ ایچ ایچ ولسن مشہور مورخ لکھتا ہے کہ ۱۸۱۳ء کے پارلیمنٹ کے مباحث میں اہل ہند کی معاشی ترقی کے لیے کوشش کی گئی لیکن انگلستان کے تاجروں نے اس کی شدید مخالفت کی، کیونکہ اس سے ان کو اپنے مفاد کا خطرہ تھا اور وہ کامیاب ہو گئے۔

۱۸۱۳ء کے چارٹر کی رو سے کمپنی کے ہندوستانی تجارتی حقوق بالکل منقطع

ہو گئے لیکن چین اور دوسرے جزائر سے ہنوز باقی تھے کمپنی نے مدراس، بمبئی، بنگال سے اون بہت زیادہ خریدی، انویسٹمنٹ سے آٹھ ہزار گٹھے ڈھائی سو پونڈ وزنی خریدے اور ۱۸۲۷ء میں ۶۸ ملین پونڈ وزنی روئی خریدی جس کی قیمت ایک ملین اسٹرلنگ پونڈ (یعنی پندرہ ملین روپیہ) ہوتی۔ انگلستان کو غلہ، شکر، چائے، شورہ، لوہا، چاندی، سونا، تانبا وغیرہ بکثرت جاتا تھا۔ وہ اشیاء جو ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۹ء تک انگلستان گئیں حسب ذیل ہیں:

روئی ۱۶۰ سے ۱۲۷۲۴ تک گٹھے گئے۔

سوتی کپڑا ۱۴۸۱۷ سے ۱۰۴ ″ ″

خام ریشم ۲۱۳ سے ۷۰۰۰ ″ ″

ریشمی کپڑا ۱۵۵۸ سے ۴۶۸ ″ ″

نیل ۱۲۸۱۱ سے ۲۷۰۰۰ صندوق۔

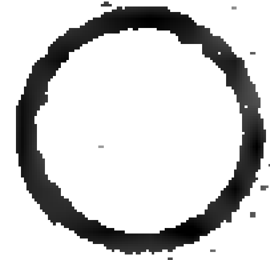
یورپین پلانٹرز، جن کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی ہندوستانی کاشتکاروں کو زرپیشگی بطور اجارہ دے کر ایک مقررہ اراضی پر نیل کی کاشت کراتے تھے اگر کاشتکار اس کام سے فراغت پاکر اپنی ذاتی زمین جوتتے تو سخت سزائیں دی جاتیں اور کوڑے سے مارے جاتے، زمینیں کھیتیاں وغیرہ ضبط کرلی جاتیں، بڑے بڑے جرمانے کیے جاتے، قید کردیا جاتا اور لمبی سزائیں کاٹنی پڑتیں اور اسی حالت میں کارخانوں میں کام کرنے پر ان کو مجبور کیا جاتا بعض ہندوستانی بھی نیل کی تجارت کرتے تھے مگر

وہ مخالفانہ کارروائیوں کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔ ان انگریز پلانٹروں میں اکثر بہت کم سرمایہ تھے، جس قدر سرمایہ کی ان کو ضرورت ہوتی سرکاری ایجنسی ہاؤس سے قرض دے دیا جاتا تھا۔ بنگال میں جیسور، کرشنا گڑھ اور ترہٹ میں چار سو سے زیادہ فیکٹریاں قائم تھیں نیل کی کاشت وہی لوگ کرائی جاتی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں نو ہزار پونڈ وزنی نیل انگلستان گیا، جب کلکتہ میں نیل لاکے جمع کیا جاتا تو ۲۴۰۲۰۰۰ پونڈ قیمت کا ہوتا تھا اور انگلستان میں ۶۰۰۰۰۰۰۴ پونڈ کو فروخت ہوتا تھا نیل کی کاشت اس کثرت سے ہوئی کہ سینٹ ڈامنگو (جو انقلاب فرانس سے پیشتر یورپی ممالک کو نیل مہیا کرتا تھا) تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ سب کچھ غریب ہندوستانی مزدوروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی اور محنت کا نتیجہ تھا جسے انگریز اپنی حلال روزی سمجھتے تھے۔

۱۸۳۷ء میں جب کمپنی کی حکومت مستحکم ہو گئی تو ایک چارٹر کی رو سے تاج انگلستان کو منتقل ہو گئی۔ ملکہ وکٹوریہ تخت پر جلوہ افروز ہوئیں اور ہندوستانی تاریخ کا نیا باب شروع ہو گیا، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کمپنی کی حکومت سے کسی قدر مختلف تھا۔

ہندوستان کی ۳۴ کروڑ آبادی میں ۱، فی صد یعنی تقریباً ۲۴ کروڑ نفوس کی زندگی کلیتہً زراعت پر ہے۔ باقی ۲۹ فی صد میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو دوسرے وسائل سے کسب معاش کرتے ہیں۔ ان میں کاریگروں یا صناعوں کی تعداد صرف ۱۲ فی صد ہے لیکن جب اس تناسب کا مقابلہ انگلستان کے اہل صنعت سے کیا جاتا ہے تو

معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ۸۰ فی صد صناع ہیں اور صرف آٹھ فی صد ایسے ہیں جن کا ذریعۂ معاش زراعت ہے۔



اخلاقیات اور سیاسیات

ارسطو کہتا ہے کہ "انسان ایک سیاسی حیوان ہے" ان چند لفظوں میں اس نے صفحوں کی بحثیں سمیٹ کر رکھدی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سیاسیات کو عموماً اتنا محدود سمجھا جاتا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی بھی اخلاقیات کو اس کا ایک جز سن کر حیران رہ جاتے ہیں مگر قدمائے یونان نے اسے بہت وسیع معنوں میں لیا ہے جس سے ان کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اخلاقیات و سیاسیات دونوں توأم ہیں، اور دونوں میں ایسا گہرا رابطہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا علم الاخلاق افراد کے باہمی تعلقات و رابطوں سے بحث کرتا ہے، اور علم السیاست افراد و جماعات کی تنظیم سے، دونوں قدم قدم پر ایک دوسرے سے مدد لیتے ہیں، اور معاملات میں اکثر ان کو ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ اس مسئلہ پر قدیم حکمائے یونان نے بہت وضاحت سے بحث کی ہے۔ موجودہ حکما کو اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں ہے، اس لیے یہاں اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا جائے گا وہ صرف حکمائے یونان کے خیالات ہونگے۔ اور ان میں بھی زیادہ تر ارسطو اور افلاطون کے۔

افلاطون اجتماعیت کا عاشق، اس نے اپنی ساری توجہ انفرادی محاسن اخلاق کی تحقیق و تفتیش اور حد بندی کرنے کے بجائے محاسن اجتماعی اور جماعات کی صحیح شیرازہ بندی کے اصول دریافت کرنے میں صرف کی، اور اس کے لیے اس نے ایک ایسے نظام حکومت کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی جس کے ماتحت جماعت، جماعت کی حیثیت سے اور افراد اجزاء جماعت کی حیثیت سے انتہائی ترقی تک پہنچ سکیں۔ وہ جماعت کی فلاح کو نظام حکومت کی بہتری میں ڈھونڈتا ہے، اس کے نزدیک کوئی جماعت اخلاقی پستی سے نہیں نکل سکتی، تاوقتیکہ نظام سیاست ایک بلند معیار پر قائم نہ ہو، اور اس کا خیال ہے کہ ایک اچھی حکومت کے میزات و خصوصیات دریافت کر لینے کے بعد اجتماعی محاسن کا حصول بہت آسان ہے۔ اس مسئلہ پر اس نے اپنی مشہور تصنیف "جمہوریت" میں بہت وضاحت سے بحث کی ہے۔ وہ ایک معیاری حکومت کا خاکہ کھینچتا ہے جسے اخلاقی و سیاسی اعتبار سے اب بھی ایک بہترین حکومت کا دستور اساسی کہا جا سکتا ہے۔ اس نے یونانیوں کی عام تقسیم کے مطابق اپنی خیالی حکومت کو چار بنیادوں پر قائم کیا ہے: حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت۔ ظاہر ہے کہ جس حکومت کا مایۂ خمیر یہ فضائل اخلاق ہونگے، وہ جماعت انسانی کے لیے کس قدر مفید اور فطرت انسانی سے کس قدر قریب ہوگی۔ افلاطون ان چاروں اصولوں کی حکومت دنیا میں دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے ماتحت اسے یقین ہے کہ انسانی جماعت اخلاق کے درجۂ کمال کو پہنچنے کے قابل ہو سکتی ہے۔ افلاطون کے اس نظریہ پر ڈاکٹر سیجوک نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ اخلاقیات" میں بالتفصیل بحث کی ہے، مگر سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ مضمون ڈاکٹر بسنکٹ

کی کتاب (COMPANION TO PLATO'S REPUBLIC) میں ملے گا۔

اس بارے میں ارسطو بھی افلاطون سے پیچھے نہیں۔ انسان کے مدنیت پسند ہونے کی نسبت اس کا عقیدہ یقین واذعان کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے اس نے اخلاقیات پر جو کتاب لکھی ہے، بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگرچہ اب اس موضوع پر ایک بہت بڑا سرمایہ پیدا ہو گیا ہے مگر وہ سب اسی دریا کی نکلی ہوئی نہریں ہیں، اس کی ساری بحث اس خیال پر مبنی ہے کہ علم الاخلاق، علم السیاست کا ایک جزو ہے۔ اور وہ اس اصول کے ماتحت بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے ایک ایسے نظام حکومت کو تلاش کرتا ہے جو بہترین فضائل اخلاق پر قائم ہو۔ اگرچہ اس کے نزدیک زندگی کا ایک معیار ایسا بھی ہے جو سیاسی زندگی سے بہت اعلیٰ وارفع ہے، مگر اس زندگی کو بھی وہ شہریت ہی کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے اور اسے اپنی خاص اصطلاح میں نظری و فکری زندگی سے تعبیر کرتا ہے جسے ہم علمی حکمی زندگی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ارسطو کی اس بحث کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سیاسیات اخلاقیہ پر بہت زیادہ غور کیا تھا اور اس نقطہ پر پہنچا تھا جس سے آج تک ہم ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکے۔ آج کل سیاست کے اس حصہ کو جس کا تعلق اخلاقیات سے ہے فلسفۂ اجتماعی کہا جاتا ہے اخلاقیات اور سیاسیات میں باہم جو علاقہ ہے اس پر ڈاکٹر میکنزی نے مناہج اخلاقیات میں مفصل بحث کی ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے مندرجہ بالا خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اخلاقیات کا بہترین مقصد ایک ایسے نظام حکومت کی تخلیق تھا جس کے ماتحت رہ کر عوام اپنی اخلاقی تکمیل کر سکیں۔

نسبتِ اوّل یا آخر

(الف)

۲۶ء ـــ ۲۷ء

میں اس طریقے سے اصولی اختلاف رکھتا ہوں کہ ہم اپنے عقائد و اصول کو دوسروں کے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھال کر پیش کریں۔ دنیا کا کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں تمام لوگ ایک نقطۂ نظر پر متفق ہوں۔ ہر جماعت اپنا ایک الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے اور اسی کو صحیح سمجھتی ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ لیکن ہم دوسروں کے نقطۂ نظر کی رعایت سے اپنے اصول

کی کتاب (COMPANION TO PLATO'S REPUBLIC) میں ملے گا۔

اس بارے میں ارسطو بھی افلاطون سے پیچھے نہیں۔ انسان کے مدنیت پسند ہونے کی نسبت اس کا عقیدہ، یقین و اذعان کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے۔ اس نے اخلاقیات پر جو کتاب لکھی ہے، بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگرچہ اب اس موضوع پر ایک بہت بڑا سرمایہ پیدا ہو گیا ہے مگر وہ سب اسی دریا کی نکلی ہوئی نہریں ہیں، اس کی ساری بحث اس خیال پر مبنی ہے کہ علم الاخلاق علم السیاست کا ایک جز ہے اور وہ اس اصول کے ماتحت بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے ایک ایسے نظام حکومت کو تلاش کرتا ہے جو بہترین فضائل اخلاق پر قائم ہو سکے۔ اگرچہ اس کے نزدیک زندگی کا ایک معیار ایسا بھی ہے جو سیاسی زندگی سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے، مگر اس زندگی کو بھی وہ شہریت ہی کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے اور اسے اپنی خاص اصطلاح میں نظری و فکری زندگی سے تعبیر کرتا ہے جسے ہم علمی و حکمی زندگی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ارسطو کی اس بحث کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سیاسیات و اخلاقیہ پر بہت زیادہ غور کیا تھا اور اس نقطہ پر پہنچا تھا جس سے آج تک ہم ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکے۔ آج کل سیاست کے اس حصہ کو جس کا تعلق اخلاقیات سے ہے فلسفۂ اجتماعی کہا جاتا ہے۔ اخلاقیات و سیاسیات میں باہم جو علاقہ ہے اس پر ڈاکٹر تیج و کٹ نے منابج اخلاقیات میں مفصل بحث کی ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے مندرجہ بالا خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اخلاقیات کا بہترین مقصد ایک ایسے نظام حکومت کی تخلیق تھا جس کے ماتحت رہ کر عوام اپنی اخلاقی تکمیل کر سکیں۔

نسبت اوّل یا آخر

(۱)

۲۶ ستمبر ۲۷ء

میں اس طریقے سے اصولی اختلاف رکھتا ہوں کہ ہم اپنے عقائد و اصول کو دوسروں کے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھال کر پیش کریں۔ دنیا کا کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں تمام لوگ ایک نقطۂ نظر پر متفق ہوں۔ ہر جماعت اپنا ایک الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے اور اسی کو صحیح سمجھتی ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ پس اگر ہم دوسروں کے نقطۂ نظر کی رعایت سے اپنے اصول

عقائد کو خواہ کتنا ہی رنگ کریں یہ ناممکن ہے کہ تمام مختلف الخیال گروہ ہم سے متفق ہو جائیں، اور سب کو ہمارا وہ رنگ پسند آجائے۔ اس لیے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے عقائد، اپنے مسائل، اپنی تعلیمات، اور اپنے قوانین کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر دیں، بہتر سے بہتر طریقے سے دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کریں، اور پھر خود اس کی عقل پر چھوڑ دیں کہ خواہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ یہ دعوت و تبلیغ کا صحیح اصول ہے جسے ہمیشہ سے ارباب عزم لوگوں نے اختیار کیا ہے، اور خود انبیاء علیہم السلام نے بھی اسی پر عمل کیا ہے۔

اگر دنیا میں کوئی ایسی طاقت موجود ہو جو بدی کے خلاف پیہم جہاد کرتی رہے، اور تمام سرکش قوتوں کو اپنی اپنی حدود کی پابندی پر مجبور کر دے تو نظامِ تمدن میں یہ بے اعتدالی ہرگز نظر نہ آسکے کہ آج سارا عالمِ انسانی ظالموں اور مظلوموں، آقاؤں اور غلاموں میں بٹا ہوا ہے۔ اور تمام دنیا کی اخلاقی و روحانی زندگی کہیں غلامی و مظلومی کے باعث، اور کہیں غلام سازی اور جہانبانیگی کے باعث تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ بدی کو دوسروں سے

دفع کرنا تو ایک ادنیٰ درجہ ہے، اگر اسے خود اپنے سے دفع کرنے کا احساس بھی ایک قوم میں ہو گیا ہو، اور اس کے مقابلے میں وہ اپنے عیش و آرام کو، اپنی دولت و ثروت کو، اپنی جسمانی لذات اور اپنی جان کی محبت کو، غرض کسی چیز کو بھی عزیز نہ رکھے تو وہ کبھی ذلیل و خوار ہو کر نہیں رہ سکتی، اور اس کی عزت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف قوم کا خاصہ ہونا چاہیے، اور اگر وہ اعلائے حق اور اعانتِ حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم تحفظِ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہیے، جو شرافت کا سب سے کم درجہ ہے۔ لیکن اس درجے سے گر کر جو قوم حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر بڑھ جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کر لے تو ایسی قوم کے لیے دنیا میں کوئی عزت نہیں ہے۔ اس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔ اسی رمز کو سمجھانے کے لیے خدا نے بار بار اپنی حکیمانہ کتاب میں ان قوموں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے بدی کے خلاف جہاد کرنے میں جان و مال اور لذاتِ نفسانی کا ٹوٹا دیکھ کر اس سے جی چرایا، اور بدی کا تسلط قبول کر کے اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے خسران و نامرادی کا داغ لگا لیا۔ ایسی قوموں کو خدا ظالم قومیں کہتا ہے یعنی انہوں نے

اپنے اعمال سے خود اپنے اوپر ظلم کیا، اور حقیقتہً وہ اپنے ہی ظلم سے تباہ ہوئیں۔

تصور قدر [?]

قرآن کی تعلیم اپنے پیروؤں میں حمایت حق کی ایسی ناقابل تسخیر روح پیدا کرنا چاہتی ہے جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام، یا مال و دولت، یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہو کر حفاظت حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے، اور باطل کو طاقتور دیکھ کر اس کی غلامی قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ یہ ضعف، جو درحقیقت جسم و جان کا ضعف نہیں بلکہ قلب و ایمان کا ضعف ہے، جب کسی قوم میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے اندر سے عزت و شرافت کے تمام احساسات خود بخود دور ہو جاتے ہیں، اور اعلائے حق کی اعلیٰ خدمت کو انجام دینا تو درکنار وہ خود اپنے آپ کو بھی حق کے راستے پر قائم رکھنے میں کامیاب نہیں رہ سکتی۔ جسم کی غلامی کو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی بندشیں صرف اوپر ہی اوپر رہتی ہیں اور

قلب و روح تک ان کا اثر نہیں پہنچتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جسم کے غلام ہونے سے پہلے روح غلام ہو چکتی ہے، اور جسم غلامی کا غیرت شکن اور ذلت انگیز لباس پہنتا ہی اس وقت ہے جب روح غیرت و حمیت کے جوہر سے عاری ہو جاتی ہے، اور عزت و شرافت کا احساس اس سے رخصت ہو چکا ہوتا ہے۔ پس جو قوم اپنی کمزوری و بزدلی کے باعث اپنے حقوق کے تحفظ میں کوتاہی برتتی ہے، اور شرارت کو قوی بازو دیکھ کر اس کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، اس میں یہ قوت کبھی باقی نہیں رہتی، اور رہ نہیں سکتی کہ اپنے شعائر، اپنے آداب، اپنے قوانین اور اپنے دینی و اخلاقی اصولوں پر سختی سے قائم رہے، اور اپنے اجتماعی نظام کو ٹوٹنے نہ دے۔ پھر جب کہ حق و باطل دونوں باہم ضد ہیں اور ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قوم باطل کی غلامی قبول کرنے کے بعد بھی حق کی بندگی پر قائم رہے، اور ایک سے عبدیت کا رشتہ جوڑ کر دوسرے کے رشتۂ عبدیت کو ٹوٹنے سے محفوظ رکھے۔ حق کی فطرت تو یکتائی پسند ہے۔ وہ باطل کو اپنا سہیم و شریک بنا کر کبھی ایسی تقسیم نہیں کر سکتا کہ آدھا میرا ہے اور آدھا تیرا۔ اس لیے جس کسی کو اس کی بندگی کرنی ہو اسے باطل کی بندگی چھوڑنی پڑے گی، اور اپنی گردن کو دوسری تمام بندگیوں کے طوق و زنجیر سے خالی رکھنا پڑے گا۔

قرآن، جو درحقیقت صحیفۂ فطرت ہے، فطرت کے اس راز کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو صرف دو راہیں بتائی ہیں، یا موت، یا شرف۔ زندگی بے شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی، اگرچہ اس کے بدنصیب پیروؤں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور حوصلے کی پستی سے اس کو خود اختیار کر لیا ہے۔ وہ تو اس زندگی کو "ذلت" و "مسکنت" قرار دیتا ہے۔ اللہ کے غضب سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے ان قوموں کی خصوصیت بتاتا ہے جو اپنی بزدلی اور خشیتِ ماسوی اللہ کے باعث اپنے تئیں قہرِ الٰہی کا مستوجب بنا لیتی ہیں، اور اس کی زبان میں اس ذلیل زندگی کو اختیار کر لینا اپنے اوپر آپ ظلم کرنا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو جو اس زندگی پر راضی ہو جائیں خسران و نامرادی کی یہ وعید سنائی ہے:-

ان الذین توفٰهم الملٰئکة

ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم؟

قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا

الم تکن ارض اللہ واسعة فتھاجروا

فیھا؟ فاولٰئک ماوٰھم جھنم

وساءت مصیراً۔ (النساء۔۱۴)

جن لوگوں کی، روحوں کو فرشتوں نے اس حال میں قبض کیا کہ وہ خود

اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ تم یہ کس حال میں جی رہے تھے؟ انہوں نے کہا ہم زمین میں کمزور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس جگہ کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے۔[1]

غور کرو کہ یہ غیرت ملّی کی کیسی روشن تعلیم ہے۔ اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر غیر حق کی اطاعت پر راضی ہو جانے والوں کو اپنے اوپر آپ ظلم کرنے والا کہا جا رہا ہے۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ ذلت کیوں قبول کی؟ وہ کمزوری اور ضعف کا عذر پیش کرتے ہیں تو قبول نہیں ہوتا۔ جواب ملتا ہے کہ اگر تم کمزور ہی تھے تو اس ذلت کے قبول کرنے سے بہتر تھا کہ گھر چھوڑ کر

---

[1] یہ آیت ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کی ہجرت کے بعد مکہ میں باقی رہ گئے تھے، اور جنہوں نے اپنے گھر بار کے آرام، اپنے کاروبار اور اپنی جائدادوں کی خاطر کفر کے اس ماحول میں رہنا قبول کر لیا تھا جس میں وہ اپنے مذہب اور اعتقاد کے مطابق اسلامی زندگی بسر نہ کر سکتے تھے، بلکہ کفار سے دبے ہوئے ہونے کے باعث بہت سے کافرانہ طریقے اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ حتی کہ اسی دباؤ کی وجہ سے آخرکار انہیں کفار کی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے بدر کے میدان جنگ میں آنا پڑا۔

نکل جاتے اور کسی ایسی جگہ جا رہتے جہاں اپنے ایمان اور ضمیر کے خلاف زندگی بسر کرنے کی مجبوری نہ ہوتی۔ تن کے آرام و آسائش کی خاطر بندگیٔ باطل کی ذلّت کیوں گوارا کر لی؟ آخر اسی جرم کی پاداش میں انہیں ذلّت و نامرادی کے اس گڑھے کی طرف پھینک دیا جاتا ہے جس کا نام جہنم ہے، اور یقیناً اس سے بری جا ہے بازگشت اور کوئی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سب معاملات میں تحمّل و برداشت کی تعلیم دی ہے، مگر ایسے کسی حملے کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دینِ اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام مسلط کرنے کے لیے کیا جائے۔ اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے، تم پر ظلم و ستم ڈھائے، تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بے دخل کرے، تم سے ایمان و ضمیر کی آزادی سلب کرے، تمہیں اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکے، تمہارے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا چاہے اور اس وجہ سے تمہارے درپے آزار ہو کہ تم مسلمان ہو تو اس کے مقابلے میں ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ اور پوری طاقت اس کے اس ظلم کو دفع کرنے

میں صرف کردو۔

یہ حفاظت دین اور مدافعت دیار اسلام کا حکم ایسا سخت ہے کہ جب کوئی قوم اسلام کو مٹانے اور اسلامی نظام کو فنا کرنے کے لیے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابلہ پر نکل آئیں اور جب تک اسلام اور اسلامی نظام کو اس خطرے سے محفوظ نہ کر لیں اس وقت تک چین نہ لیں۔ چنانچہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ حکم موجود ہے کہ جب دشمن "دارالاسلام" پر حملہ کرے تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً دفاع کا فرض ایسی قطعیت کے ساتھ عائد ہوتا ہے جیسے نماز اور روزہ۔

یہ فرضیت عینیہ صرف اسی صورت پر موقوف نہیں ہے کہ خاص مذہبی جذبے سے متاثر ہو کر کوئی اسلام کو مٹا دینے پر آمادہ ہو جائے، بلکہ حکومت اسلامیہ اور دیار اسلام پر ہر غاصبانہ حملے کے مقابلے میں مدافعت اسی قطعیت کے ساتھ فرض ہے۔ اسلام میں مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے

حریت و استقلال سب سے زیادہ ضروری چیز ہے اپنی آزادی کو کھو دینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں میں انسانیت کی اس اعلیٰ خدمت کو ادا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی جسے ادا کرنے کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں، بلکہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم رکھنے کے قابل بھی نہیں رہتے جس پر ان کی مذہبی زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت اور اسلامی قومیت پر حملہ کرنا دراصل عین اسلام پر حملہ کرنا ہے، اور خواہ کسی دشمن کا مقصد اسلام کا مٹانا نہ ہو بلکہ محض مسلمانوں کی سیاسی قوت ہی کو مٹانا ہو تب بھی اس سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لیے ویسا ہی فرض ہوگا جیسا اسلام کو مٹانے والے سے جنگ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے صرف اسی شہر یا اس ملک ہی کے مسلمانوں پر دفاع کا فرض عائد نہیں کیا گیا جس پر حملہ کیا گیا ہو، بلکہ روئے زمین کے تمام مسلمانوں کے لیے لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ اس ملک یا شہر کے مسلمانوں کو غلبۂ اعدا سے بچائیں۔

دفاع کے ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ان دینی فرائض میں جو ان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں سب سے بڑا اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنے قومی استقلال کی سختی کے ساتھ حفاظت کریں۔

اور اپنے قومی و دینی وجود کو کسی حال میں فتنے سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اس کے لیے اسلام نے اپنے پیروؤں کو جنگ کی محض اجازت ہی نہیں دی، بلکہ تاکید کی ہے۔ اور تاکید بھی ایسی سخت جس کی کیفیت اوپر گذر چکی ہے۔ مگر حملے کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ایک سلطنت باقاعدہ اعلان جنگ کر کے دارالاسلام پر حملہ آور ہو اور اس کو فتح کر کے مسلمانوں کو مٹانے، یا غلام بنانے، یا ان کی مذہبی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کرے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جن سے ایک قوم کے امن و اطمینان اور اس کی اجتماعی زندگی کو خطرے میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ پس اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صورتیں کیا ہیں، اور ان کے متعلق قرآن مجید ہم کو کیا حکم دیتا ہے۔

اب دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر، جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں، ایک غائر نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ ان سب کے اندر ایک ہی مقصد کام کر رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں، اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے، خواہ باہر سے خواہ اندر سے، اس کا سر کچلنے کے لیے ہر وقت

مستعد رہیں۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اس کے لیے اوّلین ضرورت ان کا فتنوں اور خرخشوں سے محفوظ رہنا اور ان کی دینی اور سیاسی طاقت کا مضبوط رہنا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو ٹوٹنے سے نہ بچائیں، اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان اجتماعی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنہوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا، تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے، بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو بھی انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں۔ اور یہ ان کا صرف اپنے اوپر ہی نہیں بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا۔ پس ان کو کھول کھول کر نہایت وضاحت کے ساتھ ان دشمنوں کے نشانات بتائے گئے ہیں۔ اور ایک ایک کا دھڑ توڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ دنیا سے ہدایت کے نور کو مٹانے، اور عالمگیر اصلاح کے کام میں روک پیدا کرنے کے قابل نہ رہیں۔ پھر اس کے لیے صرف اسی وقت تلوار اُٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جبکہ بدی اپنا سر نکالے اور فتنہ پردازی شروع کر دے، بلکہ اس کے مقابلے پر ہر وقت کمربستہ و مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اسے سر نکالنے کی جرأت ہی نہ رہے اور اس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اس کا دف اندر ہی اندر مر جائے۔

قرآن مجید، جو کتاب مجمل ہونے کے باوجود اسلامی تعلیم کے ایک ایک پہلو کی تفصیل کا حامل ہے، وہ مقصد بھی بیان کرتا ہے جس کے لیے مسلمان پیدا کیے گئے ہیں، اور وہ "اصل خدمت" بھی بیان کرتا ہے جس کو انجام دینے کے لیے ان کی قوت کے تحفظ میں یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:-

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس
تامرون بالمعروف وتنھون
عن المنکر وتؤمنون باللہ

آل عمران ۱۲

تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کی خدمت اور ہدایت کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس ارشاد میں اخرجت للعرب، یا اخرجت للعجم، یا اخرجت للشرق نہیں کہا گیا، بلکہ اخرجت للناس کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کسی خاص نسل، یا خاص ملک کے لیے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اور وہ بنی نوع انسان کی خدمت یہ ہے

کہ وہ نیکی کا حکم کریں اور بدی سے روکیں۔

ایک قوم کی زندگی کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی خدمت کرنا یہ ایک ایسی بات ہے جس کے تخیل سے قومیت و وطنیت کی فضا میں پرورش پانے والے تنگ دماغ آشنا نہیں ہیں۔ وہ "قوم پروری" یا "وطن پروری" کو تو خوب جانتے ہیں، اور "قوم پرستی" پر تو گویا ان کے تخیل کی معراج ہے، مگر جغرافی و نسلی حدبندیوں سے بالاتر ہو کر سارے عالم انسانی کی عملی خدمت انجام دینا، اور اسی کو پوری قوم کا مقصد حیات قرار دینا، ان کی رسائی سے بہت دور ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہمیں اس کی تشریح کرنی چاہیے کہ یہ اُخرجت للناس کیا چیز ہے۔

قرآن مجید نے اپنے ارشاد اخرجت للناس سے دراصل انسان کی اسی غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کیا ہے۔ اس نے اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار کو پیش کر کے عالمگیر خدمت انسانی کے اس اعلیٰ نصب العین کی طرف امت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے جو ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک حق پرست قوم کی غرض شناسی کے لیے قومیت کا میدان

بہت تنگ ہے ۔ وہ ایک نسل، یا ایک زبان، یا ایک ملک کی قید بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے خشکی و تری کی حد بندیاں، اور سمتوں اور جہتوں کی تقسیمیں بھی بے معنی ہیں کہ ایشیا اور یورپ، یا شرق و غرب کا امتیاز اس کے ادائے فرض میں حائل ہو سکے۔ اس کے نزدیک تو تمام انسان اور آدم کے تمام بیٹے بیٹیاں برابر ہیں۔ اس لیے ان سب کی خدمت کرنا یعنی ان سب کو نیکی کا حکم کرنا اور سب کو بدی سے روکنا اور شر سے بچانا اس کا فرض ہے۔ اس اعلیٰ تعلیم کو اس نے مختلف موثر پیرایوں میں پیش کیا ہے اور تنگ خیالی کے طلسم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھول دی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے خیر امت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کی خدمت کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں، بلکہ تمام انسانیت کی خدمت ان کا مقصد ہے۔ ان کے شرف کا راز اُخرجت للنّاس میں پوشیدہ ہے۔ وہ "قوم پرستی" یا "وطن پرستی" کے لیے نہیں اٹھائے گئے ہیں، بلکہ یہ عین فطرت اسلام ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خادم انسانیت بن کر رہیں۔

ایک دوسرا جذبہ جس پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیاد قائم ہے "حبِ انسانیت" اور "ہمدردی بنی نوع" کا جذبہ ہے۔ خود غرض آدمی کو اللہ جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ اکیلا رہنا چاہتا ہے۔ دوسرے کو اس میں شریک نہیں کرتا۔ اسی طرح کوئی مصیبت اس کی اپنی ذات پر آئے تو وہ اسے دفع کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے، مگر دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر ان کی مدد نہیں کرتا۔ بخلاف اس کے جو شخص ہمدرد اور محبِ انسانیت ہو وہ اپنی راحت میں سب کو شریک کرتا ہے، اپنی نعمتیں سب پر بانٹتا ہے اور دوسرے کو درد و مصیبت میں دیکھ کر اسی طرح بے تاب ہو جاتا ہے جس طرح خود اپنے لیے ہو سکتا ہے۔ اس خود غرضی اور ہمدردی کو ہم عموماً محسوسات اور مادیت کے عالم تک محدود سمجھتے ہیں۔ لیکن اخلاق و روحانیت کے عالم میں ان صفات کا مقابلہ زیادہ سختی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور چونکہ انسان کی مادی بھلائی اور برائی اس کی اخلاقی اور روحانی زندگی کے تابع ہوتی ہے، اس لیے ان صفات کا اصلی مقابلہ حقیقتاً اسی عالم میں ہوتا ہے۔ ایک سچا ہمدردِ بنی نوع اور محبِ انسانیت خود نیک بن جانے پر قانع نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنی انسانی برادری کے دوسرے افراد کو بھی بدی کے پنجے سے چھڑا کر نیکی کا راستہ نہ دکھائے اسے اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

اس کی روح اپنے دوسرے بھائی کو بدی میں مبتلا دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے۔ وہ دوسرے انسان کو نیکی کے لباس سے عاری دیکھ کر اسی طرح بے قرار ہو جاتا ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سردی میں سکڑتے دیکھ کر بیقرار ہو جایا کرتی ہے۔ اس کو جب کسی چیز کی اچھائی معلوم ہو جاتی ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ سارے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور جب وہ کسی چیز کی برائی جان لیتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کے چنگل میں ایک شخص بھی گرفتار نہ رہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک چیز اگر اچھی ہے تو وہ صرف میرے ہی لیے اچھی نہیں ہے، بلکہ ہر انسان کے لیے اچھی ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کو آدم کے ہر بیٹے اور بیٹی تک پہنچاؤں۔ دوسری چیز اگر فی الحقیقت بری ہے تو وہ صرف میرے ہی لیے بری نہیں ہے بلکہ سب کے لیے اس کی برائی یکساں ہے، اور لوگوں کو اس سے بچانا میرا فرض ہے۔ اپنی بھلائی پر قناعت کر کے دوسروں کی بھلائی نہ چاہنا، اور اپنے سے بدی کو دور کر کے مطمئن ہو جانا اور دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش نہ کرنا سب سے بڑی خود غرضی اور سب سے بڑی انانیت ہے۔

لیکن یہ صرف خود غرضی ہی نہیں بلکہ خودکشی بھی ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے۔ وہ جماعت سے الگ ہو کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ اس کی بھلائی برائی سب کچھ اجتماعی ہے۔ جماعت بری ہو گی تو اس کی برائی سے وہ بھی نہ بچ سکے گا۔ اگر ایک شہر میں عام طور پر غلاظت پھیلی ہوئی ہو، اور اس سے وبا

پھوٹ پڑے، تو ہوا کی خرابی صرف اسی شخص کو ہلاک نہ کرے گی جس کے گھر میں غلاظت موجود ہو بلکہ وہ صاف ستھرا، روز نہانے والا، روز گھر کو صاف رکھنے والا، اور حفظانِ صحت کا پورا لحاظ رکھنے والا آدمی بھی اس سے متاثر ہوگا جو اس شہر میں رہتا ہو۔ اسی طرح اگر کسی بستی کا عام اخلاق بگڑا ہوا ہو، اور وہاں کے لوگ عموماً بدکار ہوں، تو اس پر جو تباہی نازل ہوگی وہ صرف بدکاروں ہی تک محدود نہ ہوگی، بلکہ ان چند نیکوکاروں کی عزت و شرافت پر بھی اس کی زد پہنچے گی جو اس بستی میں مقیم ہوں۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (انفال ۳۰) کے یہی معنی ہیں کہ کسی بستی کی عام تباہی سے صرف بدکار ہی تباہ نہیں ہوتے بلکہ نیکوکار بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

پھر یہی وہ چیز ہے جس پر اجتماعی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے، جو ایک قوم اور ایک جماعت کو ہلاکت میں مبتلا ہونے سے بچاتی ہے۔ جس کے بغیر انسانیت کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ جب تک ایک قوم میں یہ اسپرٹ موجود رہتی ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو نیکی کا حکم کرنے

اور بدی سے روکنے کا اہتمام کریں، یا کم از کم اس قوم میں ایک جماعت ہی ایسی موجود رہے جو اس فرض کو مستعدی کے ساتھ انجام دیتی رہے، تو وہ قوم کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ اس میں سے نکل جائے اور اس میں کوئی جماعت بھی ایسی نہ رہے جو اس فرض کو انجام دینے والی ہو تو رفتہ رفتہ بدی کا شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے، اور آخر کار وہ اخلاقی و روحانی اور مادی تباہی کے گڑھے میں ایسی گرتی ہے کہ ابھر نہیں سکتی۔

پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ فی نفسہ ایک اچھی چیز ہے، اور ہمدردی بنی نوع کا ایک پاکیزہ جذبہ ہے، بلکہ درحقیقت وہ نظام تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے کی ایک بہترین اور ناگزیر تدبیر ہے، اور ایک خدمت ہے جو دنیا میں امن قائم کرنے، دنیا کو شریف انسانوں کی بستی کے قابل بنانے اور دنیا والوں کو حیوانیت کے درجہ سے انسانیت کاملہ کے درجہ تک پہنچانے کے لیے اللہ نے ایک بین الاقوامی گروہ کے سپرد کی ہے، اور یقیناً انسانیت کی اس سے بڑی خدمت اور

اپنی نظر میں ۲۴۴

کوئی نہیں ہو سکتی۔

اسلام ایک حیثیت میں تو محض دعوت ہے نیکی اور تقویٰ کی جانب، اور دوسری حیثیت میں وہ اللہ کا قانون ہے تمام دنیا کے لیے۔ جب کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کے لیے یہ دونوں حیثیتیں جمع ہو جاتی ہیں، اور دعوت کی دفعات بھی اس کے حق میں قانون کی دفعات بن جاتی ہیں۔ مگر اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں دعوت الگ رہتی ہے اور قانون الگ۔ دعوت کا منشا یہ ہے کہ انسان اس منصب خلافت کا اہل بن جائے جو اللہ نے اسے زمین پر بھیجتے وقت سپرد کیا تھا، اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ قانون کا منشا یہ ہے کہ انسان اگر منصب خلافت کی خدمات کو انجام نہ دے تو کم از کم فساد و خونریزی تو نہ کرے جس کا طعنہ فرشتوں نے اس کو دیا تھا۔ اگر وہ اشرف المخلوقات نہ بنے تو کم از کم ارذل المخلوقات تو نہ بن جائے۔ اگر وہ دنیا کو نیکی و تقویٰ سے روشن نہ کرے تو کم از کم بدی و شرارت سے اس کے امن و سکون کو غارت تو نہ کرے۔ پہلی چیز باطن کی روشنی اور طبیعت کی

صلاحیت پر منحصر ہے، جو ظاہر ہے کہ مارنے کوٹنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز حدود کی تعیین اور نگہداشت سے تعلق رکھتی ہے جس کا پاس لحاظ کرنے پر اس کی سرکش طبیعت کو صرف وعظ و تلقین ہی سے آمادہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ بعض حالات میں اسے مجبور کرنے کے لیے قوت کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔

اب اگر ان تمام برائیوں پر دوبارہ ایک غائر نظر ڈالی جائے، جن کو فتنہ و فساد سے تعبیر کیا گیا ہے، تو اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس، اور بداصل نظامِ حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہِ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا یقیناً اسی کے باطل پرور اثرات کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ اوّل تو ایسی حکومت فی نفسہٖ ایک فتنہ ہے، کیونکہ وہ حکومت کے منشاء اصلی کے خلاف ہوتی ہے۔ پھر اس کی برائی کسی ایک دائرہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور فتنہ و فساد کے تمام اصول و فروع کا منبع بن جاتی ہے۔ اسی سے

صدعن سبیل اللہ ہوتا ہے، اسی سے حق و انصاف کا سر کچلا جاتا ہے، اسی سے بدکاروں اور ظالموں کو اپنے برے اعمال کی قوت حاصل ہوتی ہے، اسی سے اخلاق کو تباہ کرنے والے، عدل اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کو غارت کرنے والے قوانین نافذ ہوتے ہیں۔ وہی بنی آدم کی جمعیت میں نفاق و شقاق کی تخم ریزی کرتی ہے، اسی کی بدولت جنگ و خونریزی کی آگ دنیا میں بھڑکتی ہے، اسی سے قوموں اور ملکوں میں بلائیں نازل ہوتی ہیں، اور خلاصہ کلام یہ کہ یہی وہ چیز ہے جس کی قوت کسی نہ کسی حیثیت سے ہر بدی و بدکاری کا وسیلہ یا اس کے قائم ہونے اور باقی رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

پس اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع و انسداد کے لیے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ منظم جدوجہد (جہاد) سے، اور اگر ضرورت پڑے تو جنگ (قتال) کے ذریعہ سے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے، اور ان کی جگہ وہ عادلانہ و منصفانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد خدا کے خوف پر اور خدا کے مقرر کیے ہوئے مستقل ضابطوں پر رکھی جائے، جو شخصی یا طبقاتی یا قومی اغراض کے بجائے خالص انسانیت کے مفاد کی خدمت کرے، جس کے قیام کا مقصد نیکی کو پروان چڑھانا اور بدی کو مٹانا ہو، اور جس کے کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہوں، اور اپنی بڑائی کے لیے نہیں

بلکہ انسانیت کی بہتری اور خدا کی خوشنودی کے لیے عنانِ حکومت ہا...

اجتماعی زندگی میں جتنے عوامل (FACTORS) انسان کے اخلاق و تمدن پر اثر انداز ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ قوی اور مؤثر عامل حکومت ہے حکومت کا نظام اگر غلط ہو اور اس کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو حاکمانہ طاقت کو اصلاح اور خدمت الناس کے بجائے فساد اور خدمتِ نفس کے لیے استعمال کرتے ہوں تو ایسی حالت میں کسی نیکی کا سرسبز ہونا، کسی اصلاحی کوشش کا بار آور ہونا اور کسی قسم کے اخلاقی محاسن کا پھیلنا پھولنا مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ حکومت طبعاً بدی و شرارت کی سرپرست ہوتی ہے اور نہ صرف خود بدکار ہوتی ہے بلکہ اس کی قوت تمام اخلاقی مفاسد کی آبیاری کرتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر حکومت ایک صحیح اور عادلانہ دستور و آئین پر قائم ہو، اس کا مقصد عبادت نظامِ عدل کا قیام ہو اور اس کے چلانے والے نیکوکار و پرہیزگار لوگ ہوں، جو اپنی قوت کو اپنی ذاتی یا طبقاتی یا قومی خواہشات کے حصول کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرتے ہوں تو اس کی اصلاحی قوت کا اثر صرف اسی دائرے تک

محدود نہ رہے گا جو حکومت سے بلا واسطہ تعلق رکھتا ہے، بلکہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تمام شعبے اس کے نیک اثرات کو قبول کریں گے۔ مذہب، معیشت، معاشرت، اخلاق، تہذیب، علوم و افکار، غرض ہر شعبے میں اصلاح کی تحریک بار آور ہوگی، اور بدکاری کی صرف روک تھام ہی نہ ہوگی بلکہ خود بدی کے چشمے بھی سوکھ جائیں گے۔ پس درحقیقت فتنہ و فساد کو مٹانے اور انسانی زندگی کو منکر سے پاک کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور مفید تدبیر یہی ہے کہ تمام مفسد حکومتوں کا استیصال کر دیا جائے اور ان کی جگہ ایسی حکومت قائم کی جائے جو اصول و عمل دونوں کے لحاظ سے نیکی اور نیکوکاری پر مبنی ہو۔

پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں حکم قتال کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا سے فتنہ و فساد کی آزادی چھین لی جائے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کو حقیقی اور انسانیت پرور آزادی عطا کی جائے۔ ایسی آزادی جو اخلاقی حدود کی پابندی پر مبنی ہو اور ناروا قید اور ناروا بے قیدی دونوں سے پاک ہو۔ اسلام کی تلوار صرف ظلم و سرکشی، اور فتنہ و فساد کے خلاف اٹھتی ہے۔ خواہ اس شیطانی قوت کا مدد گار مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ جب تک کوئی

جماعت اس قوت کا استعمال ترک نہیں کرتی اس کے ساتھ اسلام کی جنگ برابر جاری رہتی ہے۔ مگر جس لمحہ وہ اس گناہ عظیم کو ترک کر کے حق و انصاف کے قانون کی پابندی اختیار کر لیتی ہے، ٹھیک اسی لمحے سے اس کا خون حرام ہو جاتا ہے، اس کے مال اور اس کے آغراض کی حفاظت مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے، اور اسلام کی پُرامن حکومت میں اس کو پوری آزادی دی جاتی ہے کہ تمام جائز طریقوں سے اپنی دولت، اپنی صنعت و تجارت، اپنے علوم و آداب، اپنے تہذیب و تمدن، غرض اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرے، اور انسانیت کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچنے کے لیے جن جن وسائل کی ضرورت ہو انہیں آزادی کے ساتھ استعمال کرے۔ اس بارے میں اسلام کا قانون اہل ذمہ کو جو وسیع آزادی عطا کرتا ہے وہ دنیا کے قوانین میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اور قدرتی طور پر اس کا جواب ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ اسلام کے اور ان دنیوی قوانین کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ قوانین قیصریت کے اصول پر قائم ہیں۔ ان کے مطابق محکوم قوم حاکم جماعت کی ملکیت ہوتی ہے، اور حاکم کے لیے محکوم کے وسائل حیات ایک جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں جسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا اور محکوم کو اس کے فائدے سے محروم رکھنا اس کا "قدرتی" حق ہوتا ہے۔ اس لیے ان قوانین کی تنفیذ خواہ کتنی ہی فراخ دلی کے ساتھ ہو، بہرحال حاکم جماعت

کا مفاد محکوم جماعت کے حقیقی مفاد سے کبھی متحد نہیں ہو سکتا اور لازمی طور پر کمزور کا مفاد طاقتور کے مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی قانون کی بنیاد فلاح انسانیت کے اعلیٰ اور شریف مقصد پر رکھی گئی ہے۔ اس میں حاکم و محکوم کا تعلق صحیح معنوں میں خادم و مخدوم کا سا تعلق ہوتا ہے۔ حاکم کا مفاد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ محکوم کے اصلی و حقیقی مفاد کی ترقی کے لیے کوشش کرے۔ اس کو حکومت کا اختیار دیئے جانے کی غرض و غایت بھی یہ ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی کو تباہ کرنے والی برائیوں کے استیصال کی کوشش کرے، اور اسے انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچانے والی اچھائیوں کے عام کرنے میں اپنی تمام قوتوں کو استعمال کرے۔ پس اسلام کا حاکم اپنے محکوم کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے کے بعد اسے ہر قسم کی کامل آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ اس کے راستے میں اپنی یا اپنی جماعت کی اغراض کے لیے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرتا، بلکہ اسے ایک بلند درجے کا انسان بننے میں پوری مدد دیتا ہے۔

اسلام کسی نسل یا قوم یا وطن کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک قانونِ زندگی اور

ایک نظام حیات ہے جس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ عربی، عجمی، حبشی، چینی، ہندی، فرنگی سب اس کو اختیار کر سکتے ہیں، اور اختیار کر لینے کے بعد سب کے حقوق، اختیارات اور مراتب اس کے نظام اجتماعی میں یکساں قرار پاتے ہیں۔ اس کو انسان کی نسل یا رنگ، یا وطنیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ انسان کو محض انسان ہونے کی حیثیت سے خطاب کرتا ہے، اور اس کے سامنے زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ اور تنظیم حیات انسانی کا ایک قانون پیش کرتا ہے، جو اس کے نزدیک بہترین ہے۔ اس طریقے اور قانون کو جو کوئی اختیار کرلے وہ اسلامی حکومت میں برابر کا شریک ہے، اور اس کی شخصی قابلیت اسے خلیفہ و امام کے درجے تک بھی پہنچا سکتی ہے۔ جس طرح دنیا کی حکومتوں میں فرمانروائی کی قابلیت کا معیار سول سروس یا اسی قسم کا کوئی اور امتحان پاس کرنا ہے، اسی طرح اسلامی حکومت میں فرمانروائی اور منصب اصلاح و ہدایت کی اہلیت کا اصولی معیار اسلام کے نظام حیات کو اختیار کرنا اور اس کے قانونِ حق کی پابندی کرنا ہے۔ جو کوئی اس معیار پر پورا اترتا ہے وہ بلالحاظ نسل و رنگ اس منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے۔ اسلام میں نہ تو "حکومت قوم بر قوم دیگر" کا کوئی سوال ہے، اور نہ "حکومت قوم بر قوم خود" کا، بلکہ وہ "حکومت صالحہ" کا اصول پیش کرتا ہے، اور اس کے نزدیک

و صالح " اگر ایک حبشی غلام ہو تو کوئی چیز اسے شرفائے عرب پر حکومت کرنے سے نہیں روک سکتی۔

یہ واقعات قصہ و افسانہ نہیں، تاریخ کے مستند حقائق ہیں۔ انہیں دیکھ کر بتاؤ کہ دنیا میں اس سے بہتر حکومت کا کوئی اور بھی نمونہ موجود ہے؟ جن لوگوں کا آئین ملک داری اس تقویٰ و طہارت، اس خدا ترسی، اس بے نفسی و بے غرضی، اس حریت و مساوات، اس عدل و انصاف، اس وفائے عہد اور اس دیانت و امانت پر قائم ہو، کیا ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنا، یا بالفاظ صحیح تر دنیا کی خدمت کرنا، صرف انہی کا حق ہے؟ اگر انہوں نے روم کے سیہ کار و جفا پیشہ فرمانرواؤں کو روم کی حکومت سے بے دخل کر دیا، اگر انہوں نے آس پاس کی تمام شیطانی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے اور ان کی جگہ یہ منصفانہ حکومت قائم کی تو بتاؤ کہ یہ انسانیت پر ظلم تھا یا اس کی خدمت؟ ان کے مقابلے میں مغرب کے ان جھوٹے مدعیوں کی کیا وقعت ہے جن کو تقویٰ و پرہیزگاری سے واسطہ نہیں، وفائے عہد کی ہوا تک نہیں لگی، عدل و انصاف اور دیانت و امانت سے

بُعد تام ہے، اور بجز ملک گیری کی ہوس، مال و زر کی حرص، اور حصولِ اقتدار کی خواہش کے کسی اور جذبے سے آشنا نہیں ہیں۔

ہم کو تسلیم ہے کہ بعد کے زمانوں میں مسلمانوں کی اکثر حکومتوں کا عمل اس اصولِ جہانبانی کے مطابق نہیں رہا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ مگر یہ نقص اسلام کا نہیں، اس کے پیروؤں کا ہے۔ اسلام تو ایک قانون ہے جو قرآن اور سنت سے ماخوذ ہے۔ جو حکومت اس قانون کے مطابق عمل کرتی ہے وہ اسلامی حکومت ہے، اور جس کا عمل اس کے خلاف ہے وہ اسلامی حکومت نہیں ہے۔ ہمارے لیے مسلمان بادشاہوں کا عمل حجت نہیں ہے، بلکہ اسلام کا قانون حجت ہے۔ اس میں اگر کوئی نقص ہو تو اسے پیش کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام حکومت کے معاملے میں "قومی" اور "اجنبی" کی کوئی تمیز نہیں کرتا، بلکہ وہ "عدل" اور "ظلم" کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔ اگر ایک ملک کی حکومت خود اس کے اپنے باشندوں کے ہاتھ میں ہو، لیکن اس کے حکمران بدکار، ظالم، نفس پرست، اور نا خدا ترس ہوں تو اسلام کی نگاہ میں وہ اسی قدر نفرت کے قابل ہیں جس قدر ایک اجنبی حکومت کے ایسے ہی بدکردار

عمّال ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک عجمی عرب پر حکومت کرتا ہے اور تمام امور میں انصاف، امانت، دیانت، اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتا ہے مظلوموں کی داد رسی کرتا ہے، حق والوں کے حق دلواتا ہے، تکبر و تعلی نہیں کرتا نفس پرستی و خود غرض پرستی سے احتراز کرتا ہے، اور رعیت کی اصلاح حال کے سوا کسی اور ذاتی غرض کے لیے اپنی قوتوں کو استعمال نہیں کرتا، تو اسلام کے نزدیک عرب کے لیے وہ عجمی اس عربی حکمراں سے بہتر ہے جو ان صفات سے عاری ہو۔ یہ خیال کہ ظالم عرب عربوں کے لیے عادل عجمی سے بہتر ہے، اور ترک خواہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو مگر صرف اس لیے کہ وہ ترک ہے عراقی اسے قبول نہیں کر سکتے، ایک ایسا خیال ہے جسے اسلام اصلاً غلط اور کلیتہً باطل سمجھتا ہے۔ اس معاملے کو وہ "قومیت" اور "وطنیت" کی نظر سے نہیں بلکہ خالص "انسانیت" کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ "صالح" انسان بہر حال "غیر صالح" کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے، اور انسانی خوبیوں میں اپنے اور پرائے، وطنی اور اجنبی، ہندی و عراقی، زنگی و فرنگی، کالے اور گورے کی تمیز کو دخل دینا اندھا تعصب ہے۔

اسلام کے اس عقیدے کے مطابق حکومت کی اچھائی کا معیار نہ اس کا

قومی اور خود اختیاری ہونا ہے، اور نہ اس کی برائی کا معیار اجنبی یا غیر خود اختیاری ہونا۔ اصل سوال صرف یہ ہے کہ حکومت کا نظام عادلانہ اور حق پرستانہ ہے یا نہیں؟ اگر پہلی صورت ہے تو اسلام اس کو مٹانے کی کوشش تو درکنار ایسے ارادوں کو بھی گناہ اور ظلم عظیم سمجھتا ہے۔ لیکن دوسری صورت میں وہ ایک ظالمانہ نظام حکومت کو مٹا کر ایک سچا عادلانہ نظام حکومت قائم کرنا اولین فرض قرار دیتا ہے۔ قومی اور اجنبی کے سوال سے اس نے نفیاً یا اثباتاً کوئی تعرض نہیں کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نزدیک حکومت کے اچھے یا برے ہونے کے سوال پر اس کے قومی ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر قومی حکومت عموماً ظالم و جابر ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک قوم دوسری قوم پر حکومت قائم ہی اس لیے کرتی ہے کہ اسے غلام بنا کر اپنی مصلحت کے لیے استعمال کرے۔ اور اس کے برعکس قومی حکومت میں اصلاح پذیری کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی حکومت ہر حال میں بہتر ہو، اور غیر قومی حکومت کسی حال میں عادل نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک قوم پر خود اس کے اپنے سرکش افراد شیطان کی طرح مسلط ہو جائیں اور اسے اپنی شخصی اغراض کا غلام بنا کر تباہ و برباد کر دیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قوم کو غیر قوم کے نیک نفس اور بے غرض مصلحین ظلم و استبداد کے پنجے سے رہائی دلائیں

اور اس کے لیے مادی اور اخلاقی ترقی کی راہیں کھول دیں۔ پس حکومت کی خوبی کا اصلی معیار اس کا "عادل و صالح" ہونا ہے اور اس کی برائی کا اصلی معیار غیر عادل و غیر صالح ہونا۔

---

(۳)

۱۹۴۳ء ـــــ ۱۹۴۴ء

لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے اس کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوارِ معاشرت، اندازِ تمدن اور طرزِ سیاست کا، مگر حقیقت میں یہ نفسِ تہذیب نہیں ہیں۔ تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں تہذیب کی اصل نہیں ہیں۔ شجرِ تہذیب کے برگ و بار ہیں۔ کسی تہذیب کی قدر و قیمت ان ظاہری صورتوں اور نمائشی ملبوسات پر متعین نہیں کی جا سکتی۔ ان سب کو چھوڑ کر ہمیں اس کی روح تک پہنچنا چاہیے اور اس کے اساسی اصول کا تجسس کرنا چاہیے۔

پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دنیوی

زندگی کے متعلق اس کا تصور کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی کیا حیثیت قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ اور انسان اس دنیا کو برتتے تو کیا سمجھ کر برتتے؟ — یہ تصور کا سوال ایسا اہم سوال ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے، اور اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔

دوسرا سوال جو تصورِ حیات سے گہرا تعلق رکھتا ہے زندگی کے نصب العین کا سوال ہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ساری تگ و دو، یہ تمام کشمکش، یہ سب جد و جہد اور محنت و مشقت آخر کس لیے ہے؟ وہ کیا چیز مطلوب ہے جس کی طرف آدمی کو دوڑنا چاہیے؟ وہ کونسا مطمحِ نظر ہے جس تک پہنچنے کے لیے ابنِ آدم کو کوشش کرنی چاہیے؟ اور وہ کونسا منتہا ہے جسے انسان کو اپنی ہر سعی اور اپنے ہر عمل میں پیشِ نظر رکھنا چاہیے؟ — یہی مقصود و مطلوب کا سوال انسان کی عملی زندگی کا رخ اور اس کی رفتار متعین کرتا ہے، اور اسی کے مطابق عمل کے طریقے اور کامیابی کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ زیرِ بحث تہذیب میں انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر کی گئی ہے؟ انسان کی ذہنیت کو وہ کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟ انسان کے دل و دماغ میں کس قسم کے تخیلات جاگزیں کرتی ہے؟ اور اس میں وہ کون سے ذہنی محرکات ہیں جو اُس کے نصب العین کے مطابق انسان کو ایک مخصوص قسم کی زندگی کے لیے ابھارتے ہیں؟ -

---

یہ بات کسی بحث کی محتاج نہیں ہے کہ انسان کے قوائے عمل اس کے قوائے فکر کے تابع ہیں۔ اس کے دست و پا کو جو روح حرکت دیتی ہے وہ اس کے دل و دماغ سے آتی ہے۔ دل و دماغ پر جو عقیدہ، جو تخیل، جو متفکرہ پوری قوت کے ساتھ مسلط ہوگا، عملی قوتیں اسی کے زیرِ اثر حرکت کریں گی۔ ذہن جس سانچے میں ڈھلا ہوا ہوگا اسی کے مطابق جذبات، حسیات اور داعیات پیدا ہوں گے، اور انہی کی اتباع میں اعضاء و جوارح کام کریں گے۔ پس دنیا کی کوئی تہذیب ایک اساسی عقیدے اور ایک بنیادی متخیلے کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی، اور اس بنا پر ہر تہذیب کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت جانچنے کے لیے اس عقیدے اور متخیلے کو سمجھنا اور اس کے حسن و قبح کو جانچنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی عمارت کی مضبوطی و پائیداری کا حال معلوم کرنے کے لیے

یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کی بنیادیں کتنی گہری اور کتنی مضبوط ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت ایک انسان کے کس طرح کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت ہے جس سے وہ انسان کو اپنے نظریے کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کرتی ہے؟ وہ کونسے خصائل، اوصاف اور نفسی خصائص ہیں جنہیں وہ انسان میں پیدا کرنے اور نشوونما دینے کی کوشش کرتی ہے؟ اور اس کی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا انسان بنتا ہے؟ گو تہذیب کا اصل مقصود نظام اجتماعی کی تعمیر ہے لیکن افراد ہی وہ مسالہ ہیں جن سے جماعت کا قصر بنتا ہے، اور اس قصر کا استحکام اس پر منحصر ہے کہ اس کے کسی حصے میں ناکارہ، کچا اور بے جان مسالہ استعمال نہ کیا جائے۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق، اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے کس طرح قائم کیا گیا ہے؟ اس کے تعلقات

اُس کے خاندان، اس کے ہمسایوں، اُس کے دوستوں، اس کے ساتھ معاملہ کرنے والوں، اُس کے ساتھ رہنے اور بسنے والوں، اُس کے ماتحتوں، اس کے بالادستوں، خود اس کی اپنی تہذیب کے پیروؤں، اور اس تہذیب کی پیروی نہ کرنے والوں کے ساتھ کس قسم کے رکھتے ہیں؟ اس کے حقوق دوسروں پر اور دوسروں کے حقوق اس پر کیا قرار دیتے ہیں؟ اس کو کن حدود کا پابند کیا ہے؟ اس کو آزادی دی ہے تو کس حد تک؟ اور مقید کیا ہے تو کس حد تک؟ اس سوال کے ضمن میں اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست، اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں اور اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زیرِ بحث تہذیب، خاندان، سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے۔

تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کی تکوین پانچ عناصر سے ہوتی ہے:

- دنیوی زندگی کا تصور۔
- زندگی کا نصب العین۔
- اساسی عقیدہ
- انفرادی تربیت

۵۔ نظامِ اجتماعی۔

دنیا کی ہر تہذیب انہی پانچ عناصر سے بنی ہے اور اسی طرح اسلامی تہذیب کی تکوین بھی انہی سے ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تصور، اپنے جزئیات کے ساتھ، ہر مسلمان کے ذہن میں حاضر نہیں ہے، اور نہ اہلِ علم کے مخصوص گروہ کے سوا کوئی ان جزئیات کا واضح ادراک رکھتا ہے، لیکن چونکہ یہ تصور اسلامی تہذیب کی بیخ و بنیاد میں متمکن ہے، اس لیے مسلمان کی سیرت اپنی اصلی شان اور اپنی حقیقی خصوصیات سے بہت کچھ عاری ہو جانے کے باوجود آج بھی اس کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ ایک مسلمان، جس نے اسلامی تہذیب کے ماحول میں تربیت پائی ہو، اس کا عمل خواہ بیرونی اثرات سے کتنا ہی ناقص ہو گیا ہو لیکن خودداری اور عزتِ نفس کا احساس، خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنا، خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنا، خدا کے سوا کسی کو اپنا مالک اور آقا نہ سمجھنا، دنیا میں اپنے آپ کو شخصاً مسئول سمجھنا، دنیا کو دارالعمل اور آخرت کو دارالجزا سمجھنا، صرف اپنے ذاتی اعمال کے حسن و قبح پر اپنی آخرت کی کامیابی و ناکامی کو منحصر سمجھنا، دنیا اور اس کی دولت و لذت کو ناپائدار

اور صرف اپنے اعمال اور ان کے نتائج کو باقی و دائم خیال کرنا، یہ ایسے امور ہیں جو اس کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہوں گے اور ایک عمیق النظر مبصر اس کی باتوں اور اس کی حرکات و سکنات میں اس عقیدے کے اثرات کو خواہ وہ کتنے ہی دھندلے کیوں نہ ہوں صاف محسوس کریگا جو اس کی روح اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے۔

جو شخص تہذیب اسلامی کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اسے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوگی کہ اس میں جب تک خالص اسلامیت رہی اس وقت تک یہ خالص عملی تہذیب تھی۔ اس کے پیروؤں کے نزدیک دنیا آخرت کی کھیتی تھی، اور وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ دنیا میں جتنی مدت وہ زندہ رہیں اس کا ہر لمحہ اس کھیتی کے بونے اور جوتنے میں صرف کردیں اور زیادہ سے زیادہ تخم ریزی کریں تاکہ بعد کی زندگی میں زندگی میں زیادہ سے زیادہ فصل کاٹنے کا موقع ملے۔ انہوں نے رہبانیت اور لذتیت کے درمیان ایک ایسی معتدل اور متوسط حالت میں دنیا کو برتا جس کا نام و نشان بھی ہم کو دوسری تہذیب میں نظر نہیں آتا۔ خلافت الٰہی کا تصور ان کو دنیا میں پوری طرح منہمک ہونے اور اس کے معاملات کو

انتہائی سرگرمی کے ساتھ انجام دینے پر اُبھارتا تھا، اور اس کے ساتھ مسئولیت اور ذمہ داری کا خیال انہیں حد سے متجاوز بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ نائبِ خدا ہونے کی وجہ سے انتہا درجے کے خوددار تھے، اور پھر یہی تصور ان میں تکبّر اور غرور کی پیدائش کو روکتا بھی تھا۔ وہ خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے ان تمام چیزوں کی طرف رغبت رکھتے تھے جو دنیا کا کام چلانے کے لیے ضروری ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ان چیزوں کی طرف ان کو کوئی رغبت نہ تھی جو دنیا کی لذتوں میں گم کر کے انسان کو اس کے فرائض سے غافل کر دینے والی ہیں۔ غرض وہ دنیا کے کام کو اس طرح چلاتے تھے کہ گویا ان کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے، اور پھر اس کی لذتوں میں منہمک ہونے سے اس طرح بچے رہتے تھے کہ گویا یہ دنیا ان کے لیے ایک سرائے ہے یہاں محض عارضی طور پر وہ مقیم ہو گئے ہیں۔

بعد میں جب اسلامیت کا اثر کم ہو گیا اور وہ دوسری تہذیبوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی سیرت میں پوری اسلامی شان باقی نہیں رہی تو انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو دنیوی زندگی کے اسلامی تصور کے خلاف تھا۔ عیش و عشرت میں منہمک ہوئے، عالی شان قصر تعمیر کیے۔ موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور

دوسرے فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لی، معاشرت اور طرزِ بود و ماند میں اس اسراف اور اس شان و شکوہ کو اختیار کیا جو اسلامی مذاق کے بالکل خلاف تھی، اور حکومت و سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات میں وہ طریقے اختیار کر لیے جو بالکل غیر اسلامی تھے، مگر اس کے باوجود دنیوی زندگی کا اسلامی تصور جو ان کے دل میں اترا ہوا تھا کہیں نہ کہیں اپنا اثر نمایاں کر کے رہتا تھا، اور یہی اثر ان کے اندر دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیازی شان پیدا کر دیتا تھا۔ ایک مسلمان بادشاہ جمنا کے کنارے ایک عالی شان قصر تعمیر کرتا ہے اور اس میں لطف و تفریح اور شان و شوکت کے وہ تمام سامان فراہم کرتا ہے جن کا انسان اس زمانے میں تصور کر سکتا تھا، مگر اس قصر کی سب سے زیادہ پُرلطف تفریح گاہ میں پشت کی جانب اپنے قبلے کے رُخ پر یہ رباعی بھی کندہ کرتا ہے:

اے بندِ بپای و قفل بر دل ہشدار
وے دوختہ چشم و پاے در گل ہشدار
عزمِ سفرِ مغرب و رہ در مشرق
اے راہ روِ پشت بمنزل ہشدار

وہ قصر اپنی جگہ بے نظیر نہیں ہے۔ اس سے بہتر قصر دنیا کی دوسری قوموں میں مل سکتے ہیں۔ مگر اس تخیل کی مثال کسی قوم میں نہیں مل سکتی جو روئے زمین پر فردوس بنانے والے کو "اے راہ روِ پشت بمنزل ہشدار" کی

تنبیہ کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بکثرت ملیں گی کہ قیصر و کسریٰ کے نمونوں پر بادشاہی کرنے والوں نے بھی جب کسی دشمن پر فتح پائی تو اپنی کبریائی کا اظہار کرنے کے بجائے خدائے واحد کے سامنے خاک پر سربسجود ہو گئے۔ بڑے بڑے جابر و گردن کش فرمانرواؤں نے جب شریعتِ اسلامی کے خلاف عمل کرنا چاہا تو کسی بندۂ خدا نے ان کو برملا ٹوک دیا اور وہ خوفِ خدا سے کانپ اٹھے۔ انتہا درجے کے بدعمل اور سیاہ کار لوگوں کو کسی ایک معمولی بات سے تنبیہ ہو گئی اور دفعتہً ان کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ دولتِ دنیا پر جان فدا کرنے والوں کے دل میں دنیا کی ناپائداری اور آخرت کے حساب کتاب کا خیال آیا اور انہوں نے خدا کے بندوں پر سب کچھ تقسیم کر کے ایک فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ غرض ان تمام غیر اسلامی اثرات کے باوجود جو مسلمانوں کی زندگی میں پھیل گئے ہیں، آپ کو ہر قدم پر ان کی قومی سیرت میں اسلامی تصور کا جلوہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گا، اور اس کو دیکھ کر آپ ایسا محسوس کریں گے کہ گویا اندھیرے میں دفعتاً روشنی نمودار ہو گئی ہے۔

انسان کے ارادوں اور اس کی عملی کوششوں کا رُخ فطری طور پر اسی منتہا اور اسی مقصود کی طرف پھرتا ہے جس کو اس نے اپنا نصب العین اور مطمح نظر قرار دیا ہے۔ اسی کے صحیح یا غلط ہونے پر ذہنیت کی اچھی یا بُری تشکیل اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی درستی یا نادرستی کا انحصار ہے۔ اسی کے بلند یا پست ہونے پر افکار و تخیلات کی بلندی و پستی، اخلاق و آداب کی فضیلت و رذیلت اور معیشت و معاشرت کی رفعت و دنائت کا مدار ہے۔ اسی کے واضح اور متعین ہونے پر یا نہ ہونے پر انسان کے ارادوں اور خیالات کا مجتمع یا پراگندہ ہونا، اس کی زندگی کے معاملات کا ہموار یا ناہموار ہونا اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا ایک راہ میں صرف ہونا یا مختلف راہوں میں منتشر ہو جانا موقوف ہے۔ بالجملہ نصب العین ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت انسان فکر و عمل کی بہت سی راہوں میں سے کوئی ایک راہ انتخاب کرتا، اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں اور اپنے مادی و روحانی وسائل کو اسی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب ہم "تہذیب" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد افراد کی شخصی تہذیب نہیں ہوتی، بلکہ ان کی اجتماعی تہذیب مراد ہوتی ہے اس لیے

ہر فرد کا شخصی نصب العین، تہذیب کا نصب العین نہیں ہو سکتا لیکن برعکس اس کے یہ لازم ہے کہ ایک تہذیب کا جو نصب العین ہو وہ اس تہذیب کے متبعین میں سے ہر ہر فرد کا نصب العین ہو، عام اس سے کہ ہر فرد کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اس لحاظ سے تہذیب کا نصب العین وہ ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کی ایک بڑی جماعت کا مشترک اجتماعی نصب العین بن گیا ہو، اور اس نے افراد کے شخصی نصب العین پر اتنا غلبہ پا لیا ہو کہ ہر فرد بجائے خود وہی نصب العین رکھتا ہو جو پوری جماعت کے پیش نظر ہے۔

اس قسم کے اجتماعی نصب العین کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ وہ افراد کے شخصی نصب العین سے کامل موافقت یا مناسبت رکھتا ہو، اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ معاً انفرادی اور اجتماعی نصب العین بن سکے۔ اس لیے کہ اگر اجتماعی نصب العین افراد کے شخصی نصب العینوں سے منافات کی نسبت رکھتا ہو تو اولاً اس کا اجتماعی نصب العین بننا ہی مشکل ہو گا، کیونکہ جس خیال کو افراد فرداً فرداً قبول نہ کریں وہ اجتماعی خیال نہیں بن سکتا۔ اور اگر کسی زبردست اثر کے تحت وہ اجتماعی نصب العین بن بھی گیا تو فرد کے نصب العین اور جماعت کے نصب العین میں غیر محسوس طور پر

ایک کشمکش برپا رہے گی، تاآنکہ اس غالب اثر کے کمزور ہوتے ہی افراد اپنے اپنے نصب العین کی طرف پھر جائیں گے، جماعت کا نصب العین باطل ہو جائے گا، ہیئت اجتماعی کی قوت جاذبہ و رابطہ فنا ہو جائے گی اور تہذیب کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ اس لیے تہذیب کا صحیح نصب العین وہی ہو سکتا ہے جو حقیقۃً انسان کا فطری نصب العین ہو، اور ایک تہذیب کی اصلی خوبی یہی ہے کہ وہ ایسا اجتماعی نصب العین پیش کرے جو بعینہٖ انفرادی نصب العین بھی بن سکتا ہو۔

نصب العین کا سوال درحقیقت تصورِ حیات کے سوال سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ہم دنیوی زندگی کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں، اور دنیا میں اپنی حیثیت، اور اپنے لیے دنیا کی حیثیت کا جو نظریہ ہمارے ذہن میں ہے وہی فطری طور پر زندگی کا ایک نصب العین پیدا کر دیتا ہے اور ہم اپنی تمام قوتیں اسی نصب العین کے تحقق کی راہ میں صرف کرنے لگتے ہیں۔

اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور روئے زمین پر اس کا نائب قرار

دیلہ ہے تو اس تصورِ حیات سے جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے، اس تک آپ کی عقل خود بخود پہنچ جائے گی۔ ایک نائب کا بحیثیت نائب ہونے کے اس کے سوا اور کیا نصب العین ہونا چاہیے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے، اور اس کی نظر میں ایک اچھا، وفادار، متدین اور فرض شناس ملازم قرار پائے؟ اگر وہ کوئی سچا اور نیک نیت آدمی ہے تو کیا وہ اپنے آقا کی خدمت بجالانے میں اس کی رضاجوئی کے سوا کسی اور چیز کو اپنا مقصود بنا سکتا ہے؟ کیا وہ اپنا فرض اس لیے بجالائے گا کہ اس کے معاوضے میں اس کو کسی نفع کی طمع اور کسی ترقی یا انعام یا اضافۂ مناصب یا جاہ و منزلت کی زیادتی کا لالچ ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ آقا اس سے خوش ہو کر اسے یہ سب کچھ عطا کر دے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آقا اس کو حسنِ خدمت کے صلے میں ان چیزوں کے بخش دینے کی امید دلائے، اور اس میں بھی مضائقہ نہیں کہ خود اس کو یہ علم ہو کہ اگر میں نے ٹھیک طور سے فرائض انجام دے کر اپنے آقا کو خوش کر دیا تو وہ مجھے یہ یہ انعام دے گا، لیکن اگر اس نے "انعام" کو اپنا "مقصود" بنا لیا، اور اپنے فرائض منفعت کی خاطر انجام دیئے، تو کیا کوئی دانشمند ایسے ملازم کو ایک فرض شناس ملازم کہہ سکتا ہے؟ —— اسی مثال پر خدا اور اس کے نائب کے معاملے کو بھی قیاس کر لو۔ اگر انسان روئے زمین پر خدا کا

نائب ہے تو اس کی زندگی کا نصب العین خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؟

اسلام نے ہر قسم کی دنیوی اور اُخروی اغراض کو چھوڑ کر ایک چیز کو زندگی کا نصب العین اور انسان کی تمام کوششوں کا مقصود، اور تمام ارادوں اور نیتوں کی غایت الغایات قرار دیا ہے، اور وہ چیز اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کا حصول ہے۔

تمام موجوداتِ عالم کا (جن میں انسان بھی شامل ہے) فطری نصب العین اور مقصود و مطلوب اور غایت الغایات، حضرت حق جل شانہٗ کی ذات ہے، اور سب کی طبیعت کا رُخ اسی مرکز و مرجع کی طرف پھرا ہوا ہے۔ اب انسان کے لیے بحیثیت ایک عقلی وجود کے، صرف اتنی کسر رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس طبیعی نصب العین کا شعور بھی حاصل کر لے، اور عقل و فکر کے ساتھ اس کو سمجھ کر اپنے ارادوں اور اپنی نیتوں اور اپنی سعی و عمل کا رُخ بھی اسی کی طرف پھیر دے۔ اس صورت میں اس کا عقلی نصب العین، اس کے

اور تمام موجودات کے طبیعی نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گا۔ جہاں ہستی کے سارے لشکر اور نظامِ وجود کے سب کل پرزے اس مقصد تک پہنچنے میں اس کا ساتھ دیں گے اور وہ اپنے عقلی مرتبے کے لحاظ سے اس عظیم الشان قافلے کا سالار و امام ہو گا۔ برعکس اس کے اگر اس نصب العین کو چھوڑ کر اس نے کسی اور چیز کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اس کی مثال ایسی ہو گی جیسے کوئی شخص ایک قافلے کے ساتھ ہے۔ قافلہ مغرب کی جانب سفر کر رہا ہے۔ وہ شخص خود جس گھوڑے پر سوار ہے وہ بھی مغرب کی جانب دوڑ رہا ہے لیکن اس بے ہوش مسافر کو خبر نہیں کہ قافلے کا رخ، اور اس کی اپنی سواری کا رُخ کدھر ہے۔ اس کا دل مشرق میں اٹکا ہوا ہے۔ اس نے اپنے گھوڑے کی دم کی طرف منہ کر رکھا ہے۔ لگام کھینچ کھینچ کر اور ایڑیں لگا لگا کر کوشش کر رہا ہے کہ گھوڑا الٹے پاؤں چلے۔ چند قدم وہ گھوڑے کو پیچھے کی طرف کھینچ بھی لاتا ہے۔ مگر پھر قافلے کی روش اور خود اپنی طبیعی روش سے مجبور ہو کر گھوڑا اسی مغربی سمت میں دوڑنے لگتا ہے۔ غرض اس طرح یہ مسافر کشاں کشاں، اپنی نیت اور ارادے کے خلاف، اسی منزل کی طرف جانے پر مجبور ہوتا ہے، مگر ایک کامیاب اور بامراد مسافر کی طرح نہیں بلکہ ایک ناکام و نامراد مسافر کی طرح، کیونکہ اس نے جس چیز کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا ہے اس تک پہنچنا اسے نصیب نہیں ہوتا اور وہ ان فوائد سے بھی متمتع نہیں ہوتا جو اس قافلے کو اپنے سفر کے دوران

ہیں حاصل ہوتے ہیں۔

اسلام میں جو کچھ بھی ہے خدا کے لیے ہے۔ نماز اگر خدا کے لیے نہیں تو وہ ایک بے معنی اٹھک بیٹھک ہے۔ روزہ اگر خدا کے لیے نہ ہو تو وہ محض ایک فاقہ ہے۔ زکوٰۃ اور خیرات اگر خدا کے لیے ہو تو خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ ہے ورنہ محض اسراف و تبذیر۔ جنگ اور جہاد اگر خالصتہً للہ اور فی سبیل اللہ ہو تو بہترین عبادت ہے ورنہ ایک ناحق خونریزی اور جہاد فی سبیل الطاغوت۔ اسی طرح دوسرے تمام اعمال، جن کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے، اگر خدا کے لیے کیے جائیں تو وہ نیک اور قابلِ اجر ہیں۔ ورنہ بے فائدہ اور بے نتیجہ۔ اور جن سے اسلام نے منع کیا ہے اگر ان سے اجتناب خدا کی خوشنودی کی خاطر کیا جائے تو نتیجہ ہے ورنہ قطعاً لاحاصل۔

جس شخص کے پیشِ نظر محض اپنی طبیعی خواہشات کی تسکین، یا نفسانی اغراض کی تحصیل، یا روحانی مقاصد کی تکمیل ہو۔ اسے کبھی فکر و عمل کی یکسوئی میسر نہیں آسکتی کیونکہ عقلی و ذہنی ارتقاء اور نظری و عملی انکشافات کے ہر مرحلے پر اس کے

اندر نئی خواہشیں اور نئی رغبتیں پیدا ہوں گی، اور وہ نئی نئی چیزوں کو اپنی غایت اور اپنا مقصد قرار دے گا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ علم و عقل کے کسی اونچے مرحلے پر پہنچ کر انسان انہی طبیعی رغبات اور نفسانی و روحانی طلبات پر جما رہے جو اس سے پہلے کے پست تر مرحلے میں اس کے لیے جاذب نظر اور محرک عمل تھے۔ اس طرح انسان کی تمام زندگی ایک مقصد سے دوسرے مقصد کی طرف انتقال میں بسر ہو جائے گی، اور کبھی کوئی ایسا مرکزی تخیل اس کے ذہن میں جاگزیں نہ ہو سکیگا جو اس کے افکار میں کامل یکسوئی پیدا کر دینے والا ہو، اور جس کی راہ میں وہ اپنی تمام فکری اور عملی قوتیں صرف کر سکتا ہو۔ یہ خوبی صرف اسلامی نصب العین ہی میں ہے کہ وہ ہر مرتبہ علمی و عقلی میں انسان کا واحد نصب العین بن سکتا ہے، اور کسی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبے پر بھی پہنچ کر اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آتی کیونکہ ہم جتنے عقلی اور علمی مراتب کا تصور کر سکتے ہیں خدا کی ذات ان سب سے اعلیٰ و ارفع ہے، اور اس کے باوجود ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبے سے لے کر بلند سے بلند مرتبے تک ہر ایک کے ساتھ اس کا تعلق یکساں ہے۔ اگر فرق ہے تو وہ محض ہمارے تعقل و شعور کے مراتب کے لحاظ سے ہے۔

پھر جس طرح یہ نصب العین ایک فرد کا نصب العین بن سکتا ہے، اسی طرح

ایک جماعت، ایک قوم، بلکہ تمام نوعِ بشری کا نصب العین بھی بن سکتا ہے اس میں سرے سے نفسانیت اور انفرادی یا اجتماعی خود غرضی کا وہ عنصر ہی موجود نہیں ہے جس کی طبیعی خاصیت یہ ہے کہ انسانیت کو نسلوں اور قوموں میں اور پھر افراد و اشخاص میں تقسیم کر دے اور ان کے اندر ایک دوسرے کے خلاف مقابلہ و مزاحمت، اور بغض و حسد کے جذبات ابھارتا ہے۔ برعکس اس کے یہ نصب العین انسان کو اس ہستی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے جس کے ساتھ تمام نوعِ بشری، بلکہ تمام کائنات کا تعلق یکساں ہے اور جس کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد ہر جہت اور ہر حیثیت سے انسانی مقاصد میں ایسا اشتراک و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگوں میں مقابلہ و مزاحمت تو درکنار، تعاون اور موالات، اخوت اور بھائی چارے کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نسل، رنگ، زبان، اور جغرافی حدود کے امتیازات مٹا کر ایک عالمگیر قومیت کی تعمیر، اور ایک بین الاقوامی شیرازہ بندی کے لیے جس مرکزی تخیل کی ضرورت ہے، وہ اس نصب العین میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس قسم کی جہانگیر تہذیب کے لیے اس سے بہتر نصب العین اور کوئی نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ وہ ایک طرف فرد کی انفرادیت کو بالکل فنا بھی نہیں کرتا، اور دوسری

انفرادیت کے تمام دافع المرکز میلانات کو مٹا کر اسے ایک خالص بشری اجتماعیت میں پوری طرح ضم کر دیتا ہے۔

جب تک کوئی جماعت "مدنیت" کے ابتدائی مدارج میں ہوتی ہے اور زندگی کے حیوانی طبیعی مقاصد سے اعلیٰ و ارفع کوئی مقصد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا، وہ اپنے طور طریقوں میں اسی طرح آزاد رہتی ہے جس طرح ایک بے مقصد انسان ہوا کرتا ہے۔ مگر جب ارتقائے عقلی اور نہضت مدنی کے زیادہ اونچے مدارج پر پہنچ کر اس میں ایک تہذیب پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ تہذیب اس کے لیے اجتماعی زندگی کا کوئی عقلی مقصد متعین کر دیتی ہے تو یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس مقصد کی مناسبت سے عقائد، تصورات، معاملات، اخلاق، معاشرت، معیشت وغیرہ کے لیے ایک خاص نظام وضع کیا جائے۔ وہ تہذیب اپنے متبعین کو اس نظام کا پابند بنائے اور ان کے لیے اس امر کی آزادی باقی نہ رہنے دے کہ وہ اس کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی ایسے عقیدے یا طرز عمل کو اختیار کریں جو اس نظام سے خارج ہو۔

اپنے اس ضابطہ کی حفاظت میں سختی کرنا تہذیب کی فطرت کا عین مقتضا ہے۔ اس باب میں جس تہذیب کی گرفت ڈھیلی ہوگی، اور جس کی قوت ضابطہ میں ضعف اور سستی پائی جائے گی وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ تہذیب کا وجود منحصر ہے اس پر کہ عقیدہ اور عمل کا جو نظام اس نے وضع کیا ہے، اس کے متبعین اس کی پابندی کریں۔ جب متبعین میں اس کی پابندی ہی نہ ہوگی اور اس نظام سے باہر کے تصورات اور طور طریقے ان کے ذہن اور ان کی عملی زندگی پر قابض ہو جائیں گے تو تہذیب کا کوئی داخلی وجود باقی نہ رہے گا۔ لہٰذا ایک تہذیب اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے اور دوسرے خارجی نظامات سے علیحدگی پر اصرار کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کو ایک بالکل جداگانہ اور مخصوص تہذیب بناتے ہیں اس کے نصب العین کا کیا حصہ ہے؟ پچھلے مباحث میں یہ بات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام نے زندگی کا جو نصب العین مقرر کیا ہے وہ دوسرے ادیان اور دوسری تہذیبوں کے نصب العین سے اصلاً مختلف ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ مقصد کے اختلاف سے اعتقاد و عمل کے نظام میں بنیادی

اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ اسلام کے نصب العین نے اس کو ایک ایسی مخصوص تہذیب بنا دیا ہے جو بنیادی طور پر دوسری تہذیبوں سے مختلف ہے، اور جس کا اعتقادی و عملی نظام، دوسرے نظامات سے اساسی اختلاف رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس نظام کے بعض اجزاء دوسرے نظامات میں بھی پائے جاتے ہوں، لیکن یہاں وہ اجزاء بعینہٖ اس حیثیت سے مندرج نہیں ہیں جس حیثیت سے وہ دوسرے نظامات میں مندرج ہیں کسی نظام میں مندرج ہونے کے بعد جز اپنی شخصی طبیعت کو گم کر کے کل کی طبیعت اختیار کر لیتا ہے، اور جب ایک کل کی طبیعت دوسرے کل سے مختلف ہو تو لازماً اس کے ہر جز کی طبیعت بھی دوسرے کے ہر جز کی طبیعت سے مختلف ہوگی۔ خواہ اس کے بعض اجزاء اپنی ظاہری شکل میں دوسرے کے بعض اجزاء سے کتنی ہی مشابہت رکھتے ہوں۔

جس طرح اس نے (اسلام نے) عقائد اور اعمال کی بنا پر انسانوں کے درمیان "کفر" اور "ایمان" کا امتیاز قائم کیا ہے، اسی طرح زندگی بسر کرنے کے طریقوں اور دنیا کی تمام چیزوں کے درمیان بھی اس نے "حرام" اور "حلال"، "جائز اور ناجائز"، "مکروہ" اور "مستحسن" کا امتیاز قائم کیا ہے۔ جو اعمال اور طور طریقے اس مقصد کی تحصیل اور فرائض خلافت کی بجا آوری میں مددگار ہیں وہ اپنے

درجے کے لحاظ سے مستحسن ہیں، یا حلال ہیں، یا جائز، اور جو اس میں مزاحم اور مانع ہیں وہ اپنے مرتبے کے لحاظ سے مکروہ ہیں، یا ناجائز ہیں، یا حرام۔ جو مومن اس خط امتیاز کا احترام کرے وہ "متقی" (پرہیزگار) ہے اور جو اس کا احترام نہ کرے وہ "فاسق" (حدود سے نکل جانے والا) ہے۔ اللہ کی پارٹی کے لوگوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز مال و دولت، یا حسب و نسب، یا مراتب معاشرت، یا رنگ کی سیاہی و سپیدی پر نہیں ہے۔ بلکہ صرف "تقویٰ" کی بنا پر ہے۔

اس طرح تصورات و افکار، اخلاق و خصائل، معیشت و معاشرت، تمدن و عمران، سیاست و حکومت، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب کا راستہ دوسری تہذیبوں کے راستے سے الگ ہو جاتا ہے۔ زندگی کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسری تہذیبوں کے نظریہ سے الگ ہے۔ زندگی کا مقصد اسلام کے نزدیک اس مقصد سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے متعین کیا ہے۔ لہٰذا اسلام اپنے نظریہ کے مطابق دنیا اور مافیہا سے جو معاملہ کرتا ہے، اور اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے دنیوی زندگی میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ بھی بنیادی طور پر اس معاملہ اور اس طریقہ سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے اختیار کیا ہے۔ ذہن کے بہت سے افکار و تصورات نفس کے بہت سے رجحانات و میلانات اور زندگی بسر کرنے کے بہت سے

طریقے ایسے ہیں جن کا اتباع دوسری تہذیبوں کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات لازمۂ تہذیب ہے۔ مگر اسلام ان کو ناجائز، مکروہ اور بعض حالات میں حرام قرار دینے پر مجبور ہے۔ اس لیے کہ وہ ان تہذیبوں کے تصورِ حیات سے عین مطابقت رکھتے ہیں اور ان کے مقصدِ زندگی کی تحصیل میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، مگر اسلام کے تصورِ حیات سے ان کا کوئی لگاؤ نہیں، اور اس کے مقصدِ زندگی کی تحصیل میں وہ مانع ہیں۔ مثال کے طور پر فنونِ لطیفہ دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں جانِ تہذیب ہیں۔ اور ان فنون میں اعلیٰ مہارت رکھنے والوں کو قومی ہیرو کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اسلام ان میں سے بعض کو حرام بعض کو مکروہ اور بعض کو ایک حد تک جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے قانون میں ذوقِ لطیف کی پرورش، اور جمالِ مصنوعی سے لطف اندوزی کی اجازت صرف اس حد تک ہے جہاں انسان اس کے ساتھ ساتھ خدا کو یاد رکھ سکے۔ اس کی رضا جوئی کے لیے عمل کر سکے۔ اپنے منصبِ خلافت کے فرائض بجا لا سکے۔ مگر جس مقام پر پہنچ کر یہ ذوقِ لطیف احساسِ فرض پر غالب آجاتا ہو، جہاں لطف اندوزی کا انہماک انسان کو خدا پرستی کے بجائے حسن پرست بنا دیتا ہو، جہاں فنونِ لطیفہ کی چاشنی سے انسان کو عیش پسندی کا چسکا لگ جاتا ہو، جہاں ان فنون کے اثر سے جذبات و داعیاتِ نفس اس قدر قوت و شدت حاصل کر لیتے ہوں کہ عقل کی گرفت ڈھیلی ہو جائے، ضمیر کی آواز کے لیے دل کے کان

بہرے ہو جائیں، اور فرض کی پکار کے لیے سمع وطاعت باقی نہ رہے، تو اس سرحد پر اسلام عدم جواز، کراہت اور حرمت کے موانع قائم کر دیتا ہے، اس لیے کہ اس کا مقصد نان سین اور بہاؤ الدین، مانی اور بہزاد، چارلی چپلن اور میری پکفورڈ پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ، علی بن ابی طالبؓ اور حسین ابن علیؓ، ابوذر غفاریؓ اور رابعہ بصریؒ پیدا کرنا چاہتا ہے۔

انسان کی عملی زندگی کا ایک قابلِ اعتماد نظم و ترتیب اختیار کرنا منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل سیرت بن جائے۔ اور سیرت کے بننے کا انحصار اس پر ہے کہ اس کا ذہن پراگندہ خیالی کی حالت سے نکل جائے، چند مخصوص خیالات اس کے اندر متمکن ہو جائیں، اور ان خیالات میں اتنا رسوخ، اتنا جماؤ، اتنی مضبوطی ہو کہ کسی دوسری طرح کے خیالات کو آسانی سے اور ذہن کی دنیا میں برہمی پیدا کرنے کا موقع نہ دیں۔ یہ خیالات جتنے گہرے جمے ہوئے ہوں گے سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہو گی، اور انسان کی عملی زندگی اتنی ہی زیادہ مرتب منظم اور قابلِ اعتماد ہو گی۔ برعکس اس کے ان میں جتنی کمزوری ہو گی، مخالف خیالات کو راہ دینے کی جتنی زیادہ صلاحیت ہو گی، اتنی ہی سیرت بھی کمزور ہو گی، اور عملی زندگی بھی اسی قدر بے نظم اور ناقابلِ وثوق ہو جائے گی۔

"قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی اسی ذہنی بنیاد کا نام "ایمان" ہے ایمان کا لفظ مادہ "امن" سے نکلا ہے۔ امن کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے امانت ہے، جو ضد ہے خیانت کی۔ یعنی امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کی نیک معاملگی پر دل ٹھک جاتا ہے۔ وثوق ہوتا ہے کہ وہ بدمعاملگی نہ کرے گا۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اس کو امون کہتے ہیں، کیونکہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں ہوتا۔ اسی مادہ کا باب افعال "ایمان" ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نفس میں کوئی بات بر بنائے تصدیق و یقین اس طرح جم جائے کہ اب اس کے خلاف کسی بات کے راہ پانے اور داخل ہو جانے کا خوف ہی باقی نہ رہے۔ ایمان کا کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا، اس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ اسی سے سیرت کمزور ہوئی، اور اسی نے عملی زندگی میں بے لگی پیدا کر دی۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کے برعکس ہے۔ مضبوط ایمان کے معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل ٹھوس اور یقینی بنیادوں پر قائم ہو گئی، اب اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ اعمال ٹھیک اسی تخیل اور اس مفکورہ کے مطابق و مناسب صادر

ہونگے جو دل میں جم گیا ہے، اور جس سے سیرت کا سانچہ تیار ہوا ہے۔

اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد و افکار پر ایمان رکھتے ہوں، اور ان کی سیرتیں مختلف و متضاد بنیادوں پر قائم ہو جائیں، تو کوئی اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہو گی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے، مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دے گا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دیئے گئے، اور ایک مضبوط دیوار قائم ہو گئی۔ اب ان کے درمیان تعامل اور تعاون شروع ہو جائے گا جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں یک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہو گا، ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہو گی، ایک نئی قوم نئی سیرت، نئی ذہنیت، نئے خیالات، نئے طریق عمل کے ساتھ اٹھے گی اور اپنی حضریت کا قصر ایک نئے ہی انداز پر تعمیر کرے گی۔

اسلام کے ایمانیات پانچ ہیں:۔

- خدا
- ملائکہ
- کتب الہٰی جن میں قرآن بھی شامل ہے
- انبیاء جن میں رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں۔
- یوم آخر یعنی قیامت۔

یہ پانچوں ایمانیات امورِ غیب کے قبیل سے ہیں، اور عالم آب و گل سے ماورا۔ اس لیے ہماری تقسیم کے مطابق یہ مذہبی اور روحانی ایمانیات ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے ان پر اپنے روحانی نظام ہی کی نہیں بلکہ اخلاقی، سیاسی، اور تمدنی نظام کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ اس نے دین اور دنیا دونوں کو باہم ملا کر ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جس کے تحت انسانی زندگی کے تمام شعبے حرکت کرتے ہیں، اور اس نظام کو اپنے قیام و بقا اور اپنے تصرفات کے لیے حقیقی طاقت کی ضرورت ہے وہ سب انہی پانچوں ایمانیات سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس کے لیے قوت کا ایک

لامتناہی سرچشمہ ہیں جس کی رسد کبھی بند نہیں ہوتی۔

اسلام ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہو، یعنی اس کا تعلق کسی خاص ملک، یا نسل کے لوگوں سے نہ ہو۔ نہ کوئی مخصوص رنگ رکھنے والی یا مخصوص زبان بولنے والی قوم اس کے ساتھ اختصاص رکھتی ہو۔ بلکہ تمام نوعِ انسانی کی فلاح اس کی مقصود ہو، اور اس کے زیر اثر ایک ایسا نظام اجتماعی قائم ہو سکے جس میں ہر اس چیز کو پرورش کیا جو انسان کے لیے بحیثیت انسان ہونے کے خیر و صلاح ہے، اور ہر اس چیز کو مٹایا جائے جو اس کے لیے شر اور فساد ہے۔ ایسی ایک خاص انسانی تہذیب کی بنیاد ان ایمانیات پر نہیں رکھی جا سکتی جو عالم آب و گل سے تعلق رکھتے ہوں، اس لیے کہ مادیات اور محسوسات دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں ہے، مثلاً سورج، چاند، زمین، ہوا، روشنی وغیرہ۔ یا ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں نہیں، مثلاً وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں میں تو ایمانیات بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، کیونکہ ان کے نفس وجود پر ایمان لانا تو محض بے معنی ہے، اور ان پر اس حیثیت سے ایمان لانا کہ وہ انسان کی اصلاح میں کوئی اختیاری تاثیر رکھتے ہیں از روے علم و عقل غلط ہے۔ علاوہ بریں ان پر کسی حیثیت سے بھی ایمان لانے کا کوئی نفع

انسان کو روحانی، اخلاقی اور عملی زندگی میں مترتب نہیں ہوتا۔ رہیں دوسری قسم کی چیزیں تو بہ ظاہر ہے کہ وہ ایک مشترک انسانی تہذیب کے لیے اساس نہیں بن سکتیں، کیونکہ وہ بنائے تفرق و تقسیم ہیں، نہ کہ بنائے جمع و تالیف۔ لہٰذا یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اس قسم کی تہذیب کی بنیاد ایسے ایمانیات پر رکھی جائے جو مادیات و حسیات سے ماوراء ہوں۔

اسلام کے نظامِ تہذیب کو مختلف عقلی اور علمی مراتب رکھنے والی وسیع انسانی آبادیوں پر، ان کی زندگی کے مخفی اور جزئی سے جزئی شعبوں تک میں اپنی حکومت قائم کرنے اور اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے جس قوت کی ضرورت ہے وہ صرف انہی ایمانیات سے حاصل ہو سکتی ہے جن کی تصدیق کا اسلام نے مطالبہ کیا ہے۔ یہ یقین کہ ایک سمیع و بصیر، قاہر و غالب اور رؤف و رحیم خدا ہمارے اوپر حکمران ہے، اس کے بے شمار لشکر ہر جگہ ہر آن موجود ہیں، پیغمبر اسی کا بھیجا ہوا ہے، جو احکام اس نے ہم کو دیئے ہیں وہ اس نے خود نہیں گھڑے ہیں بلکہ سب کے سب خدا کی طرف سے ہیں، اور اپنی اطاعت یا سرکشی کا اچھا یا برا نتیجہ ہم کو ضرور دیکھنا پڑے گا، اپنے اندر وہ زبردست اور ہمہ گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں

کی جا سکتی۔

تخیل کی دنیا میں رہنے والے ریت پر، پانی پر، بلکہ ہوا پر بھی قصر تعمیر کر سکتے ہیں۔ مگر اسلام ایک حکیمانہ مذہب ہے وہ تہذیب و تربیت کی عمارت بودی بنیادوں پر تعمیر نہیں کر سکتا۔ وہ سب سے پہلے انسان کی روح اور اس کے قوائے فکری کی گہرائیوں میں مضبوط بنیادیں قائم کرتا ہے پھر ان پر ایک ایسی عمارت بناتا ہے جو کسی کے ہلائے نہیں ہل سکتی۔ وہ سب سے پہلے یہ بات انسان کے ذہن نشین کرتا ہے کہ تیرے اوپر ایک خدا ہے، جو دنیا اور آخرت دونوں میں تیرا حاکم ہے۔ جس کی حکومت سے تو کسی طرح نہیں نکل سکتا۔ اور جس کے علم سے تیری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس نے تیری ہدایت کے لیے رسول بھیجا ہے اور رسول کے ذریعے سے تجھ کو وہ کتاب اور وہ شریعت بھیجی ہے جس کے اتباع سے تو اس حاکم حقیقی کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ اگر تو اس کے خلاف عمل کرے گا تو خواہ تیری خلاف ورزی کیسی ہی ڈھکی چھپی ہو وہ حاکم ضرور تیری گرفت کرے گا اور تجھے سزا دیے بغیر نہ رہیگا۔

اسلامی تہذیب کا سنگ بنیاد حیات دنیا کا یہ تصور ہے کہ انسان کی حیثیت اس کرۂ خاکی میں عام موجودات کی سی نہیں ہے، بلکہ وہ خداوند عالم کی طرف سے یہاں خلیفہ بنا کر اتارا گیا ہے۔ اس تصور سے بطور ایک عقلی نتیجے کے، انسان کی زندگی کا یہ نصب العین قرار پایا کہ وہ اپنے خالق اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرے، اور اس نصب العین کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہو گیا کہ :-

اولاً، وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے۔

ثانیاً، وہ صرف خدا کو آمر و ناہی، حاکم اور مطاع سمجھے اور اپنے اختیار کو احکام خداوندی کے تابع کر دے۔

ثالثاً، وہ ان طریقوں کو معلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے، اور جب وہ طریقے معلوم ہو جائیں تو انہی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

رابعاً، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیات دنیا کے نامکمل نتائج سے دھوکا نہ کھائے۔

یہ اساسی اعتقادات انہی خطوط پر تہذیب کی تاسیس و تشکیل کرتے ہیں۔

جو حیات دنیا کے اس مخصوص تصور اور اس خالص نصب العین نے کھینچ دیے تھے ایسی تہذیب کے لیے عقلاً جس اساسی عقیدے کی ضرورت ہے وہ انہی پانچ امور پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ ان کے سوا کسی دوسرے اعتقاد میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اس مخصوص طرز کی تہذیب کے لیے اساس بن سکے۔ کیونکہ کوئی دوسرا عقیدہ اس خالص تصور حیات اور نصب العین کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔

ایمانیات کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں، ان پر نظر ڈالنے سے اس تہذیب کا پورا خاکہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے جس کی تاسیس ان کے ذریعے سے کی گئی ہے۔ اس خاکے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) اس تہذیب کا نظام ایک سلطنت کا سا نظام ہے۔ اس میں خدا کی حیثیت عام مذہبی تصورات کے لحاظ سے محض ایک معبود کی سی نہیں ہے بلکہ دنیوی تصورات کے لحاظ سے وہی حاکم مطلق بھی ہے۔ وہ دراصل اس سلطنت کا شہنشاہ ہے، رسول اس کا نمائندہ ہے، قرآن اس کی کتاب آئین ہے، اور ہر وہ شخص جو اس کی شہنشاہی کو تسلیم کرکے اس کے نمائندے کی اطاعت اور اس کی کتاب آئین کا اتباع کرنا قبول کرے، اس سلطنت کی رعیت ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شہنشاہ نے اپنے نمائندے اور اپنی کتاب آئین کے ذریعے سے جو قوانین مقرر کر دیے ہیں ان کو بے چون وچرا تسلیم کیا جائے، خواہ ان کی علت و مصلحت سمجھ میں آئے

یا نہ آئے۔ جو شخص خدا کے اس اختیار مطلق اور اس کے قانون کا شخصی یا اجتماعی رائے سے بالاتر ہونا تسلیم نہیں کرتا، اور اس کے فرمان کو ماننے یا نہ ماننے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھتا ہے، اس کے لیے اس سلطنت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) چونکہ اس تہذیب کا اصل مقصد انسان کو آخری کامیابی (آخرت کے فیصلے میں خداوند عالم کی خوشنودی سے سرفراز ہونے) کے لیے تیار کرنا ہے، اور اس کامیابی کا حصول اس کے نزدیک موجودہ زندگی میں انسان کے صحیح عمل پر موقوف ہے، اور یہ جاننا کہ آخری نتیجے کے اعتبار سے کونسا عمل مفید ہے اور کونسا مضر، انسان کے بس کا کام نہیں، بلکہ وہی خدا اس کو بہتر جانتا ہے جو آخرت میں فیصلہ کرنے والا ہے، اس لیے یہ تہذیب انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرے، اور اپنی آزادیٔ عمل کو شریعتِ الٰہی کی قیود سے مقید کر دے اس طرح یہ تہذیب دین اور دنیا دونوں کی جامع ہے۔ اس کو عام محدود معنوں میں "مذہب" کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ ایک ایسا وسیع نظام ہے جو انسان کے افکار و خیالات، اس کے شخصی کردار و اخلاق، اس کے انفرادی عمل، اس کے خانگی معاملات، اس کی معاشرت، اس کے تمدن، اس کی سیاست، سب پر حاوی ہے، اور ان تمام معاملات میں جو طریقے اور قوانین خدا نے

مقرر کیے ہیں ان کے مجموعے کا نام دین اسلام یا تہذیب اسلامی ہے۔

(۳) یہ تہذیب کوئی قومی، یا ملکی یا نسلی تہذیب نہیں ہے، بلکہ صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہے، اور ہر اس شخص کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے جو توحید، رسالت، کتاب اور یوم آخر پر ایمان لائے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی قومیت بنائی ہے جس میں بلا امتیاز رنگ و نسل و زبان ہر انسان داخل ہو سکتا ہے۔ جس کے اندر تمام روئے زمین پر پھیل جانے کی استعداد موجود ہے، اور جو تمام بنی آدم کو ایک نظم ملت میں پیوستہ کر دینے، اور ان سب کو ایک تہذیب کا تبع بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ عالمگیر انسانی برادری قائم کرنے سے اس کا اصل مقصد اپنے متبعین کی مردم شماری بڑھانا نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں کو اس علم صحیح اور عمل صحیح کے فیض میں شریک کرنا ہے جو ان سب کے خدا نے ان سب کی بھلائی کے لیے عطا فرمایا ہے۔ اس لیے وہ اس برادری میں شامل ہونے کے لیے ایمان، کی قید لگا کر صرف ان لوگوں کو چن لینا چاہتی ہے جو خدا کی حکومت مطلقہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ ہوں اور ان حدود اور قوانین کی پابندی قبول کریں جو خدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعے سے مقرر کیے ہیں، کیونکہ صرف ایسے ہی لوگ (خواہ کتنے ہی کم ہوں) اس تہذیب کے نظام میں کھپ سکتے ہیں، اور انہی سے ایک صحیح اور مضبوط نظام قائم ہو سکتا ہے۔ منکرین

یا منافقین یا ضعیف الایمان لوگوں کا گھس آنا اس نظام کے لیے سبب قوت نہیں بلکہ موجب ضعف ہے۔

(۴) ہمہ گیری اور آفاقیت کے ساتھ اس تہذیب کی نمایاں خصوصیت اس کا زبردست ڈسپلن اور اس کی طاقتور گرفت ہے جس سے وہ اپنے متبعین کو شخصی و اجتماعی حیثیت سے اپنے آئین کا پابند بناتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین بناتے اور حدود مقرر کرنے سے پہلے قوانین کا اتباع اور حدود کی پابندی کرانے کا بندوبست کرتی ہے۔ حکم دینے سے پہلے اس کا انتظام کرتی ہے کہ اس کا حکم نافذ ہو۔ وہ سب سے پہلے انسان سے خدا کی فرمانروائی تسلیم کراتی ہے، پھر اس کو یقین دلاتی ہے کہ رسول اور کتاب کے ذریعہ سے جو احکام دیے گئے ہیں وہ خدا کے احکام ہیں، اور ان کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے پھر وہ اس کے نفس میں ایک ایسی پولیس متعین کر دیتی ہے، جو ہر وقت اور ہر حال میں، اس کو احکام کی اطاعت پر ابھارتی، خلاف ورزی پر سرزنش کرتی، اور عذاب یوم عظیم کا خوف دلاتی رہتی ہے۔ اس طرح جب وہ اس قوت نافذہ کو ہر شخص کے نفس و ضمیر میں متمکن کر کے اپنے پیروؤں میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ خود اپنی ذاتی رغبت سے قوانین کے اتباع اور حدود کی پابندی اور اخلاق حسنہ سے متخلق ہونے کے لیے آمادہ ہوں، تب وہ ان کے سامنے اپنے قوانین پیش کرتی ہے، ان کو احکام دیتی ہے، ان کے لیے حدود مقرر کرتی ہے،

ان کے لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے وضع کرتی ہے، اور اپنے مصالح کے لیے ان سے سخت سے سخت قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ ایسا طریقہ ہے جس سے زیادہ حکیمانہ طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس طریقے سے اسلامی تہذیب کو جو زبردست نفوذ و اثر حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو حاصل نہیں ہوا۔

(۵) دنیوی نقطۂ نظر سے اس تہذیب کا اصل مقصد ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کرنا اور ایک صالح اور پاکیزہ سوسائٹی کو وجود میں لانا ہے۔ مگر ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے ہر فرد کو اخلاقِ فاضلہ و صفاتِ حسنہ سے متصف نہ کر دیا جائے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے تاکہ وہ ردی اور منتشر افکار کی آماج گاہ نہ رہیں، صحیح اور پاکیزہ خیالات ان میں راسخ ہو جائیں، اور ایک ایسی مضبوط سیرت ان کے اندر پیدا ہو جائے جس سے اعمالِ صالح کا صدور بالطبع ہونے لگے۔ اس نے اپنی تہذیب میں اس قاعدے کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ وہ سوسائٹی کے لیے بہترین افراد مہیا کرنا چاہتا ہے، اور ایسے افراد کی تربیت کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ سب سے پہلے ان میں ایمان کو راسخ کر دے، جو ایک اعلیٰ درجے کی سیرت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی ایمان ہے جس کے ذریعے سے وہ افراد میں صداقت، امانت، نیک نفسی، احتساب، حق پسندی، ضبطِ نفس، تنظیم، فیاضی، وسعتِ نظر، خودداری، انکسار و فروتنی، فراخ حوصلگی،

بلند ہمتی، ایثار و قربانی، فرض شناسی، صبر و استقامت، شجاعت و بسالت، سخاوت و استغنا، اطاعتِ امر اور اتباعِ قانون کے عمدہ اوصاف پیدا کرتا ہے اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ ان کے اجتماع سے ایک بہترین سوسائٹی وجود میں آئے۔

(۶) اس تہذیب کے ایمانیات میں ایک طرف وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو انسان کے اندر اخلاقِ حسنہ و ملکاتِ فاضلہ پیدا کرنے اور ان کی پرورش اور حفاظت کرنے والی ہیں۔ دوسری طرف ان میں یہ بھی قوت ہے کہ وہ انسان کو دنیوی ترقی کے لیے ابھارتے ہیں، اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ دنیا کے اسباب و وسائل کو بہترین طریقے پر برتے اور ان تمام قوتوں کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے جو خدا نے اسے عطا کی ہیں، اور اس میں وہ تمام عمدہ صفات پیدا کرتے ہیں جو دنیا میں حقیقی ترقی کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان ایمانیات میں انسان کی عملی قوتوں کو منظم کرنے اور تنظیم کے ساتھ حرکت دینے کی زبردست طاقت موجود ہے، اور اس کے ساتھ یہی ایمانیات یہ طاقت بھی رکھتے ہیں کہ اس حرکت کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیں، اور ان راستوں سے منحرف نہ ہونے دیں جن سے ہٹ جانا تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ایمانیات اپنے اندر وہ تمام خوبیاں مع شئی زائد رکھتے ہیں جو دوسرے مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں جدا جدا پائی جاتی ہیں، اور ان تمام خرابیوں سے پاک ہیں جو مختلف مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں موجود ہیں۔

---

(۴)

۱۹۳۹ء

اس میں شک نہیں کہ "قومیت" کی ابتدا ایک معصوم جذبے سے ہوتی ہے۔ یعنی اس کا مقصد اوّل یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص گروہ کے لوگ اپنے مشترک مفاد و مصالح کے لیے عمل کریں، اور اجتماعی ضروریات کے لیے ایک "قوم" بن کر رہیں۔ لیکن جب ان میں "قومیت" پیدا ہو جاتی ہے تو لازمی طور پر "عصبیت" کا رنگ اس میں آ جاتا ہے، اور جتنی جتنی "قومیت" شدید ہوتی جاتی ہے اسی قدر "عصبیت" میں بھی شدت بڑھتی جاتی ہے۔ جب کبھی ایک "قوم" اپنے مفاد کی خدمت اور اپنے مصالح کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کرے گی، یا بالفاظ دیگر اپنے گرد "قومیت" کا حصار کھینچ لے گی تو لازماً وہ اس حصار کے "اندر والوں" اور "باہر والوں" کے درمیان

"اپنے" اور "غیر" کا امتیاز کرے گی۔ اپنے کو ہر معاملے میں غیر پر ترجیح دے گی۔ غیر کے مقابلے میں اپنے کی حمایت کرے گی۔ جب کبھی دونوں کے مفاد و مصالح میں اختلاف پیدا ہوگا تو وہ اپنے مفاد کی حفاظت کرے گی اور اس پر غیر کے مفاد کو قربان کر دے گی۔ انہی وجوہ سے ان میں صلح بھی ہوگی اور جنگ بھی۔ مگر رزم اور بزم دونوں میں "قومیت" کی حدِ فاصل دونوں گروہوں کے درمیان قائم رہے گی۔ اسی چیز کا نام "عصبیت" اور حمیت ہے، اور قومیت کی یہ وہ لازمی خصوصیت ہے جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

قومیت کا قیام وحدت و اشتراک کی کسی ایک جہت سے ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی جہت ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں ایسی زبردست قوتِ رابطہ اور ضابطہ ہونی چاہیے کہ اجسام کی تعداد اور نفوس کے تکثر کے باوجود وہ لوگوں کو ایک کلمہ، ایک خیال، ایک مقصد اور ایک عمل پہ جمع کر دے، اور قوم کے مختلف کثیر التعداد اجزا کو قومیت کے تعلق سے اس طرح بستہ و پیوستہ کر دے کہ وہ سب ایک ٹھوس چٹان بن جائیں، اور افرادِ قوم کے دل و دماغ پر اتنا تسلط و غلبہ حاصل کر لے کہ قومی مفاد کے معاملے میں وہ سب متحد ہوں اور ہر قربانی کے لیے آمادہ رہیں۔

یوں تو اشتراک اور وحدت کی جہتیں بہت سی ہو نی ممکن ہیں لیکن آغاز عہد تاریخ سے آج تک دنیا میں جتنی قومیتیں بنی ہیں ان سب کی تعمیر، بجز ایک اسلامی قومیت کے، حسب ذیل اشتراکات میں سے کسی ایک قسم کے اشتراک پر ہوئی ہے، اور اس عنصر کے ساتھ چند دوسرے اشتراکات بھی بطور مددگار کے شریک ہو گئے ہیں:۔

- اشتراکِ نسل : جس کو "نسلیت" کہتے ہیں
- اشتراکِ مرز بوم: جس کو "وطنیت" کہتے ہیں۔
- اشتراکِ زبان : جو وحدتِ خیال کا ایک زبردست ذریعہ ہونے کی وجہ سے "قومیت" کی تعمیر میں خاص حصہ لیتا ہے۔
- اشتراکِ رنگ : جو ایک رنگ کے لوگوں میں "ہم جنسی" کا احساس پیدا کرتا ہے، اور پھر یہی احساس ترقی کر کے ان کو دوسرے رنگ کے لوگوں سے احتراز و اجتناب پر آمادہ کر دیتا ہے۔
- معاشی اغراض کا اشتراک :۔ جو ایک معاشی نظام کے لوگوں کو دوسرے معاشی نظام والوں کے مقابلے میں ممتاز کرتا ہے، اور جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنے

معاشی حقوق و منافع کے لیے جد و جہد کرتے ہیں۔

• نظامِ حکومت کا اشتراک: جو ایک سلطنت کی رعایا کو مشترک نظم و نسق کے رشتہ میں منسلک کرتا ہے، اور دوسری سلطنت کی رعایا کے مقابلے میں حد و فاصلہ قائم کر دیتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ بنیادیں جن پر دنیا کی مختلف قومیتیں تعمیر کی گئی ہیں انہوں نے بڑی قوت کے ساتھ جماعتوں کی شیرازہ بندی کی ہے، مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ اس قسم کی قومیتیں بنی نوع انسان کے لیے ایک شدید مصیبت ہیں۔ انہوں نے عالمِ انسانی کو سینکڑوں، ہزاروں حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور حصے بھی ایسے کہ ایک حصہ فنا کیا جا سکتا ہے، مگر دوسرے حصے کو کسی طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نسل دوسری نسل میں نہیں بدل سکتی۔ ایک وطن دوسرا وطن نہیں بن سکتا۔ ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبان کے بولنے والے نہیں بن سکتے۔ ایک رنگ دوسرا رنگ نہیں بن سکتا۔ ایک قوم کی معاشی اغراض بعینہٖ دوسری قوم کی اغراض نہیں بن سکتیں۔ ایک سلطنت کبھی دوسری سلطنت نہیں بن سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو قومیتیں ان بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہیں، ان کے درمیان مصالحت کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ "قومی عصبیت" کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے خلاف مسابقت، مزاحمت

اور منافست کی ایک دائمی کشمکش میں مبتلا رہتی ہیں۔ ایک، دوسرے کو پامال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آپس میں لڑ کر فنا ہو جاتی ہیں، اور پھر انہی بنیادوں پر دوسری "قومیتیں" ایسے ہی ہنگامے برپا کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ دنیا میں فساد، بدامنی اور شرارت کا ایک مستقل سرچشمہ ہے۔ خدا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ شیطان کا سب سے زیادہ کامیاب حربہ ہے جس سے وہ اپنے ازلی دشمن کا شکار کرتا ہے۔

نسلیت کیا ہے؟ — محض خون کا اشتراک۔ اس کا نقطۂ آغاز ماں اور باپ کا نطفہ ہے جس سے چند انسانوں میں خونی رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی نقطہ پھیل کر خاندان بنتا ہے، پھر قبیلہ، پھر نسل۔ اس آخری حد، یعنی "نسل" تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنے اس باپ سے، جس کو اس نے اپنی نسل کا مورث اعلیٰ قرار دیا ہے، اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کی مورثیت محض ایک خیالی چیز بن جاتی ہے۔ نام نہاد "نسل" کے اس دریا میں بیرونی خون کے بہت سے ندی نالے آکر مل جاتے ہیں، اور کوئی صاحب عقل و علم انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ دریا خالص اسی پانی کا ہے جو اپنے اصلی سرچشمے سے نکلا تھا۔ پھر اگر اس خلط ملط کے باوجود خون کے اشتراک کی بنا پر انسان ایک "نسل" کو اپنے

لیے مادۂ اتحاد قرار دے سکتا ہے، تو کیوں نہ اس خون کے اشتراک کو بنائے وحدت قرار دیا جائے جو تمام انسانوں کو ان کے پہلے باپ اور پہلی ماں سے ملاتا ہے؟ اور کیوں نہ تمام انسانوں کو ایک ہی "نسل" اور ایک ہی "اصل" کی طرف منسوب کیا جائے؟ آج جن لوگوں کو مختلف نسلوں کا بانی و مورث قرار دے لیا گیا ہے ان سب کا نسب اوپر جا کر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتا ہے، اور آخر میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ سب ایک اصل سے ہیں۔ پھر یہ "آریت" اور "سامیت" کی تقسیم کیسی؟۔

کیا انسان کے لیے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ نالائق، بدکار اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس آدمی پر صرف اس لیے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ پہلا سپید ہے اور دوسرا سیاہ؟ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے اور دوسرا کوئی اور زبان؟ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے اور دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی صفائی اور کدورت میں بھی کوئی دخل ہے؟ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ اخلاق و اوصافِ انسانی کے صلاح و فساد سے

پہاڑوں اور دریاؤں کا کوئی تعلق ہے؟ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس چیز کے تصور کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ نیکی، شرافت، اور جوہر انسانیت کو رگوں کے خون، زبان کی بولی، مولد و مسکن کی خاک کے معیار پر جانچا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نفی میں دے گی مگر نسلیت، وطنیت اور اس کے بہن بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ یقیناً ایک گز مربع سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس رقبے کو اگر وہ اپنا وطن قرار دے تو شاید وہ کسی ملک کو اپنا وطن نہیں کہہ سکتا۔ لیکن وہ اس چھوٹے سے رقبے کے گرد میلوں اور کوسوں اور بسا اوقات سینکڑوں اور ہزاروں میل تک ایک سرحدی خط کھینچ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں تک میرا "وطن" ہے اور اس سے باہر جو کچھ ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اس کی نظر کی تنگی ہے، ورنہ کوئی چیز اسے تمام روئے زمین کو اپنا وطن کہنے سے مانع نہیں ہے۔ جس دلیل کی بنا پر ایک مربع گز کا وطن پھیل کر ہزاروں مربع گز بن سکتا ہے، اسی دلیل کی بنا پر وہ پھیل کر پورا کرۂ ارضی بھی بن سکتا ہے۔ اگر آدمی اپنے زاویۂ نظر کو تنگ نہ کرے تو وہ

دیکھ سکتا ہے کہ یہ دریا اور پہاڑ اور سمندر وغیرہ جن کو اس نے محض اپنے خیال میں حدود فاصل قرار دے کر ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان فرق کیا ہے، سب کے سب ایک ہی زمین کے اجزا ہیں۔ پھر کس بنا پر اس نے دریاؤں اور پہاڑوں اور سمندروں کو یہ حق دے دیا کہ وہ اسے ایک خاص خطے میں قید کر دیں؟

اداۓ خیال کے وسیلے کا مشترک ہونا خود خیال کے اشتراک کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک ہی خیال دس مختلف زبانوں میں ادا ہو سکتا ہے، اور ان سب کے بولنے والوں کا اس خیال میں متحد ہو جانا ممکن ہے۔ بخلاف اس کے دس مختلف خیالات ایک زبان میں ادا ہو سکتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ اس ایک ہی زبان کے بولنے والے ان مختلف خیالات کے معتقد ہو کر باہم متحد ہو جائیں۔ لہٰذا "وحدتِ خیال" جو حقیقتاً "قومیت" کی جان ہے اشتراکِ زبان کی محتاج نہیں ہے، اور نہ اشتراکِ زبان کے ساتھ "وحدتِ خیال" ضروری ہے۔ پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ آدمی کی "آدمیت" اور اس کے "ذاتی حسن و قبح" میں اس کی زبان کو کیا دخل ہے؟ ایک جرمن بولنے والے شخص کو ایک فرنچ بولنے والے کے مقابلے میں کیا محض اس بنا پر ترجیح دی جا سکتی ہے کہ وہ جرمن زبان

ہوتا ہے؟ دیکھنے کی چیز اس کا جوہر ذاتی ہے نہ کہ اس کی زبان۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک ملک کے انتظامی معاملات اور عام کاروبار میں وہی شخص مفید ہو سکتا ہے جو اس ملک کی زبان جانتا ہو۔ مگر "انسانیت" کی تقسیم اور قومی امتیاز کے لیے یہ کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔

رنگ محض جسم کی صفت ہے، مگر انسان کو انسان ہونے کا شرف اس کے جسم کی بنا پر نہیں، اس کی روح، اس کے نفس ناطقہ کی بنا پر ہے، جس کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ پھر انسان اور انسان میں زردی اور سرخی، سیاہی اور سپیدی کا امتیاز کیسا؟ ہم کالی گائے اور سپید گائے کے دودھ میں کوئی فرق نہیں کرتے، اس لیے کہ مقصود اس کا دودھ ہے نہ کہ اس کا رنگ۔ لیکن عقل کی بے راہ روی کا برا ہو کہ اس نے ہم کو انسان کی نفسی صفات سے قطع نظر کرکے اس کی جلد کے رنگ کی طرف متوجہ کر دیا۔

معاشی اغراض کا اشتراک انسانی خود غرضی کا ایک ناجائز بچہ ہے۔ قدرت نے اس کو ہرگز پیدا نہیں کیا۔ آدمی کا بچہ کلام کرنے کی قوتیں ماں کے پیٹ سے

لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جدوجہد کے لیے اسے ایک وسیع میدان ملتا ہے، اور زندگی کے بے شمار وسائل اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مگر وہ اپنی معیشت کے لیے صرف اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے رزق کے دروازے کھلیں بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسروں کے لیے وہ بند ہو جائیں۔ اسی خود غرضی میں انسانوں کی کسی بڑی جماعت کے مشترک ہو جانے سے وہ "وحدت" پیدا ہوتی ہے جو انہیں ایک "قوم" بننے میں مدد دیتی ہے۔ بظاہر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معاشی اغراض کا ایک حلقہ قائم کر کے اپنے حقوق و مفاد کا تحفظ کر لیا لیکن جب اس طرح بہت سی جماعتیں اپنے گرد اسی قسم کے حصار کھینچ لیتی ہیں تو انسان پر اس کے اپنے ہاتھوں سے عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے اس کی اپنی خود غرضی اس کے لیے پاؤں کی بیڑی اور ہاتھ کی ہتھکڑی بن جاتی ہے۔ دوسروں کے لیے رزق کے دروازے بند کرنے کی کوشش میں وہ خود اپنے رزق کی کنجیاں گم کر دیتا ہے۔

نظامِ حکومت کا اشتراک بجائے خود ایک ناپائدار اور ضعیف البنیان چیز ہے، اور اس کی بنا پر ہرگز کسی مستحکم قومیت کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ ایک سلطنت کی رعایا کو اس کی وفاداری کے رشتے میں منسلک کر کے ایک قوم بنا دینے

کا خیال کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ سلطنت جب تک غالب و قاہر رہتی ہے، رعایا اس کے قانون کی گرفت میں بندھی رہتی ہے، گرفت جہاں ڈھیلی ہوئی مختلف عناصر منتشر ہو گئے۔ سلطنت مغلیہ میں مرکزی طاقت کمزور ہونے کے بعد کوئی چیز ہندوستان کے مختلف علاقوں کو الگ الگ سیاسی قومیتیں بنالینے سے نہ روک سکی۔ یہی حشر سلطنت عثمانیہ کا ہوا۔ آخری دور میں جوان ترک نے عثمانی قومیت کا قصر تعمیر کرنے کے لیے بہت کچھ زور لگایا، مگر ایک ٹھیس لگتے ہی سب اینٹ پتھر جدا ہو گئے۔ تازہ ترین مثال اسٹریا ہنگری کی ہے، اور تاریخ سے بہت سی مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد جو لوگ سیاسی قومیتوں کی تعمیر ممکن سمجھتے ہیں وہ محض اپنے تخیل کی شادابی کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نسل انسانی میں یہ جتنی تفریقیں کی گئی ہیں ان کے لیے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔ یہ صرف حسی اور مادی تفریقیں ہیں جن کا ہر دائرہ زاویۂ نظر کی ہر وسعت پر ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا قیام و بقا جہالت کی تاریکی، نگاہ کی محدودیت اور دل کی تنگی پر منحصر ہے۔ علم و عرفان کی روشنی جس قدر پھیلتی ہے، بصیرت کی رسائی

جس قدر بڑھتی ہے، قلب میں جتنی جتنی وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ مادی اور حسی پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ "نسلیت" کو "انسانیت" کے لیے اور "وطنیت" کو "آفاقیت" کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اختلاف رنگ و زبان میں جوہر انسانیت کی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے، خدا کی زمین میں خدا کے سب بندوں کی معاشی اغراض مشترک پائی جاتی ہیں، اور سیاسی نظامات کے دائرے محض چند سائے نظر آتے ہیں جو آفتاب اقبال کی گردش سے روئے زمین پر چلتے پھرتے اور گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔

آپ پورے قرآن کو دیکھ جائیے اس میں ایک لفظ بھی آپ کو "نسلیت" یا "وطنیت" کی تائید میں نہ ملے گا۔ اس کی دعوت کا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے۔ تمام روئے زمین کی انسانی مخلوق کو وہ خیر و صلاح کی طرف بلاتا ہے۔ اس میں نہ کسی قوم کی تخصیص ہے اور نہ کسی سرزمین کی۔ اس نے اگر کسی زمین کے ساتھ خاص تعلق پیدا کیا ہے تو وہ صرف مکہ کی زمین ہے، لیکن اس کے متعلق بھی صاف کہہ دیا کہ سَوَاءَ نِ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (الحج ۲) یعنی مکہ کے اصلی باشندے اور باہر والے سب مسلمان برابر ہیں۔ اور جو مشرکین وہاں کے اصلی باشندے تھے ان کے متعلق کہا کہ وہ نجس ہیں، ان کو وہاں سے نکال باہر

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا
(التوبہ۔۲۸) اس تصریح کے بعد اسلام میں "وطنیت" کا کلی استیصال ہو جاتا ہے
اور درحقیقت ایک مسلمان یہی کہہ سکتا کہ

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

کفر و شرک کی جہالت کے بعد اسلام کی دعوت حق کا اگر کوئی سب سے بڑا دشمن تھا تو وہ یہی نسل و وطن کا شیطان تھا اور یہی وجہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تیئیس سالہ حیات دنیویہ میں ضلالت کفر کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کو مٹانے کے لیے جہاد کیا وہ یہی عصبیت جاہلیہ تھی۔ آپ احادیث و سیر کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح خون اور خاک، رنگ اور زبان، پستی اور بلندی کی تفریقوں کو مٹایا، انسان اور انسان کے درمیان غیر فطری امتیازات کی تمام سنگین دیواروں کو مسمار کیا، اور انسان ہونے کی حیثیت سے تمام بنی آدم کو یکساں قرار دیا۔

اللہ اور اس کے رسول نے جاہلیت کی ان تمام محدود مادی، حسی اور وہمی

بنیادوں کو جن پر دنیا کی مختلف قومیتوں کی عمارتیں قائم کی گئی تھیں ڈھا دیا۔ رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت اور سیاست کی غیر عقلی تفریقوں کو جن کی بنا پر انسان نے اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے انسانیت کو تقسیم کر رکھا تھا مٹا دیا اور انسانیت کے مادے میں تمام انسانوں کو برابر ایک دوسرے کا ہم مرتبہ قرار دے دیا۔

اس تخریب کے ساتھ اس نے خالص عقلی بنیادوں پر ایک نئی "قومیت" تعمیر کی۔ اس "قومیت" کی بنا بھی امتیاز پر تھی، مگر مادی اور عرضی امتیاز پر نہیں بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز پر۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی پاکیزگی و طہارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوعِ بشری کو دعوت دی پھر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے، اور جو اس کو رد کر دے وہ دوسری "قوم" سے ہے۔ ایک قوم اسلام کی ہے اور اس کے سب افراد ایک امت ہیں۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا۔ اور ایک قوم کفر اور گمراہی کی ہے، اور اس کے متبعین اپنے اختلافات کے باوجود ایک گروہ ہیں۔ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اسلام نے تمام انسانی اور مادی رشتوں کو قطع کر دیا ہے۔ ہرگز نہیں! اس نے مسلمانوں کو صلۂ رحمی کا حکم دیا ہے، قطع رحم سے منع کیا ہے، ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کی تاکید کی ہے، خون کے رشتوں میں وراثت جاری کی ہے، خیر و صدقات اور بذل و انفاق میں ذوی القربیٰ کو غیر ذوی القربیٰ پر ترجیح دی ہے، اپنے اہل و عیال، اپنے گھربار، اور اپنے مال کو دشمنوں سے بچانے کا حکم دیا ہے، ظالم کے مقابلے میں لڑنے کا حکم دیا ہے، اور ایسی لڑائی میں جان دینے والے کو شہید قرار دیا ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں، بلا امتیاز مذہب، ہر انسان کے ساتھ ہمدردی، حسن سلوک، اور محبت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے کسی حکم کو یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ وہ ملک و وطن کی خدمت و حفاظت سے روکتا ہے، یا غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ صلح و مسالمت کرنے سے باز رکھتا ہے۔

یہ سب کچھ ان مادی رشتوں کی جائز اور فطری مراعات ہیں، مگر جس چیز نے "قومیت" کے معاملے میں اسلام اور غیر اسلام کے اصول میں فرق کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ دوسروں نے انہی رشتوں پر جداگانہ قومیتیں بنائی ہیں اور اسلام نے ان کو بنائے قومیت قرار نہیں دیا۔ وہ ایمان کے تعلق کو ان سب تعلقات پر ترجیح دیتا ہے اور وقت پڑے تو ان میں سے ہر ایک کو اس پر قربان کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔

"اسلامی قومیت" کی تعمیر میں نسل و وطن اور زبان و رنگ کا قطعاً کوئی حصہ نہیں ہے اس عمارت کو جس معمار نے بنایا ہے اس کا تخیل ساری دنیا سے نرالا تھا۔ اس تمام عالم انسانی کے مواد خام پر نظر ڈالی جہاں جہاں سے اس کو اچھا اور مضبوط مسالہ اس کو چھانٹ لیا، ایمان اور عمل صالح کے پختہ ہونے سے ان متفرق اجزا کو پیوستہ کر دیا اور ایک "عالمگیر قومیت" کا قصر تعمیر کیا جو سارے کرۂ ارض پر چھایا ہوا ہے اس عظیم الشان عمارت کا قیام و دوام منحصر ہے اس پر کہ اس کے تمام مختلف الاصل مختلف الشکل، مختلف المقام اجزا اپنی جدا جدا اصلیتوں کو بھول کر صرف ایک اصل کو یاد رکھیں، اپنے جدا جدا رنگ چھوڑ کر ایک رنگ میں رنگ جائیں، اپنے الگ الگ مقاموں سے قطع نظر کر کے ایک مخرج صدق سے نکلیں اور ایک مدخل صدق میں داخل ہو جائیں۔ یہی وحدت ملی اس بنیان مرصوص کی جان ہے۔ اگر یہ وحدت ٹوٹ جائے گی، اگر اجزائے ملت میں اپنی اصلوں اور نسلوں کے جدا جدا ہونے، اپنے وطن اور مقام کے مختلف ہونے، اپنے رنگ و شکل کے متنوع ہونے اور اپنی اغراض دنیوی کے متضاد ہونے کا احساس پیدا ہو جائے تو اس عمارت کی دیواریں پھٹ جائیں گی اور اس کی بنیادیں ہل جائیں گی اور اس کے تمام اجزا پارہ پارہ ہو جائیں گے جس طرح ایک سلطنت میں کئی سلطنتیں نہیں بن سکتیں، اسی طرح ایک قومیت میں کئی قومیتیں بھی نہیں بن سکتیں۔ اسلامی قومیت کے اندر نسلی، وطنی، لسانی اور لونی

قومیتوں کا جمع ہونا محال ہے۔ ان دونوں قسم کی قومیتوں میں سے ایک ہی قائم رہ سکتی ہے۔

یہ فتنہ (قومیت) جس کے ظاہر ہونے کا سید الکونین کو اندیشہ تھا حقیقت میں ویسا ہی مہلک ثابت ہوا جیسا آپؐ نے فرمایا تھا قرن اول سے آج تک اسلام اور مسلمانوں پر جو تباہی بھی نازل ہوئی ہے اسی کی بدولت ہوئی ہے وصال نبویؐ کے چند ہی برس بعد ہاشمی اقتدار کے خلاف اموی عصبیت کا فتنہ اٹھا اور اس نے اسلام کے اصلی نظام سیاست کو ہمیشہ کے لیے درہم برہم کر دیا۔ پھر اس نے عربی عجمی اور ترکی عصبیت کی شکل میں ظہور کیا اور اسلام کی سیاسی وحدت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر مختلف ممالک میں جو مسلمان سلطنتیں قائم ہوئیں ان سب کی تباہی میں سب سے زیادہ اسی فتنے کا ہاتھ تھا۔ قریب ترین زمانے میں دو سب سے بڑی مسلمان سلطنتیں ہندوستان اور ترکی تھیں۔ ان دونوں کو اسی فتنے نے تباہ کیا۔ ہندوستان میں "مغل" اور "ہندوستانی" نے سلطنت مغلیہ کو ختم کیا۔ اور ترکی میں "ترک" "عرب" اور "کرد" کی تفریق تباہی کا موجب ہوئی۔

اسلام کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے۔ جہاں کوئی طاقتور سلطنت آپ کو نظر آئے گی اس کی بنیادوں میں آپ کو، بلا امتیاز جنسیت، مختلف نسلوں، اور مختلف قوموں کا خون ملے گا۔ ان کے مدبر، ان کے سپہ سالار، ان کے اہلِ قلم، ان کے اہلِ سیف، سب کے سب مختلف الاجناس پائے جائیں گے۔ آپ عراقی کو افریقہ میں، شامی کو ایران میں، افغانی کو ہندوستان میں، مسلمان حکومتوں کی اسی جانبازی، دیانت، صداقت، اور امانت کے ساتھ خدمت کرتے ہوئے دیکھیں گے جس سے وہ خود اپنے وطن کی خدمت کرتا۔ مسلمان سلطنتیں کبھی اپنے مردانِ کار کی فراہمی میں کسی ایک ملک یا ایک نسل کے وسائل پر منحصر نہیں رہیں۔ ہر جگہ سے قابل دماغ اور کارپرداز ہاتھ ان کے لیے جمع ہوئے اور انہوں نے ہر دارالاسلام کو اپنا وطن اور گھر سمجھا۔ مگر جب نفسانیت، خود غرضی، اور عصبیت کا فتنہ اٹھا۔ اور مسلمانوں میں مرز بوم اور رنگ و نسل کے امتیازات نے راہ پائی، تو وہ ایک دوسرے سے بغض و حسد کرنے لگے، دھڑے بندیوں اور سازشوں کا دور دورہ ہوا، جو قوتیں دشمنوں کے خلاف صرف ہوتی تھیں وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں، مسلمانوں میں خانہ جنگی برپا ہوئی اور بڑی بڑی مسلمان سلطنتیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔

یہاں (اسلام میں) "قومیت" کی بنیاد نسل و وطن کے بجائے اعتقاد و عمل پر رکھی گئی ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان، ہر جنسی امتیاز کے بغیر، ایک دوسرے کے شریک حال اور معاون ہیں۔ ایک ہندی مسلمان مصر کا ویسا ہی وفادار شہری بن سکتا ہے جیسا کہ وہ خود ہندوستان کا ہے، ایک افغانی مسلمان شام کی حفاظت کے لیے اسی جانبازی کے ساتھ لڑ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ خود افغانستان کے لیے لڑتا ہے۔ اس لیے ایک ملک کے مسلمان اور دوسرے ملک کے مسلمانوں میں جغرافی، یا نسلی تفریق کی کوئی وجہ نہیں۔ اس معاملے میں اسلام کے اصول اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ جو وہاں سبب قوت ہے، وہ یہاں عین سبب ضعف ہے۔ اور جو یہاں مایۂ حیات ہے، وہ وہاں بعینہٖ سم قاتل ہے۔

مسلمانوں میں ہندیت، ترکیت، افغانیت، عربیت اور ایرانیت کے احساسات کا پیدا ہونا اسلامی قومیت [illegible] کے پارہ پارہ ہونے کا مستلزم ہے، اور یہ نتیجہ محض عقلی نہیں ہے بلکہ بارہا مشاہدہ میں آچکا ہے۔ مسلمانوں میں جب کبھی وطنی یا نسلی تعصبات پیدا ہوئے تو مسلمان نے مسلمان کا گلا تیغ سے کاٹا اور لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب

بعضکم رقاب بعض کے اندیشۂ نبوی کی تصدیق کر کے ہی چھوڑی لہٰذا وطنیت کے داعیوں کو اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دیں بلکہ جو کچھ کریں یہ جان کر کریں کہ وطنی قومیت کی دعوت محمد رسول اللہ کی دعوت کی عین ضد ہے۔

دنیا کی مختلف رنگ مختلف زبانیں مختلف نسلیں، اور مختلف وطن رکھنے والی قومیں اگر مل کر ایک قوم بن سکتی ہیں تو صرف اسی صورت سے کہ وہ سب خداوند عالم، اور اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور اس کے پاس حاضری کے دن پر ایمان لائیں۔ اس کے سوا اور کوئی چیز ان کو جمع کرنے والی نہیں ہے۔

غور کیجیے کہ وہ کیا چیز ہے جو آپ کو ایک بنیان مرصوص بناتی ہے؟ آپ میں سے ہر شخص اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ ہر شخص کا جسم الگ ہے، جان الگ ہے، طبیعتیں علیحدہ علیحدہ ہیں، مزاج مختلف ہیں۔ خیالات مختلف ہیں۔ مگر اس کے باوجود کوئی چیز ہے جو آپ کے درمیان مشترک ہے، اور وہی ایک ایسا رشتہ بن گئی ہے جس نے مختلف دانوں کو جوڑ کر ایک تسبیح بنا دیا ہے۔ وہی

ایک چیز کبھی آپ کو مسجد میں کھینچ لاتی ہے، اور ایک صف میں محمود و ایاز سب کو کھڑا کر دیتی ہے۔ وہی چیز کبھی آپ کو میدانِ جنگ میں کھینچ لے جاتی ہے اور ایک مشترک مقصد کے لیے آپ سے سرفروشی کراتی ہے۔ وہی چیز آپ کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم کراتی ہے۔ وہی آپ کو ایک دوسرے کا ہمدرد، رفیق، غمگسار بنا دیتی ہے۔ اور وہی آپ میں اور دوسری قوموں میں خطِ امتیاز کھینچتی ہے۔ مگر وہ کوئی رسی نہیں ہے جو لکڑیوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر جکڑ دیتی ہو، وہ کوئی چونا نہیں ہے جو اینٹوں کو جوڑ کر پیوستہ کر دیتا ہو۔ وہ محض ایک کلمہ ہے جس کو میں کلمۂ جامعہ کے لفظ سے اسی لیے تعبیر کرتا ہوں کہ اس میں انسانوں کو جمع کرنے کی خاصیت ہے۔

کلمہ سے مراد الفاظ نہیں ہیں، بلکہ معانی ہیں اعتقاد اور تخیل کو بھی اس لحاظ سے کلمہ کہتے ہیں کہ وہ الفاظ ہی کا جامہ پہن کر ذہن سے باہر آتا ہے اس اعتبار سے ہر وہ تخیل "کلمۂ جامعہ" کہا جا سکتا ہے جو انسانوں کی کسی بڑی تعداد کو ایک قوم بنا دیتا ہو۔

"آپ کو جمع کرنے والا کلمہ وہ نہیں ہے جس کو پہاڑ اور دریا محدود کر سکتے ہوں، نہ وہ ہے جس کو کوئی نسل محدود کر سکتی ہو، نہ وہ ہے جس کو کوئی رنگ محدود کر سکتا

ہو، نہ وہ ہے جس کو کوئی زبان یا معاشی غرض محدود کر سکتی ہو، بلکہ یہ وہ کلمہ ہے جو تمام روئے زمین پر محیط ہے، جو ساری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے، جس کو پھیلنے اور چھا جانے سے دنیا کی کوئی مادی چیز روک نہیں سکتی، جس کی بندش میں کالے اور گورے، زرد اور سفید، مغربی اور مشرقی سب یکساں بندھ سکتے ہیں اس کلمہ کو ہم اسی غیر محدود وسعت کے لحاظ سے جامع کہتے ہیں۔ یہ اسی لیے جامع ہے کہ تمام عالم کے انسانوں کو جمع کرنے کی قابلیت اس میں موجود ہے۔

زمین میں ثبات اور قرار اور پھیلاؤ اسی کلمے کو نصیب ہو سکتا ہے جو پاک اور سچا اور جامع کلمہ ہے۔ اس کے سوا جتنے کلمے ہیں سب کے سب بد اصل کلمے ہیں کسی کو ثبات و قرار نصیب ہونے والا نہیں۔ یہ خود رو درخت ہیں، آج اُگے کل اکھڑ گئے۔ زمانے کا ہر نیا حادثہ، وقت کا ہر نیا تغیر ایک نیا پودا اگاتا ہے اور پچھلے پودوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ ان پودوں میں برگ و بار لانے کی صلاحیت نہیں۔ اگر یہ بار لاتے بھی ہیں تو کڑوے کسیلے بلکہ زہریلے۔ دنیا آج انہی پودوں کے خطرناک پھلوں سے مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان پودوں سے کہیں پروپیگنڈا پیدا ہوتا ہے، کہیں ان سے زہریلی گیسیں نکلتی ہیں، کہیں ان سے

پھٹنے اور آگ لگانے والے بم جھڑتے ہیں، کہیں ان سے نفاق اور عداوت اور حسد و بغض کے بیج نکلتے ہیں۔ جن کی قسمت میں خدا کا عذاب لکھا ہے انہیں چھوڑ دیجیے کہ وہ ان پودوں سے دل بہلائیں۔ آپ کے پاس تو وہ پاک اور صحیح الاصل درخت موجود ہے جو ہبوطِ آدم کے وقت سے آج تک کبھی اکھڑا نہ بے برگ و بار ہوا۔ یہ آدم کے کسی بیٹے اور بیٹی کو اپنے سائے میں پناہ لینے اور اپنے پھلوں کا فائدہ اٹھانے سے نہیں روکتا۔ یہ کسی سے نہیں پوچھتا کہ تو کس نسل سے ہے؟ کیا زبان بولتا ہے؟ کہاں کا باشندہ ہے؟۔ اس کے سائے کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کے نیچے آگیا وہ انساب کا تفاخر بھول گیا، زبانوں کا فرق، رنگوں کا امتیاز، ملکوں کا اختلاف اس کی نگاہ میں ہیچ ہو گیا۔

یہ کلمہ اس لیے پیش کیا گیا تھا کہ [illegible] پر متفق ہو سکے اور بے شمار مادی و عقلی اختلافات کے باوجود ایک امر مشترک ایسا ہو جس میں سب بنی آدم ایک دوسرے کے بھائی بن سکیں۔ اسی لیے دین کی بنیاد ایسے امور پر رکھی گئی جن میں بڑی وسعت ہے، اور جو ساری نوعِ انسانی کو اپنے دامن میں لے سکتے ہیں۔ اسی لیے اس کلمے کے پیش کرنے والے صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا کہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا

اسی لیے کہا گیا کہ جو اس کلمے کا قائل ہو جائے اس کا خون حرام ہے اس کی عزت حرام ہے، وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کو قتل کرنے والا دائمی عذاب جہنم کا سزاوار ہے اور اس کی عزت پر حملہ کرنے والا فاسق ہے۔

میرا یہ مدعا ہرگز نہیں ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، کہ اس کلمۂ جامعہ کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا تھا۔ اختلاف تو ایک فطری امر ہے، جس کا مٹنا ممکن نہیں۔ نہ رنگوں اور نسلوں کا اختلاف مٹ سکتا ہے، نہ زبانوں اور ملکوں کا اختلاف مٹ سکتا ہے، نہ خیالات و طبائع کا اختلاف مٹ سکتا ہے۔ اور جب یہ نہیں مٹ سکتا تو ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی طور سے نوع انسانی کے گروہوں میں اعتقاد اور اغراض کے لحاظ سے اختلاف ضرور باقی رہے گا لیکن کلمۂ جامعہ کے بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ ان تمام مادی اور حسی اختلافات کے درمیان ایک عقلی، اخلاقی اور تہذیبی رابطہ پیدا کیا جائے جس کو نوع انسانی کے تمام افراد قبول کر سکتے ہوں، اور جس کو قبول کر کے وہ سب اپنے جغرافی، نسلی، معاشی، لونی اور لسانی اختلافات کے باوجود ایک قوم بن سکتے ہوں۔ اسی مقصد کے لیے ایک جامع کلمے کے ساتھ نماز میں جماعت کی تاکید کی گئی، تمام دنیا کے لیے ایک قبلہ مقرر کیا گیا، روزے اور حج کو اجتماعی صورت دی گئی،

معاشرتی اور سماجی امتیازات کو مٹایا گیا۔ تمام مسلمانوں کو مساوی قانونی مرتبہ دیا گیا اور سب کو ایک عالمگیر تہذیب کے رنگ میں رنگ دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ دین کا اتحاد تمام چھوٹے اختلافات پر غالب ہو جائے اور دنیا میں ایک ایسی "قومیت" بن جائے جو تمام نوع انسانی کو اپنے دائرے میں لے سکتی ہو۔

عقلیت اور اخلاقیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تحقیق سے جس اصول کو ہم نے حق پایا ہے، اور اخلاقاً جس کے برحق ہونے کا ہم یقین رکھتے ہیں اس پر سختی کے ساتھ قائم رہیں۔ اگر دنیا میں اس کے خلاف کوئی غلط اصول چل پڑا ہے، تو ہمارا کام دنیا کے پیچھے دوڑنا نہیں ہے، بلکہ دنیا کو کھینچ کر اپنے اصول کی طرف لانا ہے۔ اپنے اعتقاد میں ہماری پختگی کا امتحان اسی میں ہے کہ دنیا کے پیچھے نہ چلنے سے جو نقصان ہمیں پہنچتا ہو اسے صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کریں۔ اگر دنیا ہماری وقعت اس لیے نہیں کرتی کہ ہم اس کے پیچھے نہیں چلتے تو ایسی دنیا کو ہمیں ٹھوکر مارنی چاہیے۔ وقار ہمارا معبود نہیں ہے کہ اس کی خوشامد کرتے ہوئے ہم ہر اس راستے پر دوڑتے پھریں جس پر اس کی جھلک نظر آئے۔ اگر اس چیز کا زمانہ گذر گیا ہے جو ہمارے اعتقاد میں حق ہے

تو ہم میں اتنا بل بوتا ہونا چاہیے کہ زمانے کا کان پکڑ کر اسے پھر سے حق کی طرف کھینچ لائیں۔ یہ سوچ پست ہمت، شکست خوردہ لوگوں کا کام ہے کہ اب زمانے میں فلاں چیز کا چلن ہے تو چلو اس کو سمجھیں اور سمجھتے سمجھتے حلق سے نیچے بھی اتار لیں۔

میں مسلمان صرف اس وقت تک ہوں جب تک میں زندگی کے ہر معاملے میں اسلامی نظریہ رکھتا ہوں۔ جب میں اس نظریہ سے ہٹ گیا اور دوسرے نظریہ کی طرف چلا گیا تو میری جانب سے یہ سراسر بے شعوری ہوگی اگر میں یہ سمجھتا رہوں کہ اس نئے مقام پر بھی مسلمان ہونے کی حیثیت میرے ساتھ لگی چلی آئی ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظریہ اختیار کرنا صحیح [illegible] "مسلمان کمیونسٹ" ایسی ہی متناقض اصطلاحیں ہیں جیسے "کمیونسٹ فاشسٹ" یا "جینی قصائی" یا "اشتراکی مہاجن" یا [illegible]

کسی مسلک یا کسی اصول کو اس دلیل سے قبول کرنا کہ فلاں نقصان سے

بچنا ہے، اور فلاں فائدہ حاصل کرنا ہے، اور فلاں چیز اب دنیا میں نہیں چل رہی ہے بلکہ اس کی جگہ اب یہ چیز چل پڑی ہے، کسی ایسے شخص کا کام نہیں ہو سکتا جو خود اپنا کوئی اخلاقی اور عقلی نظریہ رکھتا ہو اور اپنے ضمیر کے تقاضے سے اپنے آپ کو اس کے پھیلانے اور قائم کرنے پر مامور سمجھتا ہو۔ یہ تو نری مصلحت پرستی اور ابن الوقتی (OPPORTUNISM) ہے، اس کو عقلیت اور اخلاقیت سے کیا واسطہ؟

اسلام کا خطاب انسان من حیث الانسان سے ہے۔ وہ سارے انسانوں کے لیے ایک اعتقادی و اخلاقی بنیاد پر عدل اور تقوے کا ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے، اور سب کو اس کی طرف بلاتا ہے۔ پھر جو اس نظام کو قبول کر لے اسے مساویانہ حقوق کے ساتھ اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ اس کی عبادات میں، اس کی معیشت میں، اس کی سیاست میں، اس کی معاشرت میں، اس کے قانونی حقوق اور فرائض میں، غرض اس کی کسی چیز میں بھی ان لوگوں کے درمیان کسی قسم کی قومی یا نسلی یا طبقاتی یا جغرافی تفریقات کی گنجائش نہیں جو اسلام کے مسلک کی پیروی اختیار کر لیں۔ اس کا منتہائے نظر ایک ایسی جہانی ریاست (WORLD STATE) ہے جس میں نسلی اور قومی تعصبات کی زنجیریں توڑ کر

تمام انسانوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع ترقی کے ساتھ ایک تمدنی و سیاسی نظام میں حصے دار بنایا جائے، اور مخالفانہ مقابلے کی جگہ دوستانہ تعاون پیدا کیا جائے تاکہ لوگ ایک دوسرے کی مادی خوشحالی اور روحانی ترقی میں مددگار ہوں۔ اسلام انسانی فلاح کے لیے جو اصول اور جو نظام حیات پیش کرتا ہے وہ عام انسانوں کو اپیل ہی اس وقت کر سکے گا جب کہ ان کے اندر جاہلیت کے تعصبات نہ ہوں، اور وہ اپنی قومی روایات کی وابستگی سے، نسلی تفاخر کے جذبات سے، خونی اور خاکی رشتوں کی محبت سے پاک ہو کر محض انسان ہونے کی حیثیت سے یہ جانچنے کے لیے تیار ہوں کہ حق کیا ہے، عدل و انصاف اور راستی کس چیز میں ہے، ایک طبقہ یا ایک قوم یا ایک ملک کی نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی فلاح کا راستہ کونسا ہے۔

نیشنلزم انسان اور انسان کے درمیان اس کی قومیت کے لحاظ سے تمیز کرتا ہے نیشنلزم کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہر قوم کا نیشنلسٹ اپنی قومیت کو دوسری تمام قومیتوں پر ترجیح دے۔ اگر وہ جفا کار قوم پرست (AGG RESSIVE NATIONALIST) نہ بھی ہو تب بھی قوم پرستی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ تمدنی، معاشی، سیاسی اور قانونی حیثیت سے "قومی" اور "غیر قومی" میں فرق کرے

اپنی قوم والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد محفوظ کرے، قومی مفاد کے لیے معاشی امتیازات کی دیواریں کھڑی کرے، جن تاریخی روایات اور قومی تعصبات پر اس کی قومیت قائم ہے ان کی سختی کے ساتھ حفاظت کرے اور اپنے اندر قومی افتخار کے جذبات پرورش کرے۔ وہ دوسری قومیت کے لوگوں کو مساوات کے اصول پر زندگی کے کسی شعبے میں بھی اپنے ساتھ شریک نہ کریگا۔ جہاں اس کی قوم دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فوائد و منافع سے متمتع ہو رہی ہو، یا ہو سکتی ہو، وہاں عدل و انصاف کے لیے اس کا دل اندھا ہو جائیگا۔ اس کا منتہائے نظر جہانی ریاست کے بجائے قومی ریاست (NATIONAL STATE) ہوگا، اور اگر وہ کوئی جہانی نظریہ اختیار کرے گا بھی تو اس کی صورت لازماً امپریلزم یا قیصریت کی صورت ہوگی، کیونکہ اس کے اسٹیٹ میں دوسری قومیتوں کے لوگ کسی طرح برابر کے حصے دار کی حیثیت سے داخل نہیں ہو سکتے، بلکہ غلام کی حیثیت ہی سے داخل ہو سکتے ہیں۔

جہاں نیشنلزم ہے وہاں اسلام کبھی پھل پھول نہیں سکتا، اور جہاں اسلام ہے وہاں نیشنلزم کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ نیشنلزم کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے پھیلنے کا راستہ بند ہو جائے، اور اسلام کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ

نیشنلزم جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کی ترقی کا حامی ہو سکتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بیک وقت دونوں کشتیوں پر سوار رہ سکے۔

نیشنلزم کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے اور اس کو آزاد، خوش حال اور برسر ترقی دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک شریف جذبہ ہوتا۔ لیکن درحقیقت محبت سے زیادہ عداوت، نفرت اور انتقام کے جذبات اس کو جنم دیتے اور پرورش کرتے ہیں۔ اس کا مادۂ حیات دراصل وہ آگ ہے جو قومیت کے مجروح جذبات، اور کچلے ہوئے قومی حوصلوں سے دل میں بھڑک اٹھتی ہے۔ اور یہ آگ، یہ حمیت جاہلیہ، قومی محبت کے شریفانہ جذبے کو کھلی حد سے بڑھا کر ایک ناپاک چیز بنا دیتی ہے۔ بظاہر اس کا آغاز بے انصافیوں کی تلافی کرنے سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے ساتھ کسی دوسری قوم یا قوموں نے، واقعی یا خیالی طور پر، کی ہوں۔ لیکن چونکہ کوئی اخلاقی ہدایت، کوئی روحانی تعلیم، کوئی الٰہی شریعت، اس کی رہنمائی کرنے والی اور اس کو ضابطے میں رکھنے والی نہیں ہوتی، اس لیے یہ اپنی حد سے گذر کر قیصریت (IMPERIALISM) معاشی قوم پرستی (ECONOMIC

(NATIONALISM) نسلی منافرت، جنگ اور بین الاقوامی بد امنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یورپ میں جن تخیلات اور جن اصولوں پر نیشنلزم کا نشوونما ہوا ہے وہ انسانیت کی عین ضد ہیں۔ انہوں نے انسان کو حیوانیت بلکہ درندگی کے مقام تک گرا دیا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو فساد، ظلم اور خونریزی سے بھرنے والے اور انسانی تہذیب کے پُر امن نشوو ارتقاء کو روکنے والے اصول ہیں۔ ابتدا سے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر دنیا میں جن پاک مقاصد کے لیے سعی کرتے رہے ہیں یہ اصول ان سب پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ الٰہی شریعتیں جن اغراض کے لیے دنیا میں آئی ہیں، اور آسمانی کتابیں جن اخلاقی و روحانی تعلیمات کو لے کر نازل ہوئی ہیں، یہ شیطانی اصول ان کے مد مقابل، ان کے مزاحم، اور معاند واقع ہوئے ہیں۔ یہ انسان کو تنگ دل، تنگ نظر اور متعصب بناتے ہیں۔ یہ قوموں اور نسلوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر حق اور انصاف اور انسانیت کی طرف سے اندھا کر دیتے ہیں۔ یہ مادی طاقت اور حیوانی زور کو اخلاقی حق کا قائم مقام قرار دے کر شرائع الٰہیہ کی عین بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں۔

نیشنلزم انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں صرف اپنی قوم کی بڑائی کے لیے مخصوص کرے، اور انسانیت عامہ کا نہ صرف یہ کہ مددگار نہ ہو بلکہ اپنی قوم کے مفاد پر انسانیت کے عمومی مفاد کی قربانی چڑھا دے۔ انفرادی زندگی میں جو حیثیت "خود غرضی" کی ہے، اجتماعی زندگی میں وہی حیثیت "قوم پرستی" کی ہے۔ ایک قوم پرست فطرۃً تنگ دل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ساری خوبیاں صرف اپنی قوم یا اپنی نسل ہی میں دیکھتا ہے۔ دوسری قوموں یا نسلوں میں اسے کوئی چیز ایسی قابل قدر نظر نہیں آتی جو زندگی اور بقا کی مستحق ہو۔

لفظ "قوم" اور اس کے ہم معنی انگریزی لفظ NATION یہ دونوں دراصل جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ اہل جاہلیت نے "قومیت" (NATIONALITY) کو کبھی خالص تہذیبی بنیاد (CULTURAL BASIS) پر قائم نہیں کیا، نہ قدیم جاہلیت کے دور میں، اور نہ جدید جاہلیت کے دور میں۔ ان کے دل و دماغ کے ریشے ریشے میں نسلی اور روایتی علائق کی محبت کچھ اس طرح پلا دی گئی ہے کہ وہ نسلی روابط اور تاریخی روایات کی وابستگی سے قومیت کے تصور کو کبھی پاک نہ کر سکے۔ جس طرح قدیم عرب میں قوم کا لفظ عموماً ایک نسل یا ایک قبیلے کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اسی طرح آج بھی لفظ "نیشن" کے مفہوم میں مشترک حیثیت

(COMMON DESCENT) کا تصور لازمی طور پر شامل ہے۔ اور یہ چیز چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصور اجتماع کے خلاف ہے، اس وجہ سے قرآن میں لفظ قوم اور اس کے ہم معنی دوسرے عربی الفاظ، مثلاً شعب، وغیرہ کو مسلمانوں کی جماعت کے لیے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اس جماعت کے لیے کیونکر استعمال کی جاسکتی تھی جس کے اجتماع کی اساس میں خون اور خاک اور رنگ اور اس نوع کی دوسری چیزوں کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا جس کی تالیف و ترکیب محض اصول و مسلک کی بنیاد پر کی گئی ہو اور جس کا آغاز ہی ہجرت اور قطع نسب اور ترک علائق مادی سے ہوا ہو۔

"قرآن میں جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لیے استعمال کیا گیا ہے وہ "حزب" ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں، اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں کیونکہ ان کو تمام دنیا سے الگ، اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول و مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں۔ اور جن سے ان کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں، ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ہے۔

قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے۔ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) اور دوسرے شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان)۔ شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول و مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلاف ہوں، قرآن ان سب کو ایک سمجھتا ہے۔کیونکہ ان کا طریق فکر اور طریق عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔

دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا ہے وہ لفظ "امت" ہے۔حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔ امت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امر جامع نے مجتمع کیا ہو۔جن افراد کے درمیان کوئی اصل مشترک ہو ان کو اسی اصل کے لحاظ سے "امت" کہا جاتا ہے مثلاً ایک زمانے کے لوگ بھی "امت" کہے جاتے ہیں، ایک نسل یا ایک ملک کے لوگ بھی "امت" کہے جاتے ہیں مسلمانوں کو جس اصل مشترک کی بنا پر امت کہا گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض نہیں ہیں، بلکہ وہ ان کی زندگی کا مشن اور ان کی پارٹی کا اصول اور مسلک ہے۔

تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ "جماعت" ہے اور یہ لفظ بھی "حزب" کی طرح بالکل "پارٹی" کا ہم معنی ہے۔

"مسلمان" ایک بین الاقوامی جماعت (INTERNATIONAL PARTI) کا نام ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے ان اشخاص کو چھانٹ کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص اصول کو ماننے، ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ لوگ چونکہ ہر قوم میں سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے ان کا تعلق نہیں رہا ہے، اس لیے یہ بیچ کی امت ہیں لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے ان کا ایک دوسرا تعلق قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں خدائی فوجدار کے فرائض انجام دیں۔ "تم نوع انسانی پر نگراں ہو" (لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مسلمان خدا کی طرف سے دنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔ اور "نکالا گیا ہے" کا فقرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔ اس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزب اللہ" کے لیڈر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر و عمل کا جو ضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی، اخلاقی اور مادی طاقتوں سے

کام لے کر دنیا میں نافذ کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں ہر دوسرے طریقہ کو مغلوب کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مسلمان ایک امت بنائے گئے ہیں۔

آپ ایک پارٹی کے اصول و مسلک سے ہٹ جانے کے بعد ہرگز اس میں شامل نہیں رہ سکتے، نہ اس کا نام استعمال کر سکتے ہیں، نہ اس کے نمائندے بن سکتے ہیں، نہ اس کے مفاد کے محافظ بن کر نمودار ہو سکتے ہیں، اور نہ پارٹی والوں سے آپ کا کسی طور پر تعاون ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میں پارٹی کے اصول و مسلک سے تو متفق نہیں ہوں، لیکن میرے والدین اس پارٹی کے ممبر رہ چکے ہیں، اور میرا نام اس کے ممبروں سے ملتا جلتا ہے، اس لیے مجھ کو بھی ممبروں کے سے حقوق ملنے چاہئیں، تو آپ کا یہ استدلال اتنا مضحکہ انگیز ہوگا کہ شاید سننے والوں کو آپ کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگے۔

ایک پارٹی کے ارکان میں باہمی محبت، رفاقت اور معاونت جو کچھ بھی ہوتی ہے شخصی یا خاندانی حیثیت سے نہیں ہوتی، بلکہ صرف اس بنا پر ہوتی

ہے کہ وہ سب ایک اصول کے معتقد اور ایک مسلک کے پیرو ہوتے ہیں پارٹی کا ایک رکن اگر جماعتی اصول و مسلک سے ہٹ کر کوئی کام کرے تو صرف یہی نہیں کہ اس کی مدد کرنا پارٹی والوں کا فرض نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس پارٹی والوں کا فرض یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے غدارانہ اور باغیانہ طرز عمل سے روکیں، نہ مانے تو اس کے خلاف جماعتی ضوابط کے تحت سخت کارروائی کریں پھر بھی نہ مانے تو جماعت سے نکال باہر کریں۔

مسلمان کا لفظ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ "اسم ذات" نہیں بلکہ "اسم صفت" ہی ہو سکتا ہے۔ اور "پیرو اسلام" کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ انسان کی اس خاص ذہنی، اخلاقی اور عملی صفت کو ظاہر کرتا ہے جس کا نام "اسلام" ہے۔ لہٰذا آپ اس لفظ کو شخص مسلمان کے لیے اس طرح استعمال نہیں کر سکتے جس طرح آپ ہندو یا جاپانی یا حبشی کے الفاظ شخص ہندو، شخص جاپانی یا شخص حبشی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جونہی اصول اسلام سے ہٹا اس سے مسلمان ہونے کی حیثیت خود بخود سلب ہو جاتی ہے۔ اب وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی شخصی حیثیت سے کرتا ہے۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔

اسی جاہلیت کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ آپ کے اندر "قومی مفاد" کا ایک عجیب تصور پیدا ہو گیا ہے اور آپ اس کو بے تکلف "اسلامی مفاد" بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد اسلامی مفاد یا قومی مفاد کیا چیز ہے؟ یہ کہ جو لوگ "مسلمان" کہلاتے ہیں ان کا بھلا ہو، ان کے پاس دولت آئے، ان کی عزت بڑھے، ان کو اقتدار نصیب ہو اور کسی نہ کسی طرح ان کی دنیا بن جائے بلا اس لحاظ کے کہ یہ سب فائدے اسلامی نظریہ اور اسلامی اصول کی پیروی کرتے ہوئے حاصل ہوں یا خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ پیدائشی مسلمان یا خاندانی مسلمان کو آپ "مسلمان" کہتے ہیں چاہے اس کے خیالات اور اس کے طرزِ عمل میں اسلام کی صفت کہیں ڈھونڈے نہ ملتی ہو۔ گویا آپ کے نزدیک مسلمان روح کا نہیں بلکہ جسم کا نام ہے اور صفتِ اسلام سے قطع نظر کر کے بھی ایک شخص کو مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط تصور کے ساتھ جن جسموں کا اسم ذات آپ نے مسلمان رکھ چھوڑا ہے ان کی حکومت کو آپ اسلامی حکومت، ان کی ترقی کو آپ اسلامی ترقی، ان کے فائدے کو آپ اسلامی مفاد قرار دیتے ہیں خواہ یہ حکومت اور یہ ترقی اور یہ مفاد سراسر اصول اسلام کے منافی ہی کیوں نہ ہو۔

صفت اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان سرے سے کوئی شے ہی نہیں ہے۔ آپ کبھی اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت سے قطع نظر کر کے کسی شخص یا کسی قوم کا نام اشتراکی ہے، اور اس معنی میں کسی مفاد کو اشتراکی مفاد یا کسی حکومت یا کسی تنظیم کو اشتراکیوں کی حکومت یا تنظیم، یا کسی ترقی کو اشتراکیوں کی ترقی کہا جا سکتا ہے۔ پھر آخر مسلمان کے معاملے میں آپ نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان کسی شخص یا قوم کا ذاتی نام ہے اور اس کی ہر چیز کو اسلامی کہہ دیا جا سکتا ہے۔

یہی ٹیڑھا زاویۂ نظر آپ نے اپنی ملّی سیاست میں بھی اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام کے اصول و نظریات اور اس کے مشن سے قطع نظر کر کے آپ ایک قوم کو "مسلم قوم" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس قوم کی طرف سے، یا اس کے نام سے، یا اس کے لیے، ہر شخص اور ہر گروہ من مانی کارروائیاں کر سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ بلکہ ان کا لیڈر بھی بن سکتا ہے جو "مسلمانوں" کی قوم سے تعلق رکھتا ہو خواہ اس غریب کو اسلام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ آپ ہر اس پارٹی کے ساتھ لگ چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی پیروی میں آپ کو کسی نوعیت کا فائدہ نظر آ سکے، خواہ اس کا مشن اسلام کے

مشن سے کتنا ہی مختلف ہو۔ آپ خوش ہو جاتے ہیں جب مسلمانوں کو چار روٹیاں ملنے کا کوئی انتظام ہو جائے، خواہ اسلام کی نگاہ میں وہ حرام کی روٹیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ پھولے نہیں سماتے جب کسی جگہ مسلمان آپ کو اقتدار کی کرسی پہ بیٹھا نظر آتا ہے، خواہ وہ اس اقتدار کو بالکل اسی طرح غیر اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہو جس طرح ایک غیر مسلم کر سکتا ہے۔ آپ اکثر ان چیزوں کا نام اسلامی مفاد رکھتے ہیں جو حقیقتاً غیر اسلامی ہیں۔ ان اداروں کی حمایت و حفاظت پر اپنا زور صرف کرتے ہیں جو اصول اسلام کے بالکل خلاف قائم ہوتے ہیں۔ اور ان مقاصد کے پیچھے اپنا روپیہ اور اپنی قومی طاقت ضائع کرتے ہیں جو ہرگز اسلامی نہیں ہیں۔ یہ سب نتائج اسی ایک بنیادی غلطی کے ہیں کہ آپ نے اپنے آپ کو محض ایک "قوم" سمجھ لیا ہے۔ اور اس حقیقت کو آپ بھول گئے ہیں کہ دراصل آپ ایک "بین الاقوامی پارٹی" ہیں جس کا کوئی مفاد اور کوئی مقصد اپنی پارٹی کے اصولوں کو دنیا میں حکمراں بنانے کے سوا نہیں ہے۔ جب تک آپ اپنے اندر قوم کے بجائے پارٹی کا تصور پیدا نہ کریں گے اور اس کو ایک زندہ تصور نہ بنائیں گے، زندگی کے کسی معاملہ میں بھی آپ کا رویہ درست نہ ہوگا۔

اس غلط فہمی نے بنیادی طور پر اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی تاریخ

کے متعلق آپ کے رویّہ کو غلط کر دیا ہے۔ جو بادشاہتیں اور حکومتیں غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہوئی تھیں آپ ان کو "اسلامی حکومتیں" کہتے ہیں محض اس لیے کہ ان کے تخت نشین مسلمان تھے۔ جو تمدن قرطبہ و بغداد اور دہلی و قاہرہ کے عیش پرست درباروں میں پرورش پایا تھا، آپ اسے "اسلامی تمدن" کہتے ہیں حالانکہ اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ آپ سے جب اسلامی تہذیب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرے کے تاج محل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں گویا یہ ہے اس تہذیب کا سب سے زیادہ نمایاں نمونہ حالانکہ اسلامی تہذیب سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ ایک میت کو سپرد خاک کرنے کے لیے ایکڑوں زمین مستقل طور پر گھیر لی جائے اور اس پر لاکھوں روپے کی عمارت تیار کی جائے۔ آپ جب اسلامی تاریخ کے مفاخر بیان کرنے پر آتے ہیں تو عباسیوں، سلجوقیوں اور مغلوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان کارناموں کا بڑا حصہ آب زر سے نہیں بلکہ سیاہ روشنائی سے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا نام "اسلامی تاریخ" رکھ چھوڑا ہے، بلکہ آپ اسے "تاریخ اسلام" بھی کہہ دیتے ہیں، گویا ان بادشاہوں کا نام اسلام ہے۔ آپ بجائے اس کے کہ اسلام کے مشن اور اس کے اصول و نظریات کو سامنے رکھ کر اپنی گزشتہ تاریخ کا احتساب کریں اور پورے انصاف

کے ساتھ اسلامی حرکات کو غیر اسلامی حرکات سے ممتاز کر کے دکھیں اور دکھائیں اسلامی تاریخ کی خدمت آپ اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کی حمایت و مدافعت کریں۔ آپ کے زاویۂ نظر میں یہ کجی صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ مسلمان کی ہر چیز کو "اسلامی" سمجھتے ہیں اور آپ کا گمان یہ ہے کہ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے وہ اگر غیر مسلمانہ طریق پر بھی کام کرے تو اس کے کام کو مسلمان کا کام کہا جا سکتا ہے۔

یہ (اسلامی جماعت) نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (RATIONAL NATIONALITY) بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (EXPANDING NATIONALITY) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو عقلی اور تہذیبی وحدت کی بنیاد پر روئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے، کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے۔

مسلمان دراصل اسی قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن (CIVILIZATION) بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (WORLD NATIONALISM) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنے نظریۂ حیات اور فلسفۂ اجتماعی (SOCIAL PHILOSOPHY) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی عمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے "قوم" ہونے کے باوجود یہ حقیقت میں "جماعت" ہی رہتی ہے، کیونکہ محض اتفاقی پیدائش (MERE ACCIDENT OF BIRTH) کسی شخص کو اس قوم کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو۔ اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اس کے لیے اس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔

یہی چیز ہے جس کو میں مسلمانوں کا تنزل کہتا ہوں، اور اسی تنزل کے خلاف

احتجاج کرنے کے لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو، اور تمہاری نجات صرف اس چیز میں ہے کہ اپنے اندر جماعتی احساس (PARTY SENSE) پیدا کرو۔

دُوسروں کی نظر میں

۳۲۰

چند نقوش زندگی

ماہر القادری

تنزیہ کامل اللہ تعالیٰ کی ذات کو سزاوار ہے اور عصمت انبیاء کرام کے لیے مخصوص ہے۔ دنیا میں کوئی شخص چاہے وہ علم و تقویٰ کے کتنے ہی بلند مقام پر فائز کیوں نہ ہو "معصوم" نہیں ہے۔ انبیاء معصوم ہوتے ہیں، غیر انبیاء معصوم نہیں ہوتے!

انسانوں کی زندگی کو جانچنے کا یہ پیمانہ انتہا پسندی کا ایک اعجوبہ ہے کہ یا تو آدمی بالکل فرشتہ ہو، اور جو فرشتہ نہیں وہ لامحالہ شیطان ہوگا۔ ان دو انتہاؤں کو انسانی زندگی کے لیے معیار ماننا ہی بنیادی غلطی ہے!

آدمی زندگی کے بہت سے ادوار اور مرحلوں سے گزرتا ہے، وہ تجربوں سے بہت کچھ سیکھتا بھی ہے، وہ ٹھوکر کھا کھا کر سنبھلتا بھی ہے۔ تلاش و جستجو کی راہ میں ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں آدمی حق کو دیکھ کر سوال کرتا ہے کہ کیا واقعی یہ حق ہے؟

کبھی کبھار باطل پر بھی اس کو حق کا دھوکا ہو جاتا ہے، اور جب دھوکے کا پردہ ہٹ جاتا ہے تو اپنے پچھلے تصور سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ معصوم بلکہ معصوموں کے امام تھے، لیکن قرآن پاک نے بعثت سے قبل کی زندگی کو جو اظہار حق اور اعلان حق کے لیے عالم انتظار تھا، ضلال" (ووجدک ضالاً فھدیٰ) سے تعبیر کیا ہے! — تو پھر دنیا میں کون ایسا ہے جس کی زندگی شروع سے لے کر آخر تک یک رنگ رہی ہو اور اس میں اُتار چڑھاؤ نہ آئے ہوں!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بہرحال انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں۔ ان پر بھی عام انسانوں کی زندگیوں کی طرح مختلف دور گزرے ہیں۔ فکر وعمل کے اعتبار سے جیسے وہ آج ہیں، اپنے ابتدائی دور میں ایسے نہ تھے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مولانا مودودی کی زندگی کا وہ دور جسے ان کی موجودہ زندگی کے اعتبار سے "دورِ جہالت" کہا جا سکتا ہے، ایک شریفانہ زندگی کا دور رہا ہے۔

میں خود مولانا مودودی سے عقیدت رکھتا ہوں، اور میرا یقین ہے کہ اس زمانے میں ان کی زبان و قلم نے دین کی جو خدمت انجام دی ہے اس کی مثال دورِ حاضر میں ملنی مشکل ہے، عجم ہی نہیں عرب میں بھی! — لیکن اس اعتراف کے باوجود علم و تقویٰ میں مولانا مودودی صاحب کو میں امام ابوحنیفہؒ اور امام ابن تیمیہؒ جیسے بزرگوں کے برابر نہیں سمجھتا۔

مولانا مودودی سے میری سب سے پہلی ملاقات اب سے ستائیس سال پہلے ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں وہ صرف "سید ابوالاعلیٰ مودودی" کہلاتے تھے۔ "مولانا" ان کے نام کے ساتھ نہیں لکھا جاتا تھا۔ مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی، جو ان کے ننہالی رشتہ دار بھی ہوتے ہیں، انہی کے ہمراہ مولانا مودودی صاحب سے تعارف ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مودودی صاحب نے کچھ دن پہلے سہ روزہ "الجمعیۃ" کی ملازمت (ایڈیٹری) ترک کی تھی، اور حیدرآباد دکن جانے کی تیاری کر رہے تھے، بلکہ رخت سفر باندھ چکے تھے۔

اس سے پہلے میں نے مولانا مودودی کی کوئی تحریر نہیں پڑھی تھی، بلکہ ان کا نام تک نہیں سنا تھا۔ بہرحال جب "مسٹر ابوالاعلیٰ مودودی" نام کے ایک خوش پوشاک اور موزوں قامت شخص سے ملاقات ہوئی، جس کی نشست و برخاست میں وقار اور گفتگو میں سنجیدگی پائی جاتی تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت مولانا مودودی کے مکان میں کھانا نہیں پُرتکلف دعوت کھائی۔ دعوت مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی کی تھی، میں تو طفیلی تھا۔ مودودی صاحب نے جس کمرے میں ہم کو بٹھایا اور کھانا کھلایا وہ سجا ہوا تو نہ تھا مگر جو چیز جہاں رکھی تھی اس میں سلیقہ پایا جاتا تھا۔ اس کمرے کو دیکھ کر ایک نیا آدمی یہ قیاس کر سکتا تھا کہ جو کوئی اس کمرے میں رہتا ہے وہ سلیقہ مند ہے اور اس کی زندگی اکھڑی اکھڑی اور غیر مرتب نہیں ہے!

میں اس زمانے میں بیکار تھا۔ میٹرک کا امتحان پاس کیے ہوئے ڈیڑھ دو سال ہو رہے تھے۔ مضمون نگاری کا شوق تھا اور سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ کسی اخبار یا رسالہ کی ادارت سے وابستہ ہو جاؤں۔ مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی کی سفارش پر مودودی صاحب نے مجھے مولانا احمد سعید صاحب دہلوی سے ملا دیا جو جمعیۃ علماء کے ناظم بھی تھے اور اخبار "الجمعیۃ" کی نگرانی بھی انہی کے سپرد تھی۔ مودودی صاحب کی سفارش پر مجھے "الجمعیۃ" میں رکھ لیا گیا۔ دوسرے اخباروں کی خبروں کا انتخاب مجھ سے متعلق تھا مگر یہ تعلق مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے زائد قائم نہ رہ سکا۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ تقریباً دو سال کے بعد خود میرا حیدرآباد دکن جانا ہو گیا۔ مولانا مودودی وہاں پہلے سے پہنچ چکے تھے اور اپنے بڑے بھائی سید ابوالخیر صاحب مودودی کے یہاں مقیم تھے۔ ابوالخیر صاحب دارالترجمہ عثمانیہ کے رکن تھے۔ عربی کتابوں کا ترجمہ ان سے متعلق تھا۔ بنگلے نما مکان تھا، سواری کے لیے موٹر تھی، نوکر چاکر تھے۔ اسی خوشحال ماحول میں مودودی صاحب اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں خوب میل جول تھا بلکہ قدرے بے تکلفی بھی تھی۔ اگرچہ طبیعتوں اور مزاجوں میں کافی فرق تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ مودودی صاحب نے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی ادارت کب سنبھالی مگر اتنا یاد ہے کہ اب وہ معظم جاہی مارکیٹ سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک دو منزلہ مکان کے اوپر کے فلیٹ میں رہتے تھے، اور ابوالخیر صاحب کے

یہاں سے اُٹھ آتے تھے۔

نواب نثار یار جنگ بہادر کا نام تھا نثار احمد۔ علی گڑھ کے سادات میں سے تھے۔ چھوٹی سی عمر میں تلاش روزگار کے لیے گھر سے نکل کر بمبئی پہنچے، پھر حیدرآباد آتے اور وہاں معمولی نوکری سے ترقی کر کے اول تعلقدار (کلکٹر ضلع) ہو گئے۔ شاعری میں "داغ دہلوی" سے تلمذ تھا، مزاج تخلص کرتے تھے۔ اس زمانے کے "اعلیٰ حضرت" اور موجودہ نظام کے "نواب میر عثمان علی خاں" نے ان کو "نثار یار جنگ" کا خطاب دیا، اس لیے وہ اب "نواب نثار یار جنگ بہادر" کہے جانے لگے۔ لیکن ان کا قیاس یوپی کے نوابوں اور جاگیرداروں پر نہیں کرنا چاہیے۔ بڑی سادہ اور فقیر منش طبیعت پائی تھی، علم دوست تھے اور دین سے خاصا شغف تھا۔ نواب صاحب مرحوم سے میرے بڑی بے تکلفی کے مراسم تھے۔ "ترجمان القرآن" میں مولانا مودودی کے مضامین پڑھ کر ان سے بہت کچھ متاثر ہو گئے۔ مودودی صاحب اور نثار یار جنگ مرحوم میں بڑے اخلاص کا دوستانہ تھا۔

نواب نثار جنگ بہادر اور میں مولانا مودودی سے ملنے کے لیے جاتے رہتے تھے۔ مودودی صاحب از خود نواب صاحب کے یہاں بہت کم جاتے تھے۔ ہاں ایسا ہوتا کہ نواب صاحب نے موٹر بھیج کر انہیں بلوا لیا یا دعوت ہوتی تو مولانا اس میں شریک ہو گئے۔

ہمارے شدید اصرار پر ان دنوں مولانا مودودی نے دو یا تین بار سینما بھی دیکھا:

مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مجھ پر تو فلم کا نشہ سا سوار تھا اور مولانا مودودی پر ذرہ برابر اثر نہ تھا جیسے انہوں نے فلمی تصویر دیکھی ہی نہ تھی اور دیکھی تھی تو اس کا شاید کوئی نقش ہی قبول نہیں کیا۔ سینما کی بلا چلتے وقت ہم سینما ہال میں ذہن و فکر و خیال سے جھٹک کر چلے آئے۔

اس کے بعد بھی ہم نے مودودی صاحب سے سینما چلنے کے لیے کہا، یا یوں سمجھیے انہیں بہکایا تو وہ طرح دے گئے اور پھر ہمیں بھی اس کا احساس ہو گیا کہ یہ شخص ان بکھیڑوں میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔

ایک بار نواب صاحب مرحوم کے یہاں کھانے کی دعوت تھی۔ مولانا مودودی کو بھی اس دعوت میں بلایا گیا۔ کھانے کے بعد گانے بجانے کی محفل جمی تو سب مدعو لوگوں کے ساتھ مولانا مودودی بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں مودودی صاحب ڈاڑھی بھی منڈواتے تھے اور ان کے اسی دور کو "جاہلیت کا دور" کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ ۱۹۳۴ء کا مودودی ۱۹۵۵ء میں مجاہد اور تحریک اسلامی کا قائد و علمبردار ہو گا جس کی ایمانی جرأت اور نیکی اور علم کو لوگ مثال میں پیش کریں گے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم! اللہ تعالیٰ ہر کسی کا انجام بخیر کرے اور کسی سے بھول چوک ہو جائے تو اس پر جمنے نہ دے۔

(خود میری اپنی زندگی بھی میرے سامنے ہے۔ میں نے دوسروں کو بھی قریب سے

دیکھا ہے اور ہر دشت کی بادیہ پیمائی کی ہے ۔ یہ میں فخر کے ساتھ نہیں ندامت کے ساتھ کہہ رہا ہوں، ہر منزل میں بھٹکتے پھرنا کوئی فخر کی بات نہیں ہے ۔ سینکڑوں لوگ جن میں علماء تک شامل ہیں ان کی زندگیوں کے مطالعہ و مشاہدہ کے بعد ہی میں مولانا مودودی کے علم و فضل ہی سے نہیں ان کی زندگی سے بھی متاثر ہوا ہوں بہت سے لوگوں کے ابتدائی زندگی کے مقابلہ میں مودودی صاحب کی زندگی کا یہ دور بھی شریفانہ دور تھا ۔ جو کوئی مودودی صاحب کو معصوم سمجھتا ہے اس کی عقیدت کو ان واقعات سے صدمہ پہنچے تو میں کیا کروں ۔ میں کسی کی عقیدت کی خاطر واقعات کو چھپا تو نہیں سکتا ۔۔۔ آئینہ وہی بتائے گا جو کچھ وہ دیکھتا ہے !

مولانا مودودی تنہا رہتے تھے ۔ اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی ایک ملازم تھا جو ڈاک خانے ڈاک وغیرہ لے جانے کا کام بھی کرتا تھا ۔ میں اور نواب نثار جنگ کبھی ان سے ملنے کے لیے آجاتے اور جانے کا وقت ہوتا تو مولانا کے یہاں چائے بھی پیتے کئی بار ان کے ہاتھ کے تلے ہوئے انڈے بھی کھائے !

مولانا مودودی کے ترغیب دلانے پر نواب صاحب مرحوم نے اپنے یہاں کے تمام زیورات کی کئی سال تک کی زکوٰۃ ادا کی ۔ خود مودودی صاحب نے کانٹے میں ایک ایک زیور کو تول تول کر اس کا وزن لکھا ۔

ایک دعوت میں مولانا مودودی نے فانی بدایونی مرحوم کی اس غزل کی جس کا مطلع ہے ؂

گلِ خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے
ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے

بہت تعریف کی تمانی نے کہا "مولانا! آپ کو غزل پسند ہو تو میں لکھ کر دے دوں۔"
مولانا مسکرا کر بولے "ضرور ۔ میرا دل بھی چاہتا تھا مگر غیرت نے گوارا نہ کیا کہ
آپ سے غزل کے لیے سوال کروں۔"

میرا ایک افسانہ ماہنامہ "ساقی" میں چھپا تھا۔ نواب نثار جنگ بہادر کے
ساتھ مولانا مودودی میرے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ بولے "میں نے تمہارا
افسانہ ساقی میں پڑھا، ابتدائی حصہ پڑھنے میں احساس ہوا کہ ہمارے یہاں بھی
ایک تیجوف پیدا ہوگیا، مگر تم نے آخر میں جا کر وہ معاشقہ لڑایا کہ افسانہ کی ساری
خوبی خاک میں مل گئی۔"

ریاست حیدرآباد دکن کا محکمہ امورِ مذہبی رسالہ ترجمان القرآن کے کئی سو پرچے
خریدتا تھا۔ ایک سال یہ خریداری روک دی گئی۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر سے
اس کی منظوری متعلق تھی۔ نواب صاحب یہ چاہتے تھے، بلکہ متمنی تھے کہ
مودودی صاحب ان سے خود آکر کہیں تو وہ منظوری دے دیں۔ مولانا مودودی
صاحب کو جب یہ اطلاع ملی تو بولے کہ میں قیامت تک اس کام کے لیے
ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ یہ میرا نہیں دین کا کام ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب
نہیں گئے اور انہیں خاصا مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

کتاب کا نام تو یاد نہیں رہا، غالباً محقق طوسی کی کوئی کتاب تھی[1] جو عربی سے اُردو میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ کی طرف سے مولانا مودودی کو معاوضہ پر دی گئی تھی۔ اس کتاب کے متعلق بعض اہلِ علم نے مجھ سے کہا کہ اس کا سمجھنا تو دشوار شاید ٹھیک طرح اس کے پڑھنے والے بھی ہندوستان میں دس پانچ ہی ہوں گے۔ مولانا مودودی نے اس پوری کتاب کا یا اس کے چند اجزا کا ترجمہ کر کے دے دیا، اور جو معاوضہ ملا اس کی "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" کی تمام جلدیں خرید لیں۔ مجھ سے کہنے لگے کہ منشی جی! یہ رقم تو کسی نہ کسی طرح کام میں خرچ ہو ہی جاتی، میں نے ہمت کر کے یہ کتاب بھی خرید لی۔[2]

پھر کئی سال کے بعد مولانا پٹھان کوٹ چلے گئے اور وہاں باقاعدہ جماعت اسلامی

---

[1] محقق طوسی کی نہیں، ملا صدرا شیرازی کی "الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار العقلیہ" تھی۔ جو اہلِ فن کے درمیان اسفار اربعہ کے نام سے معروف ہے۔ اس کے دو سفروں کا ترجمہ مولانا مودودی صاحب نے کیا۔ اگر یہ کتاب شائع ہو جاتی تو ۲۲×۲۹/۸ کے سائز کے تین ہزار صفحات ہوتے۔ یہاں قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ مولانا مودودی نے اس دقیق کتاب کے اتنے صفحات کا ترجمہ صرف آٹھ مہینے میں مکمل کر کے ادارے کے حوالے کر دیا۔ مولانا کی زندگی میں اس کتاب کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اسی کے معاوضے سے مولانا نے ترجمان القرآن جاری کیا اور پانچ ہزار روپے اس کے لیے وقف کر دیے تاکہ خریداروں کی قلت کی وجہ سے رسالہ بند نہ ہو۔

[2] صرف برٹانیکا ہی نہیں بلکہ تفسیر و حدیث و عقلیات و ادب کی کتابیں بھی خریدی تھیں

قائم کر دی جو آج پاکستان کی سب سے زیادہ مخلص منظم اور مفید جماعت ہے سنہ تو یاد نہیں رہا، بہر حال دو تین سال کے بعد حیدر آباد دکن کے اجتماع میں وہ آئے۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز اور مولانا عبد العزیز صاحب شرقی بھی ان کے ساتھ تھے۔ اب عالم ہی دوسرا تھا۔ ان کی تقریر سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس سے پہلے ان کی کبھی تقریر ہی نہ سنی تھی۔ مجھے خود تقریر کی تھوڑی بہت مشق ہے اور خلافت، کانگریس، مسلم لیگ، جمعیتہ علما کے لیڈروں، عالموں، یہاں تک کہ شیعہ مقررین کی تقریریں بھی سنی ہیں، لیکن مولانا کی تقریر میں جو ربط، تسلسل اور مواد پایا وہ اپنی آپ مثال تھا۔

میں نے مودودی صاحب سے دریافت کیا تو بولے کہ "میں نے جب پہلی تقریر کرنی چاہی تو سوچ کر کچھ نوٹ لکھ لیے اور تقریر کر ڈالی۔ اس دن سے بس مشق ہو گئی" ۔۔۔ ایک خاموش آدمی کا ایکا ایکی مقرر بن جانا اور تقریر بھی کیسا کہ اپنے طرز میں منفرد، کمال نہیں تو اور کیا ہے! ۔ ان کا یہ جوہر بہت دن تک دبا رہا اور جب ابھرا تو لوگ دنگ رہ گئے۔

زمانہ گزرتا گیا، حالات بدلتے گئے ۔۔۔ پھر میری ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ چودھری محمد علی صاحب، جو اس وقت پاکستان میں وزیر خزانہ ہیں، اس وقت ملٹری اکاؤنٹس میں ڈپٹی سکرٹری تھے۔ ان کی کوٹھی میں مولانا مودودی کا قیام تھا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا کی مسہری پر انگریزی کی ایک ضخیم کتاب رکھی ہوئی ہے۔

یہ کمیونزم پر جدید ترین معلومات آخرین کتاب تھی۔ اس سے مولانا کی وسعت مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کا بھی کہ وہ زمانے کے جدید رجحانات سے پورے باخبر رہتے ہیں۔

میں نے دہلی میں اُن سے کہا کہ میں جماعت اسلامی میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ مسکرا کر فرمایا "پہلے مشاعروں سے اچھی طرح سیر ہو لو پھر ادھر آنا۔ یہ نہ ہو کہ جماعت میں شامل ہو کر پھر پچھتاؤ کہ ہائے وہ مشاعرے اور وہ لذتیں کیا ہوئیں"۔ میں نے دہلی میں اُن سے دریافت کیا کہ "لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم" کے ورد رکھنے پر حدیث میں بڑے ثواب کی امید دلائی گئی ہے۔ اس پر مودودی صاحب کا چہرہ ایک خاص کیفیت سے جھلک اٹھا۔ بولے "اگر کوئی اس کلمہ کو دل میں اُتار لے تو اللہ کے سوا کسی سے بھی خوف نہ کرے"!

"تفہیم القرآن" کے ترجمہ کے سلسلہ میں دو لفظوں کی میں نے نشان دہی کی اور خط لکھا کہ انہیں بدل دیجیے، تو میری بات مان لی۔

تقسیم ہند کے بعد لاہور اور کراچی میں بارہا ملاقاتیں ہوئیں، اور بہت دیر تک مولانا کی صحبت سے استفادہ کا موقعہ ملا — ایک بار جناب ظفر احمد صاحب انصاری نے مولانا کی تحسین کی کہ آپ نے یہ تدبیر اچھی سوچی۔ اس پر مولانا فوراً بولے "اللہ تعالیٰ نے ایک بات وقت پر سجھا دی"۔

پاکستانی دستور کے بنیادی مسائل کی رپورٹ پر جب کراچی میں علماء

غور و خوض کر رہے تھے تو مولانا مودودی کے پیر میں سخت تکلیف تھی، اور مجلس مشورت میں فرش پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کو فرش پر گھٹنوں بیٹھنا پڑتا ہے، آپ کی پنڈلی کے زخموں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ بولے "برداشت کرتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھوں تو ممکن ہے کوئی صاحب ناراض ہو جائیں اور کچھ اور سمجھنے لگیں"۔

ایک بار پان کا ذکر نکلا۔ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ تو بڑے شوق سے مزہ لے لے کر تمباکو کھاتے ہیں مگر میرا یہ عالم ہے کہ چھالیہ میں تمباکو چھو بھی جائے تو میں اس چھالیہ کو نہیں کھا سکتا! اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ میں بھی پہلے تمباکو نہیں کھاتا تھا۔ ایک بار کسی صاحب نے تمباکو کا پان کھلا دیا اور اس پان کو کھا کر مجھے گھماؤ آئی۔ پس اس گھمائی کے بعد مجھے تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ مگر اس عادت پر اتنا قابو بھی ہے کہ جیل میں جاتا ہوں تو وہاں پان کی یاد تک نہیں آتی۔

مولانا نے اپنے صاحبزادے (غالباً فاروق نام ہے) کو کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ہم تینوں موٹر میں جا رہے تھے مولانا کے صاحبزادے انجن، مشینوں اور کل پرزوں کا بار بار ذکر نکالتے تھے۔ میں نے کہا کہ ان کو اس فن سے بہت دل چسپی ہے۔ مسکرا کر بولے:

"باپ مولوی، بیٹا لوہار!"

مولانا کی طبیعت میں مزاح بھی ہے اور کبھی کبھار خاصی شوخ بات بھی کہہ دیتے ہیں۔ جس زمانے میں علماء کرام دستوری رپورٹ پر مشورت کر رہے تھے ایک صاحب نے پوچھا "مولانا! علما کی مجلس مشورت کا کیا رنگ ہے؟" فرمایا

"صبغۃ اللہ"

(۲)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دنیائے اسلام کا وہ عظیم مفکر جس نے مسلمانوں میں خالص اسلامی فکر پیدا کی، اور لوگوں کے سوچنے کے طرز کو بدل دیا ——— کتاب و سنت کا ترجمان، حق کا مناد، جس کی ذات صداقت کی نشر گاہ ہے ——— اسلامی روایات کے دھندلے نقوش کو ابھارنے والا ——— اللہ کے دین کا وہ مخلص خدمت گزار جس کے قول و فعل پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ——— جس کی ساری جوانی خدمت دین کی نذر ہو گئی اور اسی غم، فکر اور محنت نے جسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ——— جس کی زبان اور قلم بڑی جرأت مندی سے حق کا اعلان کرتے ہیں ——— اتنا بڑا عالم جو بیک وقت واحد میں قرآن، حدیث، فقہ، علم کلام

فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، معاشیات اور دستور و سیاسیات پر مجتہدانہ گفتگو کرسکتا ہے ——— استدلال کا بادشاہ اور عقلیات کا امام جس نے مشرق ہی نہیں مغرب کے افکار کو بھی پڑھا ہے، پرکھا ہے اور جانچا ہے ——— تعلق باللہ اور اطاعت رسولؐ کا داعی ——— ملتان جیل کی چار دیواری اور قلعہ لاہور کی کال کوٹھری بھی جس کے پیام کو نہ روک سکیں اور کفر کے فتووں کا شور جس کی آواز کو نہ دبا سکا ——— کتاب و سنت کی کسوٹی پر ہر کسی کے قول و عمل کو پرکھنے اور کسنے والا، اور جو کچھ کسوٹی بتائے اُس کے اظہار میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہ ہونے والا ——— اقامت دین جس کا مشن، شہادت حق جس کا پروگرام اور رضائے الٰہی جس کا مقصود تھا ——— اظہار حق کی خاطر جو ساری دنیا کی ناخوشی کی بھی پروا نہیں کرتا اور اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی کے نقصان سے بھی نہیں ڈرتا، ——— نافہموں نے اس پر طرح طرح کی تہمتیں جوڑیں اور دشنام طرازیاں کیں مگر اُس نے صبر کیا ——— اردو ادب کو جس کے قلم نے بلندی اور پاکیزگی عطا کی ——— جس کی تحریریں اردو زبان کا گراں قدر سرمایہ ہیں ——— تقریر میں ایک نئے طرز کا موجد، بولتا ہے تو تھمتے ہوئے طوفان اور ٹھہری ہوئی بجلیوں کا سماں بندھ جاتا ہے ——— "قادیانیت" جس کے نام سے تھراتی ہے اور منکرین حدیث پر جس کا ذکر سن کر کابوس کے

دوسرے پڑنے لگتے ہیں ——— حامئ سنت اور قامع شرک و بدعت ——— اس علمی وقار اور غیر معمولی شہرت کے باوجود عام لوگوں سے اس قدر بے تکلفی، سادگی اور خوش طبعی سے ملتے ہے جیسے وہ اپنے کو کسی سے ذرا بھی ممتاز اور بلند نہیں سمجھتا ——— صرف عالم، مفکر، مقرر اور انشاپرداز ہی نہیں مجاہد بھی کہ سزائے موت کی خبر سُن کر بھی جس کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی گئی ——— تاریخ کی پیداوار نہیں بلکہ خود "تاریخ ساز"!

ایک رفیق کے تاثرات

ملک غلام علی

ادارۂ تسنیم کے معزز ارکان نے مجھ سے یہ چاہا ہے کہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی سیرت و شخصیت پر ایک مختصر مضمون لکھوں۔ اس موضوع پر کچھ سپردِ قلم کرنا مجھے کئی وجوہ سے بہت دشوار نظر آرہا ہے۔ مجھے اگرچہ پندرہ سال سے مولانا کی قربت کا شرف حاصل رہا ہے لیکن میرا اور خود مولانا محترم کا مزاج اور مذاق کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک دوسرے کے ذاتی حالات اور سوانح حیات پر تفصیلی گفتگو کے مواقع شاذ و نادر ہی پیدا ہوسکے ہیں۔ مولانا کے سابقہ شخصی حالات کو مرتب اور مفصل طور پر معلوم کرنے کی تحریک میرے اندر اس وجہ سے بھی پیدا نہیں ہوئی کہ آپ کے ساتھ چند ماہ رہ کر ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ آپ کی زندگی ایک ایسی کھلی ہوئی کتاب ہے اور اس کے متعدد ابواب،

باہم دگر ایسے مربوط اور مشابہ ہیں کہ ان میں سے کسی ایک باب کا بلکہ ایک ورق کا بھی مطالعہ بغور کر لیا جائے تو بقیہ ابواب و اوراق کے مطالعے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور پوری کتاب کے بارے میں ایک صحیح اور جامع رائے قائم کر لینا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔

شخصی حالات کے علاوہ جہاں تک مولانا کی عمومی سیرت و کردار کا تعلق ہے خوش قسمتی سے اس سے متعارف ہونے کے مجھے بہت قریبی مواقع میسر آئے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ کسی عظیم شخصیت کی صحبت و رفاقت کے دوران میں گوناگوں تجربات مشاہدات اور تاثرات کے جو نقوش دل و دماغ پر قائم ہو جاتے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہنانا اور پھر انہیں کسی مختصر مضمون کی شکل میں سمیٹنا کوئی آسان کام نہیں ہے ایسی حالت میں انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں سے شروع کرے اور کہاں جا کر ختم کرے۔ کس چیز کو بیان کرے اور کس چیز کو چھوڑ دے۔ تاہم محض تعمیل ارشاد کی خاطر میں کوشش کروں گا کہ اپنے علم و احساس کی حد تک مولانا مودودی کی سوانح حیات اور ان کی سیرت و کردار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کروں۔

مولانا مودودی کا سن ولادت ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) اور جائے پیدائش اورنگ آباد دکن ہے۔ آپ کا آبائی تعلق سادات کے ایک ایسے خاندان سے ہے جو ابتداً میں ہرات کے قریب چشت کے معروف مقام پر آ کر آباد ہوا تھا۔ اسی خاندان کے ایک مشہور بزرگ خواجہ قطب الدینؒ مودود چشتی تھے جو خواجہ معین الدینؒ اجمیری کے شیخ الشیوخ تھے۔ مولانا محترم کا خاندان خواجہ مودودؒ کے نام نامی سے ہی منسوب ہے۔ اس خاندان

کی جس شاخ سے مولانا مودودی وابستہ ہیں اس شاخ کے جد امجد حضرت ابوالاعلیٰ مودودی سکندر لودھی کے زمانے میں ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے تھے اور آپ کی اولاد دہلی میں اقامت پذیر ہوئی۔ مولانا مودودی کا نام والدین نے اپنے انہی بزرگ کے نام پر رکھا تھا۔ بعض لوگ غلطی سے اس نام کو کنیت سمجھ لیتے ہیں۔ مولانا کی خاندانی قرابت سر سید احمد خاں مرحوم سے بھی ہے۔ اسی وجہ سے سر سید مرحوم نے خود مولانا کے والد سید احمد حسن صاحب مرحوم کو علی گڑھ کالج میں داخل کرایا تھا۔ بعد میں انہوں نے وکالت کی تعلیم بھی حاصل کی اور کئی سال تک وکالت کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں وہ اورنگ آباد بھی تشریف لے گئے۔ مولانا کے والد ماجد پر خاندانی ماحول اور گھر کی تربیت کے اثرات تو تھے ہی، اس پر اورنگ آباد میں اپنے ہی خاندان کے ایک باخدا بزرگ کے فیض صحبت کا مزید اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے پیشے میں انتہائی محتاط ہو گئے اور جھوٹے اور مشتبہ مقدمات کی پیروی ترک کر دی۔ مولانا کے بقول "وہ موکل پر فریق مخالف کے وکیل اور مجسٹریٹ کی طرح جرح کیا کرتے تھے اور جب تک اس کے برسر حق ہونے کا کامل یقین نہیں ہو جاتا تھا مقدمہ ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔" ایسی صورت میں وکالت کا ترقی کرنا ایک امر محال تھا۔ آخر کار انہوں نے اس کام کو چھوڑ دیا۔ اس اثنا میں ان پر نیکی اور دینداری کا بہت گہرا رنگ طاری ہو چکا تھا اور دنیا داری سے طبعاً علیحدہ اور یکسو ہو گئے تھے۔

یہی زمانہ مولانا کے تولد کا بھی ہے۔ مولانا کے والد صاحب کے تصور و امکان

میں دینی و اخلاقی تربیت کا جو بہتر سے بہتر طریقہ ہو سکتا تھا اسے اختیار کرنے میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ چنانچہ مولانا نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ گو مادی لحاظ سے والد صاحب نے میرے لیے کوئی ورثہ نہیں چھوڑا لیکن ان کا بہترین ورثہ جو میرے حصے میں آیا ہے وہ ان کی اخلاقی تربیت ہے۔ پورے گیارہ برس تک انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنی چوبیس گھنٹے کی براہ راست نگرانی میں رکھا اور کسی مکتب یا مدرسہ میں بھیجنا بھی گوارا نہیں کیا، گھر پر اتالیق کا انتظام کر رکھا تھا جو مولانا کو عربی ادب اور علوم دینیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ پڑھنے پڑھانے کے علاوہ فارغ اوقات میں مولانا کے والد انہیں ہمیشہ اپنے سے قریب رکھتے تھے۔ مجھے ابتدا میں جب مولانا سے نیاز حاصل ہوا تھا تو ایک بات عجیب محسوس ہوئی تھی اور وہ یہ کہ مولانا کی زبان میں وہ تیزی، طراری اور زود گوئی مطلق نہیں تھی جو اکثر اہل زبان میں ہوتی ہے۔ مولانا اتنے دھیرے دھیرے اور اطمینان سے بولتے ہیں کہ کوئی چاہے تو سن کر لکھتا چلا جائے۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمانے لگے "بچپنے سے ہی مجھے بازاری لونڈوں اور لاابالی نوجوانوں میں گھلنے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ گالی سے میری زبان آج تک آشنا نہیں ہوئی۔ مجھے والد صاحب ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، حتیٰ کہ اگر کہیں گھر سے باہر جاتے تھے تو مجھے ساتھ ہی لے جایا کرتے تھے ان کا آنا جانا عموماً سن رسیدہ، ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کے ہاں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں گفتگو ہمیشہ ٹھنڈے اور پرسکون طریق پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی وقت سے ایسا طرز تکلم میرے لیے فطرت ثانیہ بن چکا ہے۔"

مولانا تیرہ برس کے تھے کہ آپ کے والد پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ چار سال صاحبِ فراش رہ کر سنہ ۱۹۲۰ء میں انتقال فرما گئے۔ یہ خلافت اور دوسری تحریکات کا دور تھا اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس زمانے میں ایک تنظیم انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام کے نام سے قائم ہوئی تھی، اور اس کا ایک اخبار "تاج" جبل پور سے نکالا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں مولانا مودودی نے سولہ برس کی عمر میں اس کی ادارت سنبھالی۔ یہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا، بعد میں روزنامہ ہو گیا۔ جبل پور کے قیام کے دوران میں ۱۶ برس کی عمر میں مولانا مودودی نے انگریزی سیکھنا شروع کی اور ایک سال کے دوران میں ہی اتنی استعداد پیدا کر لی کہ ہر قسم کی علمی اور فنی کتابوں کا انگریزی میں مطالعہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ اخبار ایک قانونی گرفت کی وجہ سے بند ہو گیا اور مولانا دہلی آ گئے۔ اسی سال جمعیۃ علماء ہند نے دہلی سے ایک اخبار "مسلم" نکالا جس کی ادارت مولانا کو پیش کی گئی۔ یہ اخبار سنہ ۱۹۲۳ء تک نکلتا رہا اور آخر وقت تک مولانا ہی اس کے مدیر رہے۔ اس دوران میں بھی عربی اور انگریزی میں کتب بینی اور مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا۔ "مسلم" کے بند ہو جانے پر مولانا بھوپال میں جا کر اقامت پذیر ہو گئے اور وہاں ڈیڑھ برس تک سوائے خالص مطالعے کے دیگر جملہ مشاغل ترک کر دیئے۔ مولانا نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "اس ڈیڑھ سال کو میں نے بالکلیہ پڑھنے اور سوچنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ علوم قدیمہ و جدیدہ کے جتنے ذخائر تک میری رسائی ممکن تھی، میں نے ان سے استفادہ کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ غور و فکر اور مطالعہ

کو میں نے اتنی شدت اور تسلسل سے جاری رکھا کہ آخر کار میرے اعصاب پر تکان کے آثار ہویدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔"

۱۹۲۵ء کے آغاز میں "مسلم" کا جانشین اخبار "الجمعیۃ" نکلنا شروع ہوا اور اس کی ادارت دوبارہ مولانا کے سپرد کی گئی۔ اس ذمہ داری کو وہ ۱۹۲۸ء کے آخر تک نبھاتے رہے۔ یہاں اس امر کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں مولانا کا ادارتی تعلق "الجمعیۃ" سے رہا ہے اس زمانے میں جمعیۃ علمائے ہند کانگرس کے نظریات و عملیات کی ہمنوا نہیں تھی، بلکہ اس آزادانہ پالیسی پر چل رہی تھی جو مولانا محمد علی مرحوم نے اس زمانے میں ملکی و ملی مسائل کے بارے میں اختیار کی تھی۔ مولانا مودودی کی "الجمعیۃ" کی ادارت سے سبکدوشی کے دو سال بلکہ زیادہ مدت کے بعد جمعیۃ علمائے ہند نے اپنا مستقل تعلق کانگرس سے جوڑا تھا۔ مولانا "الجمعیۃ" کے مدیر ہی تھے کہ ۱۹۲۶ء کے آخر میں شدھی کے بانی شردھانند کو قتل کر دیا گیا۔ اس پر کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندوؤں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ اسلام خونخواری سکھاتا ہے۔ گاندھی جی نے بھی کہا تھا کہ "اسلام میں فیصلہ کن چیز پہلے بھی تلوار تھی اور اب بھی تلوار ہے۔" اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے خود بیان کیا کہ یہ غوغا آرائی ایک مدت تک بڑے زور شور سے جاری رہی۔ مولانا محمد علی مرحوم نے ان بہتان تراشیوں سے تنگ آکر جامع مسجد دہلی میں ایک تقریر کی اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان الزامات کے جواب میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر پیش کرتا

تقریر سننے والوں میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں جب وہاں سے اُٹھا تو یہ سوچتا ہُوا اُٹھا کہ کیوں نہ میں ہی اللہ کا نام لے کر اپنی سی کوشش کروں"۔ بہرکیف اس ہنگامے اور مولانا محمد علی مرحوم کی اس اپیل نے مولانا مودودی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں اور اسلام کی مدافعت کے لیے قلم سنبھالیں۔ اگرچہ اخبار نویسی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے ساتھ ساتھ کوئی طویل علمی یا تحقیقی تصنیف کی جائے لیکن مولانا نے ۱۹۲۷ء کے شروع میں الجمعیتہ ہی کے کالموں میں اس مبسوط بحث کا آغاز کر دیا جو آج کتابی شکل میں بڑے سائز کے پانسو صفحات پر پھیلی ہوئی "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے موجود ہے۔ یہ پوری کتاب مصنف نے چوبیس برس کی عمر میں چھ ماہ سے کم مدت کے اندر تحریر کی ہے۔ اس کتاب کی جامعیت و افادیت کے بارے میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے فرمایا تھا کہ "اسلام کے نظریہ جہاد اور اس کے قانون صلح و جنگ پر یہ ایک بہترین تصنیف ہے اور میں ہر ذی علم آدمی کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کا مطالعہ کرے"۔

مولانا نے اس کتاب کے بارے میں ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "اس کتاب سے سب سے زیادہ فائدہ خود مجھے پہنچا ہے، میں نے جب اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو میرے اندر دینی حمیت سے زیادہ قومی حمیت کا جذبہ کام کر رہا تھا لیکن تالیف و تحقیق کے دوران میں جب مجھے ایک ترتیب کے ساتھ اسلام کے اساسی نظریات اور اس کے تفصیلی احکامات کا غور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا

کہ مجھ میں نہ صرف نظامِ شریعت کا فہم اور اس کی حقانیت کا غیر متزلزل یقین ابھر آیا۔ بلکہ اس نظام کے احیاء کا ولولہ بھی مجھ میں پیدا ہوگیا اور اس کے لیے کام کرنے کا طریقہ بھی میری سمجھ میں آگیا۔ اس کے بعد میں نے اخبار نویسی کے مروج اور پامال راستے کو خیرباد کہنے کی ٹھان لی، الجمعیۃ سے علیحدگی اختیار کرلی اور یہ طے کیا کہ صحافت کی دنیا میں اگر آئندہ قدم رکھوں گا تو صرف اس شرط پر کہ اسے دینِ حق کی خدمت کا ایک ذریعہ بناؤں۔ اس کے بعد میں مزید پانچ سال تک پھر صرف مطالعہ، لکھنے پڑھنے اور اپنی علمی استعداد بڑھانے کا کام کرتا رہا۔" آخرکار ۱۹۳۳ء میں رسالہ ترجمان القرآن کے ذریعے سے مولانا نے اس دعوت کو پیش کرنا شروع کر دیا جسے وہ آج تک برابر پیش کر رہے ہیں۔

مولانا مودودی کی زندگی کا موجودہ دور ۱۹۳۳ء سے شروع ہوا ہے، اس کے حالات کا علم حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ان حالات کا ریکارڈ صرف "ترجمان" کے اوراق میں ہی محفوظ نہیں ہے، بلکہ ان کے ایک بڑے حصے کا نقش ہماری قومی و ملی تاریخ کے صفحات پر بھی مرتسم ہو چکا ہے۔ اس مضمون کی تنگنائی مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں اس اکیس سالہ دور کا ایک سرسری سا بھی جائزہ لے سکوں۔ اس لیے میں مجبوراً اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اب مولانا محترم کی سیرت کے چند ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا جنہیں ان کی خدمت میں رہ کر میں نے نمایاں طور پر محسوس کیا ہے۔

مولانا مودودی کے ساتھ تھوڑا ہی عرصہ رہ کر جو چیز مجھے سب سے پہلے محسوس ہوتی ہے اور جس کے احساس میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا ایک انتہائی حلیم الطبع اور بردبار انسان ہیں۔ میں نے ان سے زیادہ ٹھنڈی طبیعت کا آدمی نہیں دیکھا۔ طیش اور اشتعال کے بہت سے ممکن مواقع پر میں نے دیکھا ہے کہ مولانا کے جذبات سرے سے برانگیختہ ہی نہیں ہوتے اور اگر ان میں کوئی معمولی تحریک ہوتی بھی ہے تو وہ غیر معمولی ضبط سے کام لیتے ہیں۔ ناگواری کا اثر کبھی ان کے چہرے کو کچھ متغیر کردے تو کردے، مگر زبان میں تیزی اور تلخی میں نے کبھی پیدا ہوتے نہیں دیکھی۔ اس بارے میں ایک خاص بات میں نے یہ دیکھی ہے کہ مولانا کی تحریر میں بلاشبہ بعض اوقات اتنا زور اور ایسی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ بعض معترضین اسے سختی اور تندی پر محمول کرنے لگتے ہیں لیکن گفتگو اور تقریر میں جہاں جوشِ بیانی کا زیادہ امکان ہوتا ہے مولانا ہمیشہ ایک ایسے فطری وقار اور سکون سے کام لیتے ہیں جس کی نظیر بہت کم پائی جاتی ہے۔ ہم لوگ جب دارالاسلام پٹھانکوٹ میں تھے تو ایک مرتبہ قادیانیوں کی ایک پارٹی "تبلیغ" کے لیے وہاں آئی۔ ایک مجلس میں مولانا اور ہمارے سامنے ان لوگوں نے اپنے فن مناظرہ اور علم کلام کے خوب خوب کرتب دکھائے۔ کئی گھنٹے تک اُلٹے سیدھے سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہمیں کوفت بھی ہوتی تھی اور غصہ بھی آتا تھا کبھی ہمارا جی یہ چاہتا تھا کہ ان سے رخصت اور معافی طلب کی جائے اور کبھی ہم اس پر آمادہ ہوتے تھے کہ انہیں

ترکی بہ ترکی جواب دیئے جائیں۔ مگر مولانا تحمل سے ان کی باتیں سنتے رہے، نرمی سے جواب بھی دیتے رہے اور حق کو ان پر واضح کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ آخر کار جب مولانا نے دیکھا کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے تو قادیانی حضرات سے دھیمے لب و لہجہ میں کہنے لگے کہ "میں نے اپنے ساتھیوں کو بڑی محنت سے کافی مدت تک ضبط اور برداشت کی مشق کرائی ہے خطرہ ہے کہ آپ لوگ میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر کر نہ جائیں۔" اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ بات کام کر گئی یا مبلغین اتمام حجت کرتے کرتے تھک گئے۔ بہر حال اس کے بعد وہ تشریف لے گئے۔

مولانا مودودی جماعت اسلامی کے بانی اور داعی ہیں اور اسیری کے زمانوں کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ جماعت کے امیر رہے ہیں لیکن شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے محض تحکمانہ اور آمرانہ انداز میں اپنے کسی حکم کو جماعت کے کسی رکن پر نافذ کیا ہو۔ ایسا کرنے کے بجائے وہ اپنے فیصلوں اور اپنی سوچی سمجھی آراء کو بھی ہمیشہ مشفقانہ نصائح اور دوستانہ مشوروں کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف آپ کی للہیت و شفقت کا ارکان جماعت پر اتنا گہرا اخلاقی اثر ہے کہ انہوں نے آپ کے مشورے کو بھی ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے بلا وجہ کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ کئی مرتبہ مجھے خیال آیا ہے کہ جو لوگ مولانا سے آج تک نہیں ملے اور محض ان کی تحریریں پڑھ کر انہیں ایک سخت گیر آدمی سمجھے بیٹھے ہیں ان کی اگر ان حضرات کے اندر اختلاف یا مخالفت کی کوئی اور وجہ موجود نہیں ہے

نوازن کا مولانا سے بل لینا بہت سے حجابات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ صبرو تحمل کے ساتھ ساتھ دوسری نمایاں خصوصیت جو میں نے مولانا میں دیکھی ہے وہ ان کی منصف مزاجی چشم پوشی اور عفو و درگزر کی عادت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس شخص یا گروہ کو وہ دین کے لیے حقیقی خطرہ یا اللہ کی راہ میں اصل رکاوٹ سمجھتے ہیں اس سے وہ پوری قوت اور پورے عزم کے ساتھ متصادم ہوتے ہیں اور اس معاملے میں کسی طرح کی مداہنت یا مجاملت روا رکھنے کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ لیکن حق کے مخالفین کے خلاف مزاحمت میں بھی انہوں نے عدل و انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اگر کسی فرد کی وجہ سے مولانا کو ذاتی تکلیف یا صدمے سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو متعدد مرتبہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اخلاقی فیاضی سے کام لے کر ایسے صدمات کو جلد بھلا دیتے ہیں مگر ایک ہی فرد کا رویہ بار بار اذیت کا موجب بنے تو وہ بار بار بھول جانے اور بھلا دینے کے لیے بھی آمادہ رہتے ہیں۔

مولانا مودودی کی سیرت کی ایک اور خوبی ان کا انفاق فی سبیل اللہ اور مالی ایثار ہے۔ مولانا ساٹھ سے زائد کتب کے مصنف ہیں۔ برعظیم ہند و پاکستان میں شاید ہی کوئی مصنف ہو جو اپنی تصانیف کی کثرت اشاعت میں آپ کا مقابلہ کر سکے۔ اگر مولانا ان کتابوں کی آمد سے خود استفادہ کرتے تو بلا مبالغہ لاکھوں روپے کما سکتے تھے لیکن سوائے چار پانچ کتابوں رسالہ "ترجمان القرآن" اور "تفہیم القرآن"

کے مولانا نے اپنی تمام کتابیں جماعت کو دے دی ہیں۔ مولانا ان کتابوں کی آمد اور اس کا حساب کتاب جماعت کی تشکیل سے قبل بھی ایک امانت کے طور پر بالکل علیحدہ اپنے پاس رکھتے تھے جس روز جماعت بنی ہے اسی روز ان کتابوں کی آمد اور آئندہ کے لیے ان کا دائمی حق اشاعت انہوں نے جماعت کے سپرد کر دیا۔ جماعت اسلامی کے مالیات کا بہت بڑا سہارا یہی مطبوعات ہیں۔ مولانا مودودی کے پاس کوئی جائداد، کوئی پس انداز سرمایہ، حتیٰ کہ ذاتی مکان تک نہیں ہے۔ اس وقت جبکہ وہ جیل کے مکین ہیں ان کے بچے ایک کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ جس طرح اللہ کی راہ میں کسی ہنگامی تقاضے یا ضرورت کے تحت ایک ہی دفعہ اپنا سب کچھ یا بہت کچھ لٹا دینا بڑی ہمت اور ایثار کا کام ہے، اسی طرح اپنے آپ کو اور اپنے فرزند کو محض اللہ کی خاطر اپنی آمد کے بیشتر حصے سے مستقلاً محروم کر دینا بھی کوئی معمولی درجے کی قربانی نہیں ہے۔

مالی قربانی کے علاوہ جانی ایثار اور عزم و استقلال کا جو زبردست مظاہرہ مولانا نے پھانسی کی سنگین کوٹھری میں رہ کر کیا ہے وہ دنیا کے سامنے ہے، سزائے موت کے بعد سے اب تک کے حالات سب پر عیاں ہیں ان کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن مولانا کی عزیمت اور پامردی کا امتحان ایک مرتبہ پہلے دارالاسلام میں بھی ہو چکا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت جو حالات مشرقی پنجاب میں تھے وہ سب کو معلوم ہیں۔ اس وقت دارالاسلام کی بستی میں ہم مرکزی ادارے کے

چند گنے چنے افراد تھے، مکانات ایک دوسرے سے علیحدہ تھے، چاروں طرف گھنا جنگل تھا، اردگرد کے شہر جن میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بستے تھے دُور دور تک مسلمانوں سے خالی ہو چکے تھے۔ ہردم حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک شخص اگرچہ ہر وقت سر بکف رہتا تھا لیکن مولانا کی ذمہ داری اس وجہ سے زیادہ کٹھن تھی کہ گشت، پہرے اور دیگر سارے حفاظتی انتظامات آٹھوں پہر براہ راست انہی کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ وہ رات رات بھر جاگا کرتے تھے اور بار بار جا کر خود معلوم کیا کرتے تھے کہ کوئی آدمی غفلت یا نیند میں تو مبتلا نہیں ہو گیا۔ کچھ عرصہ اس طرح گزرنے کے بعد پنڈری فورس کے بعض مسلمان سپاہیوں نے آ کر یہ پیش کش کی کہ وہ مولانا اور ان کے ساتھیوں کو نکال کر لے جا سکتے ہیں۔ نذائد آدمیوں کا لے جانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ مولانا نے فرمایا "کہ یہ چاروں طرف کی مار دھاڑ سے بچ کر ہمارے ہاں بے سروسامان مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہو گئی ہے۔ انہیں چھوڑ کر جانا بڑی بزدلی کی بات ہے۔ ان کے دل پہلے ہی ڈوبے جا رہے ہیں۔ اگر ہم اس نازک وقت میں ان کا ساتھ چھوڑ دیں تو ان کے جان و مال اور عزت و ناموس کے بچاؤ کی کوئی شکل باقی نہ رہے گی" بعد میں رفیق گرامی غازی عبدالجبار صاحب ایک مختصر کنبہ لینے کے لیے پہنچے۔ ان کے ساتھ بھی جماعت کے افراد کے علاوہ مزید مسلمانوں کا جانا ناممکن تھا، اس لیے ان کے ساتھ بھی جانے سے انکار کر دیا گیا، البتہ عورتوں اور بچوں کو غازی صاحب

لاہور لے گئے۔ ہم لوگ مولانا کی معیت میں اُس وقت لاہور آئے جب کہ دارالاسلام پناہ گزینوں کا باقاعدہ کیمپ بنا دیا گیا، فوج نے اس کا چارج لے لیا اور گاڑیوں کے ذریعے مہاجرین کے لانے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

مولانا کے مزاج میں ایک اور خصوصیت جو میں نے ذاتی طور پر محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ سب ایک آدمی کو ان سے پہلی مرتبہ تعارف حاصل کرنے یا قریب ہونے کا موقع ملتا ہے تو بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ "نو واردانِ بزم" کا استقبال کچھ زیادہ تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ نہیں کرتے۔ اپنے ابتدائی تعارف میں میرا احساس بھی یہی تھا کہ مولانا ایک روکھے پھیکے اور جذبات سے معرا انسان ہیں، جن کی شخصیت بزبانِ حال یہ کہہ رہی ہے کہ ؎

ما ہماں بے گرم پہلو از بیم شیخ از ما مجو
سایہ ہیچ کوہ بالا میرود از بال ما

لیکن مولانا کی خدمت میں تھوڑا ہی عرصہ رہ کر میں نے یہ واضح طور پر محسوس کر لیا کہ وہ اپنے باطن میں اپنے ظاہر سے بھی اور اپنی خلوت میں اپنی جلوت سے بھی زیادہ بہتر و برتر ہیں اور ان کی ظاہری کم آمیزی ان کی کسی اندرونی سرد مہری پر ہرگز دلالت نہیں کرتی۔ ہو سکتا ہے کہ فکری انہماک، کثرتِ مشاغل یا اپنی افتادِ طبع کی بنا پر مولانا اپنی بول چال یا میل جول میں زیادہ بے تکلف یا ملنسار دکھائی نہ دیں لیکن جب کچھ دیر ان کے ساتھ رہنے یا معاملہ کرنے کی نوبت آتی ہے

تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل اسلامی محبت و اخوت اور انسانی دلسوزی اور شفقت کے کتنے گہرے جذبات سے بھرپور ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہم لوگ لاہور پہنچے تو مرکزی ادارے کے سارے افراد کے لیے رہائشی مکانات کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ آخر کرائے کے چھوٹے چھوٹے خیمے اچھولداریاں لے کر انہیں ایک کھلے افتادہ میدان میں گاڑ دیا گیا۔ اور انہی میں ہم سب لوگ اقامت گزیں ہو گئے۔ مولانا محترم اور جماعت سے حُسنِ ظن رکھنے والوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے فوری طور پر آ کر مولانا کے لیے مکان کی پیش کش کی اور اصرار کیا کہ کم از کم مولانا مع اہل و عیال دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ خود ہماری بھی یہ دلی خواہش تھی کہ مولانا اس سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کی تکلیف خود ہمارے لیے موجب تکلیف تھی۔ سردی اور برسات کا موسم قریب تھا۔ اس طرح کی خانہ بدوشانہ زندگی کا تجربہ ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ بچوں کا ساتھ تھا۔ پردے کا، اٹھنے بیٹھنے کا اور دیگر ضروریات کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ خیمے اتنے چھوٹے تھے کہ آدمی کا ان میں سیدھا کھڑا ہونا بھی محال تھا، اس کے باوجود مولانا اس طرح کی پیش کشوں کے جواب میں شکریے کے ساتھ یہ کہہ کر معذرت کر دیتے تھے کہ "ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت۔ یہ بات مروت کے خلاف ہے کہ میں یا میرے بچے تو پختہ مکانوں میں رہیں اور میرے ساتھی اور ان کے بچے خیموں میں پڑے رہیں۔" بعد میں انہی خیموں میں ہم سب نے برسات اس شان سے گذاری کہ اوپر چھت سے بھی پانی برستا تھا

اور نیچے زمین کا پانی بھی چاروں طرف سے اندر جمع ہو جاتا تھا، آخر کار تلاش کے بعد اچھرہ کی آبادی میں مسلمانوں کے چند کرائے کے مکان ایک دوسرے کے قرب و جوار میں دستیاب ہو گئے اور بدویانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر ہم ان مکانوں میں آکر رہائش پذیر ہو گئے۔

مولانا مودودی اپنے گھر میں

بیگم مودودی

(۱)

مودودی صاحب ایک معمولی انسان ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن اور سیرت رسول کریمؐ کی جو معرفت دی ہے اس کی بنا پر میں اگر یہ کہوں کہ ان کا عمل قرآن کے مطابق ہے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

میں ایک راہ گم کردہ انسان تھی۔ مودودی صاحب میرے سامنے مشعل ہدایت بن کر آئے۔ ان کی زبان خاموش تھی، بس عمل تھا جو ہر لمحہ ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا رہا۔ اگر کہیں وہ زبان کھولتے، بات بات پر اعتراض کرتے، ایک ایک چیز پر انگشت نمائی کرتے تو میرا سدھرنا تو کجا، شاید میں ان کے ساتھ زندگی کے دن بھی نہ گزار سکتی۔ یہی وہ حکمت تبلیغ تھی جو انہوں نے قرآن مجید سے سیکھی تھی پھر

وہ بہت وسیع النظر، حلیم اور شفیق ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ اِن پندرہ سال میں انہوں نے کبھی امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کے سلسلے میں میرے ساتھ تحکمانہ لہجہ استعمال کیا ہو۔ یہی ان کی سیرت کا حسن ہے، کہ جس کا ان سے تھوڑی دیر بھی معاملہ پڑتا ہے وہ اُن کا شیدائی بن جاتا ہے۔

مودودی صاحب ظاہر کی اصلاح سے زیادہ باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ سخت تھکے ہوئے تھے اور اسی وقت آکر لیٹے تھے کہ باہر سے پیغام آیا "مولانا کو بھیج دیں" ! میں نے کہہ دیا کہ مولانا سو رہے ہیں۔ جب میں نے کہا کہ میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ سو رہے ہیں تو بس صرف اتنا کہا "کیا تم نے جھوٹ کہہ دیا"

ایک مرتبہ ہم سب کھانا کھا رہے تھے۔ میں اپنے بڑے لڑکے کو نصیحت کر رہی تھی کہ بیٹا نماز پڑھا کرو۔ دیکھو لوگ کیا کہیں گے کہ مودودی صاحب کا بیٹا نماز نہیں پڑھتا؟ اس پر مودودی صاحب بولے "بیٹا جب بھی نماز پڑھنا اللہ تعالیٰ کے لیے پڑھنا، باپ کی نماز نہ پڑھنا۔"

بچوں کے ساتھ ان کی شفقت کا یہ عالم ہے کہ میں نے کوئی باپ ایسا شفیق نہیں دیکھا۔ جب بھی گھر میں آئیں گے ایک ایک بچے کا نام لے لے کر پکاریں گے۔ دارالاسلام میں ہمارے پاس ٹانگہ تھا۔ خود مجھے اور بچوں کو لے کر شام کو جاتے تھے کبھی کسی کے ساتھ بچوں کو نہیں بھیجتے تھے کہ کہیں کوئی بچہ گر نہ جائے یا ایک دفعہ

کسی وجہ سے خود نہ جا سکے اور کوچوان کے ساتھ بچوں کو پٹھان کوٹ بھیج دیا۔ خود نہر پر ٹہلنے چلے گئے۔ مغرب سے پہلے نہر سے واپس آگئے۔ باہر ہی پوچھا بچے آگئے ہیں؟ معلوم ہوا نہیں آئے۔ باہر ہی بیٹھ گئے۔ بچوں کو آنے میں دیر لگ گئی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ باہر ہی بیٹھے رہے۔ جب بچے آگئے تو انہیں لے کر اندر آئے۔ میں نے پوچھا "آپ نے اتنی دیر کہاں لگائی؟" کہا "میں تو باہر بیٹھا تھا۔ اور بچوں کی فکر میں مجھ سے تو نہر پر بھی نہیں ٹھیرا گیا۔ اور بچوں کے انتظار میں باہر ہی ٹھیرا رہا۔ ان کے بغیر میرا اندر آنے کو جی نہیں چاہا"۔

عموماً بچے باپ سے ڈرتے اور ماں کے سامنے شرارتیں کرتے ہیں۔ مگر میرے بچے باپ کی گھر میں موجودگی پر بڑے شوخ ہو جاتے ہیں اور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جھٹ باپ کی سفارش لے آتے ہیں۔ بچے ان کی کیسی ہی قیمتی چیز خراب کر دیں کبھی انہوں نے بچوں کو نہیں مارا۔ بس زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ "بیٹا تم کیوں چیزیں خراب کیا کرتے ہو"۔

مودودی صاحب کے والد جب ان کی عمر پندرہ سال کی تھی --- انتقال کر گئے تھے۔ والدہ صاحبہ بفضل خدا حیات ہیں۔ ان کا وہ اس قدر احترام کرتے ہیں کہ شاید ہی کوئی بیٹا کر سکے۔ بعض چیزیں ان کی انہیں ناپسند بھی ہوتی ہیں مگر بالکل خاموش رہتے ہیں کبھی اُف تک نہیں کی۔ جو چاہیں وہ کہہ لیں، کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، ہر طرح ان کی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔

(۲)

مولانا مودودی کی زندگی کا ایک رخ!

میرا خاندان شاہجہان کے وقت میں بخارا سے نقل مقام کرکے دلّی میں آ بسا تھا کئی پشت سے دلّی جیسے شہر میں رہنے کی وجہ سے شہری زندگی کی عادی تھی جب مولانا حیدر آباد سے دارالاسلام منتقل ہوئے تو یہ میری زندگی کے لیے بہت بڑا انقلاب تھا۔

دارالاسلام اور اس کی آبادی صرف ہمارے گھر اور دو گھروں پر مشتمل تھی۔ گاؤں کا سادہ گھر نہ بجلی نہ نل نہ زندگی کی دوسری سہولتیں، یہ پہلا صبر آزما مرحلہ تھا۔

ایک دفعہ ہمارے پاس لکڑی نہ تھی۔ مولانا صبح ناشتہ کرکے دفتر چلے گئے۔ میں حیران بیٹھی تھی کہ کیا کروں، گھر آئے تو کہا کہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا لکڑی نہیں ہے۔ کھانا پکانے والی بیٹھی ہوئی ہے۔ آپ نے کہا "بس صرف اتنی سی بات کے لیے پریشان ہو"۔ یہ کہا اور ہاتھ میں کلہاڑی اٹھا کر باہر چلے گئے۔ گھر کے سامنے بغیر چری لکڑی پڑی تھی۔ خود جا کر پھاڑنے لگے۔ ابھی انہوں نے ایک دو ہاتھ ہی مارے تھے کہ آس پاس کے کئی آدمی دوڑے ہوئے آئے، اور آن کی آن میں لکڑی کا ایک ڈھیر لگ گیا۔

اسی طرح ایک روز پانی بھرنے والا کسی وجہ سے پانی نہیں لایا۔ گرمی سخت تھی۔ مولانا گھر میں آئے تو میں پریشان بیٹھی تھی۔ پوچھا کیا بات ہے؟ میں نے کہا

پانی نہیں ہے۔ سنتے ہی دو بالٹیاں اٹھا کر کنوئیں پر پہنچ گئے اور پانی بھرنا شروع کیا۔ لوگ دیکھتے ہی دوڑ پڑے، اور فوراً گھر میں پانی ہی پانی تھا۔

مولانا میرے آرام کا بہت ہی خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں راہِ خدا کی سختیاں جھیلتی رہی۔ اگر مولانا لاپرواہ ہوتے تو میں راہِ خدا میں شاید ان کا ساتھ نہ دے سکتی۔ دارالاسلام کی دیہاتی زندگی کی تکالیف کی وجہ سے میری صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مولانا نے لاہور سے ڈاکٹر پہ ڈاکٹر بلائے اور تین مہینے تک میرے علاج اور آرام و آسائش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ پچاس کے قریب انجکشن لگنے تھے۔ ایک دن بیچ چھوڑ کر خود تانگہ چلا کر لے جاتے اور انجکشن لگوا لاتے۔ اس طرح ان کا پورا دن ضائع ہوتا اور اس روز کوئی لکھنے کا کام نہ کر سکتے تھے۔

مولانا کا طرزِ عمل گھریلو زندگی میں قرآن کی اس آیت کے مطابق رہا ہے۔ ان تعفوا اقرب للتقوی ولا تنسوا الفضل بینکم۔ وہ میری بڑی سے بڑی کوتاہی کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ اور میرے آرام اور آسائش کا ہر وقت خیال رکھتے تھے۔

جو لوگ اپنی خانگی زندگی میں اصلاح اور مسرت چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ خود حدود اللہ کے مستقل مزاجی سے پابند ہوں۔ اور آپس میں تجارتی لین دین کا معاملہ کرنے کی بجائے احسان سے کام لیں۔ انشاءاللہ حالات درست ہو جائیں گے۔

قید و بند کی منزل میں

نعیم صدیقی

گرفتاری —— اور اچانک گرفتاری سے جب سامنا ہوتا ہے تو ایک صاحبِ دعوت اور صاحبِ مقصد کی سیرت کے ایسے گوشے اپنی جھلک دکھاتے ہیں جن سے اس کے قریب ترین ساتھی بھی پہلے کبھی پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔ ایک ادنیٰ درجے کے آدمی کی وہ کمزوریاں اس وقت بے نقاب ہوتی ہیں جن سے وہ خود بھی پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا، اور اونچے درجے کے مردانِ کار کی شخصیتوں کی عظمت کے ایسے پہلو دکھائی دے جاتے ہیں جو ان کی قدر و قیمت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

وہبی شخصیت

مولانا اس نفسیاتی لمحے کی آزمائش سے جب پہلی مرتبہ (اکتوبر ۴۸ء) میں گزرے

تھے تو یہ واضح ہو گیا تھا کہ اس شخص کی سیرت عام حالات میں جتنی اونچی ہے، آزمائش میں آکر وہ اس سے زیادہ اونچی ہو جانے والی ہے۔ اس زمانے میں حکومت کے براہ راست اور بالواسطہ پروپیگنڈے نے، نیز بعض اخبارات کے مخالفانہ محاذ اور بعض مولویوں کے فتووں اور خطبوں نے، رائے عام کی فضا کو اتنا مکدر کر دیا تھا کہ دماغی سکون کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن مولانا اس طوفانی ماحول میں جس شان سے عزیمت کی چٹان بنے رہے اس نے جماعت کے ایک ایک فرد میں سچائی پر قائم رہنے کا مضبوط جذبہ پیدا کر دیا۔ حال یہ تھا کہ مسجد کے ممبروں سے مولانا کے قتل کیے جانے کی علانیہ ترغیب دلائی جا رہی تھی اور سڑکوں پر چلتے پھرتے کارکن بسا اوقات یہ اندیشہ محسوس کرتے تھے کہ ہم پر کہیں بھی غنڈوں کی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے۔ اور ایک ایک چیز کی اطلاع لے کر ہم سب بار بار مرکز آتے تھے، لیکن مولانا سے بات کرتے ہی ساری تشویش رخصت ہو جاتی اور عزم و ہمت کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ مولانا کارکنوں کی گھبراہٹ کا پرتو قبول کرنے کے بجائے ہمیشہ ان پر اپنی عزیمت کا پرتو ڈال دینے میں کامیاب رہے جب کوئی آتا تو وہ دور ہی سے اس کے چہرے سے نفسیاتی مطالعہ کر لیتے اور سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ پوچھتے: کہیے جناب! کیا حالات ہیں؟ —— اور آنے والے کی جذباتی کیفیت بات کرنے سے پہلے ہی بدل جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ اسی زمانے میں کسی موقع پر غالباً کسی اخبار

(نام لینا غیر ضروری ہے) کے نوٹ کا میں نے مولانا سے تذکرہ کیا کہ اس نے ہمارے بارے میں یہ یہ الزام تراشی کی ہے اور یوں یوں حکومت اور عوام کو اکسایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں، اس اخبار کو اپنا کام کرنے دیجئے اور صاف صاف کہیے کہ ہم لوگ "اقراری مجرم" ہیں! ــــ میری تشویش ختم ہو گئی اور یہی الفاظ ایک مصرعہ بن کر ذہن نشین ہو گئے۔ اسی رات میں نے اپنی نظم "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں" مکمل کر لی مجھے یاد تو نہیں، لیکن خیال ہے کہ ہمارے اس مستقل کرم فرما اخبار نے صاف صاف لفظوں میں ہمیں غدار قرار دیا تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے ایک مصرعہ یوں ڈھلا:

یہ نگری اندھی نگری ہے تو ہم سے راجا! غدار ہیں ہم

مولانا کی تلقین یہ تھی کہ مخالفت سے مخالف ماحول کے خطرناک ترین گوشوں میں گھس بیٹھیے اور پوری ہمت کے ساتھ اپنی صحیح پوزیشن پیش کر دیجیے۔ چنانچہ کارکنوں کا یہ حال تھا کہ انہوں نے حکومت، پریس اور مولویوں کے وسیع مخالفانہ محاذ کے بالکل سامنے آ کر جھوٹ کے غبار سے فضا کو صاف کرنے کی حوصلہ افزا مثالیں قائم کر دیں۔ پھر جب مولانا نے تجویز کیا کہ شہر کے عین بلوائی مرکز میں جلسے کیے جائیں، اور عوام کو براہ راست اپنے موقف سے آگاہ کیا جائے، تو پہلا آزمائشی موقعہ برکت علی محمڈن ہال کو مقرر کیا گیا، جس میں ہاتھ خان صاحب کو صدارت کے لیے اور مجھے تقریر کے لیے بھیجا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاری میں

جب ہم نکلے تو ہر اس کا شائبہ تک نہ تھا، بلکہ ایک بڑی بازی کھیل جانے کی اسپرٹ دلوں میں کام کر رہی تھی۔ مولانا خود اس روز یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کا امکان ہے، اور ہماری واپسی تک برابر دفتر کے صحن میں موجود رہے اس کے بعد شہر کے تمام حصوں میں پے درپے چھوٹے چھوٹے جلسے کیے جانے لگے۔

اس دوران میں متعدد لوگوں نے مولانا کی گرفتاری کے امکان سے آگاہ کر دیا تھا۔ دوسری طرف ایک خطرناک تر سازش کی افواہ بھی ملی اور ہم نے چاہا کہ مولانا کسی قدر احتیاط سے کام لیں، لیکن انہوں نے ہمیشہ کی طرح کہا کہ جب تک اللہ تعالیٰ مجھ سے اپنے دین کی خدمت لینا چاہتا ہے، میں اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا، اور جب اس کی طرف سے یہ مہلت ختم ہو جانے والی ہوگی تو پھر کوئی احتیاط حفاظت کی ضمانت نہیں بن سکتی —— ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں دفتر "کوثر" میں کام کر رہا تھا کہ اچانک اپنے ہی ایک نوجوان آئے، اور انہوں نے علیحدگی میں مجھ سے کہا کہ مولانا کی گرفتاری کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں نے یہ خبر سن کر فوراً کام بند کر دیا اور معمول کے خلاف قبل از وقت مرکز آگیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مولانا کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ میں نے کسی بچے کے ذریعے کہلوایا کہ بہت ضروری پیغام دینا ہے، اور مولانا جس حال میں ہوں مجھے ابھی ملنا ہے۔ اطلاع اندر گئی، دروازہ کھلا اور مولانا کو میں نے

مطلع کر دیا۔ مولانا کے چہرے کی معمولی جھلک میں کوئی فرق نہیں آیا ـــــ یہ تھی اس شخص کی عظمت!

سیفٹی ایکٹ

۱۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو گلے کی شدید خرابی کی وجہ سے مجھے حرارت تھی۔ نہ میں دفتر گیا، نہ اور کہیں باہر نکلا۔ مغرب کے وقت عبدالوحید خاں صاحب کے ایک عزیز آئے اور انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور مجھے بلا کر اچانک یہ خبر سنائی کہ

"طفیل صاحب گرفتار ہو گئے، اور وہ تھانے میں ہیں اور مجھے اُن کا بستر لے جانے کے لیے بھیجا ہے؟"

جلدی میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ:

"تلاشی ہوئی اور مطالبۂ حق (میرا لکھا ہوا ضبط شدہ پمفلٹ) کی ایک کاپی برآمد کر کے پولیس ساتھ لے گئی ہے"

اب میں نکلا کہ جا کر مرکز میں اطلاع کروں۔ وہاں پہنچا تو درس آخری مرحلے پر تھا۔ وہ ختم ہوا تو ڈی۔ ایس۔ پی صاحب، جو وہاں موجود تھے، انہوں نے مولانا سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کی، اور بات ہو گئی، بلکہ فوراً ہی بات کھل گئی۔ مولانا کھانا کھانے اور تیار ہونے کے لیے اندر چلے گئے۔ ہم سب لوگوں پر اس بات کا گہرا اثر تھا کہ حکمراں طاقت مسلمانوں اور ان کے ملک کے حقیقی

خیر خواہ کے ساتھ بالآخر وہی ظالمانہ سلوک کرنے پر تُل گئی ہے جس کے نمونوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ کچھ دیر کے بعد مولانا کا بستر آ گیا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد مولانا شیروانی پہنے ٹھیک اسی طرح ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ نمودار ہوئے جیسے وہ کسی سفر پر جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے ــــ کوئی فرق نہ تھا! اور برآمدے کے کنارے پر کھڑے انہوں نے یہ کہہ کر پان طلب کیا کہ

"ڈبیہ بٹوا کہاں ہے، آخری پان کھا لیا جائے"۔

پوچھا گیا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے۔

"بس اب طلاق دے رہا ہوں"۔

پان جیسے رفیق کے بارے میں مولانا کا یہ فیصلہ سن کر میں نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی یہ طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا

"نہیں! یہ طلاق رجعی ہے، مغلظ نہیں"!

اس پر سید نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے۔ بعد ازیں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کر کے نامعلوم مدت کی قید کے لیے مسلح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

مارشل لا

یہ سماں ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری گرفتاری کا منظر معلوم کرنے کی جو

خواہش دل میں تھی، اسے پورا کرنے کے لیے فقیر حسین صاحب سے دریافت کیا کہ مولانا کس طرح روانہ ہوئے۔ فقیر حسین صاحب سے خاص طور پر میں نے یہ بھی پوچھا کہ رات کو مولانا سے ملنے والا، یا ان کے بارے میں کچھ دریافت کرنے والا آخری شخص کون تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک نوجوان طالب علم مولانا سے دیر تک ڈارون کے نظریے پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کے بعد اور کوئی آدمی نہیں آیا۔ مولانا اندر چلے گئے اور یحییٰ صاحب اور فقیر حسین صاحب سو گئے۔ فقیر صاحب کو جب جگایا گیا تو ہر طرف روشنی ہو رہی تھی۔ اٹھتے ہی ان کی نگاہ یحییٰ صاحب پر پڑی جو جلدی جلدی اپنی ٹانگوں سے سُتلی کھول رہے تھے۔ (ٹانگوں میں درد کی وجہ سے انہوں نے یہ انوکھی تدبیر اختیار کی تھی) فقیر صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟" جواب میں یحییٰ صاحب نے دونوں ہاتھ کسی قدر اٹھا کر دبے لفظوں میں کہا "پولیس!" بہت جلد ان کو مطلع کر دیا گیا کہ ان کے گھر کی بھی تلاشی ہوگی، اور ان کو گھر چلنا ہے۔ فقیر حسین صاحب اٹھ کر مولانا کے دفتر کی طرف جانے کے لیے نکلے، جہاں اس وقت کارروائی ہو رہی تھی، تو باہر پولیس اور خفیہ ہر طرف پھیلی نظر آئی۔ معاً دو آدمی ان کے گرد ہو گئے۔ فقیر صاحب مولانا کے کمرے میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ چند اصحاب مولانا کی میز کے گرد بیٹھے ہیں اور تلاشی ہو رہی ہے۔ مولانا اپنی تیاری کے سلسلے میں غسل خانے سے نکلے۔ فقیر صاحب کہتے ہیں کہ مولانا اس سے بالکل بے نیاز تھے کہ ان کے کاغذات کے ساتھ کیا

سلوک ہو رہا ہے؛ اور کون کس حرکت میں مصروف ہے۔ فقیر صاحب کو جماعت کے خزانے کی فکر تھی، وہ چاہتے تھے کہ مولانا سے سیف کی کنجیوں کے بارے میں کوئی ہدایت حاصل کریں کہ یہ کس کی تحویل میں دی جائیں لیکن غالباً ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کنجیوں کے بارے میں "اغیار" کو کچھ معلوم بھی نہ کرایا جائے۔ اسی وہ حیران تھے کہ مولانا سے کس طرح بات کریں۔ آخر کنجیاں دکھا کر انہوں نے محض اشارے سے سوال کیا۔ مولانا نے بغیر کسی اہتمام کے وہیں سے کہا کہ ان کو بیگ صاحب کے حوالے کر دیجیئے ——— اور کنجیاں پولیس کے قبضے میں چلی گئیں، بلکہ خود خزانہ بھی، اور حساب کتاب کے کاغذات بھی!!

مولانا کی کیفیت یہی تھی کہ جیسے سفر پر جا رہے ہوں!

(کسے معلوم تھا کہ یہ سفر ایسا ہے کہ جس کی راہ میں پھانسی کی کوٹھری بھی آئے گی!)

شاہی قلعے میں

قلعے سے تقریباً ہر روز کچھ لوگ نکال کر بورسٹل جیل لائے جاتے۔ آنے والے اس تاریخی جہنم عقوبت کی اندرونی آبادی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خبریں لے آتے تھے۔ چنانچہ یہ اطلاع مل گئی کہ مولانا مودودی بھی قلعے میں ہیں۔

مولانا اصلاحی، چراغ الدین، نقی حسین، عبدالوحید خاں قلعے سے واپس

پہنچے اور اپنی اپنی سرگزشت بیان کی۔ یاد نہیں ان میں سے کس نے بتایا کہ کہیں آتے جاتے ان کی نگاہ بھی مولانا پر پڑی ہے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ وہ ان حضرات کی کوٹھڑیوں سے دور کسی کمرے میں رکھے گئے تھے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ گھر کے لوگوں کو ان سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، نیز ان کو کوئی سامان مطالعہ حتیٰ کہ قرآن شریف بھی نہیں دیا گیا۔

سنٹرل جیل

یہ تو محفوظ نہیں رہا کہ مولانا کس تاریخ کو سنٹرل جیل لائے گئے۔ وہ بہر حال ہمارے بورسٹل جیل سے سنٹرل جیل لے جائے جانے سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اس کی اطلاع ہمیں بورسٹل جیل ہی میں مل چکی تھی۔ اغلباً ۱۴ اپریل کے لگ بھگ مولانا قلعے سے باہر لائے گئے۔ گھنٹی گھر کے میدان میں اندراجات ہو جانے کے بعد ہمارے پہلے حبیب سیاست خانہ الاٹ ہوا تو اصلاحی صاحب کو بتایا گیا کہ انہیں دیوانی گھر جانا ہے، جہاں مولانا مودودی پہلے سے ہیں چنانچہ پہلے اصلاحی صاحب نمبردار کی معیت میں ہم سے رخصت ہوئے، اور اس وقت وہ ایک شدید تاثر میں تھے "اچھا رفیقو! خدا تم سب کا نگہبان ہو" یہ کہا اور مصافحہ کر کے چلے گئے۔

غالباً اسی رات کی تاریکی میں آتے جاتے وارڈروں نے مولانا کی خیر و عافیت

سے آگاہ کیا، اور اگر کوئی واسطہ نہ بھی ہوتا تو خدا کے فرشتے تو تھے جو ہماری طرف سے سلامتی کی دعائیں ادھر پہنچاتے تھے، اور ادھر سے محبت کے پیام ادھر لاتے تھے۔

— اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا کو بالکل ہماری طرح "سی کلاس" دی گئی ہے ہمیں تو خیر "زیڈ" کلاس بھی دے دی جاتی تو ہمارے ملک کی حکومت عالیہ کو احساس نہ کرنا چاہیے تھا، لیکن مولانا مودودی کو "سی کلاس" دے کر جس انتقامی پستی کا ثبوت دیا گیا وہ جمہوریت کے دامن پر شرمناک داغ ہے۔ مودودی ایک تحریک کا رہنما ہی نہ تھا، ایک نئے دورِ تاریخ کا افتتاح کرنے والا تاریخ ساز بھی ہے۔ وہ الجہاد فی الاسلام، تنقیحات، پردہ، اور تفہیم القرآن جیسی اونچی تصانیف کا مصنف ہی نہیں، وہ نئی نسل کے ذہن و کردار کا معمار بھی ہے۔ وہ زندگی بخش نظریات و خیالات دینے والا ادیب ہی نہیں، اپنے نظریات و خیالات کو عملاً غیر اسلام سے ٹکرا دینے والا بھی ہے۔ وہ صرف پاکستان ہی کے لیے سرمایۂ فخر نہیں، ساری دنیا میں اس سے دلچسپی لینے والے پھیلے ہوئے ہیں۔

کیا اسے "سی کلاس" میں رکھ کر تم اس کا ایمان بدل سکتے ہو؟ تم اس کی عظمت کو اس سے چھین سکتے ہو؟ تم اس کی عزت میں کوئی کمی پیدا کر سکتے ہو؟ تم اس کے تاریخی مقام کو اس سے چھین سکتے ہو؟ تم اس کی قدر کرنے والوں کی تعداد گھٹا سکتے ہو؟ —

مارشل لا کے تمام حوالاتیوں کو گھنٹہ گھر طلب کیا گیا۔ ہم بھی بلائے گئے۔ اس مرتبہ ملٹری کے سامنے پیشی تھی۔ ہم جب موقع پر پہنچے تو کچھ ہماری وضع قطع کو دیکھ کر، اور کچھ نام پوچھنے کے بعد یہ جان کر کہ ہم جماعت اسلامی کے کارکن ہیں، ہمیں ان حضرات نے میز کے ساتھ رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ پھر نام پتے پوچھے، اور اندراجات کیے۔ ایک ذرا اپنی اہمیت محسوس کرنے والے فوجی افسر نے (جو بعد میں مولانا مودودی کے مقدمے کی سماعت کرنے والے ججوں میں شامل تھا) ہم سے کچھ باتیں چھیڑ دیں۔ جماعت کے مقصد وغیرہ کے متعلق وہ معلومات لیتا رہا۔ اس کا انداز یہ تھا کہ جماعت کی کسی چیز کی تعریف کر کے پہلے اکساہٹ پیدا کرتا، پھر سوالات کرنے لگتا۔ ہمارے رفقا میں سے بعض مبلغانہ جوش میں آکر اس کے سوالات کا جواب کچھ نہ دے سکتے تھے، بلکہ یہ کہتے کہ ہماری طرف سے تو کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے، پولیس نے آپ گرفتار کیا ہے۔ اس پر سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک افسر (جو اس گروپ کے ساتھ شامل تھے) کہنے لگے کہ آپ لوگوں کے خلاف جو چیز لائی گئی وہ بڑی سخت چیز تھی، خدا کا شکر کیجیے کہ آپ لوگ اس سے بچ نکلے ہیں، اب تو معمولی بات ہے۔ ہم نے پوچھا کہ وہ کیا چیز تھی، تو ان صاحب نے بات گول کر دی۔ اس گفتگو کے دوران میں نہ صرف چاروں طرف لوگ کھڑے اس گفتگو کو توجہ سے سن رہے تھے، بلکہ ایک نوعمر فوجی افسر بالکل خاموشی سے ٹکٹکی باندھے ہماری طرف دیکھ رہا تھا ___ جیسے وہ ہمیں سمجھنے

کی کوشش کر رہا ہو۔

بہرحال ہمیں معلوم ہو گیا کہ مولانا پر کوئی مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔

فوجی عدالت

۷ رمئی کو طے شدہ پروگرام کے مطابق ناشتہ کرتے ہی فوجی عدالت جانے کی تیاری شروع ہو گئی، جہاں مولانا مودودی کا تاریخی مقدمہ زیر سماعت تھا۔ عدالت سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی کے اس ملحقہ ہال میں منعقد ہو رہی تھی جس کی چھت کے نیچے اس سے قبل سیاسی مقدمات فیصل ہو چکے تھے۔ اب یہاں مارشل لا کے خاص خاص مقدمات کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ اسی تاریخی ہال میں اب پاکستان کی وہ شخصیت مجرموں کے کٹہرے میں آ رہی تھی جس کا سب سے بڑا گناہ ملک بھر میں اسلامی نظام زندگی کی تڑپ پیدا کر دینا ہے، لیکن جسے اس کے اصل گناہ پر نہ پکڑ سکنے کی وجہ سے "قوت" ہمیشہ دانت پیستی رہی ہے، اور سازشی ذہن کے ساتھ برابر کسی زریں موقع کی تلاش میں رہی ہے — یہ زریں موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

سنٹرل جیل پہنچے تو مقدمے سے دلچسپی لینے والوں کا ایک ہجوم موجود پایا۔ اکثر رفقا سے یہیں جیل گیٹ پر ہو کر ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ معلوم یہ ہوا کہ اندر صرف پندرہ آدمیوں کے داخلے کی اجازت ہے، مگر ایک ایک کرتے کرتے بہت بڑی تعداد ہال میں جا پہنچی، اور زائرین مقدمہ کی گیلری اور اس کی سیڑھیاں پوری طرح بھر گئیں۔

ہم سب پاؤں داخل ہوئے، اور کارروائی کے دوران میں سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ مناظر ملزم بالکل ججوں کے سامنے ٹیبل کے متصل کھڑا اپنا تحریری بیان پڑھ رہا تھا ___ جو اس رات ۲ بجے طفیل صاحب کو املا کرا کے تیار کیا تھا ___ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملزم "جواب دعویٰ" نہیں پیش کر رہا ہے، بلکہ وہ کوئی جج ہے جو تاریخ کی عدالت میں کسی مقدمے کے ملزموں کو اپنا فیصلہ سنا رہا ہے۔ اس کا لب و لہجہ سنجیدگی، وقار اور حوصلہ مندی کا مظہر تھا۔

بیان ختم ہوا تو مولانا اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ چوہدری نذیر احمد خاں (مولانا کے وکیل) اور عنایت صاحب کی کرسیوں سے ذرا پیچھے ہال کے ایک پاسے کے ساتھ تھی۔ پیچھے کٹہرے میں سید نقی علی، اور قادیانی مسئلہ چھاپنے والے دو مالکان مطابع، بحیثیت ملزمان بیٹھے تھے۔ مقابل میں حکومت پنجاب کے سرکاری وکیل اور ان کے معاون کی نشست تھی۔ ججوں میں سے صدر (آئی-آئی-گیلانی) کا چہرہ سنجیدگی اور کسی قدر ذہنی تعمق کے آثار رکھتا تھا۔ صدر کے دائیں ہاتھ جو صاحب بیٹھے تھے ان سے پہلے ایک موقعہ پر بات کرنے کا موقع جیل میں مل چکا تھا۔ یہ تیز طرار آدمی تھے، اور چہرہ بھی اسی کا غماز تھا۔ صدر وقتاً فوقتاً انہی سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ صدر کے بائیں ہاتھ ایک صاحب اور تھے، جو کارروائی کے دوران میں بالکل بے حس و حرکت بالعموم آنکھیں بند کیے بیٹھے رہتے ___ ممکن ہے کہ سو بھی جاتے ہوں ___ ایک چھوٹے صاحب کارروائی کے نوٹس لینے اور کاغذات

وغیرہ کو محفوظ کرنے والے تھے۔ صدر کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ فوجی قانون کے علاوہ سول قانون سے بھی واقف ہیں۔ یہ تھی مارشل لا کی وہ نمائندہ طاقت جو مولانا مودودی ـــــ اور تحریک اسلامی ـــــ کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھی تھی۔

کارروائی سے اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ ملزم کا پلہ بھاری ہے، اور مدعی کا کیس بالکل کھوکھلا ہے۔ فریقین کے وکلا پر گہری نگاہ تنقید جمی رہی۔ اندازہ بالعموم یہی تھا کہ چودھری نذیر احمد نے کیس پلیڈ کرنے میں بڑی ذہانت اور محنت کا ثبوت دیا ہے۔ دوسری طرف حکومت پنجاب کے سرکاری وکیل تھے، جن کو ذہانت و محنت سے کام لینے کی نسبتہً کم ضرورت تھی۔ چودھری نذیر احمد خاں میں ایک تو اہم نکات پیدا کرنے کی صلاحیت نمایاں تھی، دوسرے زور بیان سرکاری وکیل سے زیادہ تھا۔ واضح رہے کہ زور بیان سے مراد محض شور بیان نہیں ـــــ چودھری نذیر احمد بہت دھیمی آواز میں متانت اور سنجیدگی سے بات کرتے تھے، لیکن انداز اتنی خود اعتمادی اور اتنا بڑا پن لیے ہوتا تھا کہ عدالت اس سے متاثر ہوتی تھی۔ جہاں کہیں دونوں میں بحث ہوتی ہے تو سرکاری وکیل پچھڑ گیا ہے۔ سرکاری وکیل کے چہرے پر، اور خصوصاً سفید آنکھوں پر تاثرات اندازِ پوری طرح جھلکتا تھا۔ ان کا بحث کے لیے اٹھنا اور اٹھنے سے پڑھ کر بیٹھنا، بڑا ولولہ انگیز ہوتا تھا۔ پھر گواہوں پر جرح کر کے جیسے کوئی نکتہ جیت کر، یا برعکس صورت میں بازی ہار کر آپ بیٹھتے تھے تو دونوں صورتوں میں انداز اتنا مختلف ہوتا تھا کہ ان کی ذہنی کیفیت ان کی آنکھوں سے

ٹپک پڑتی تھی۔ کامیابی کی صورت میں وہ ہم سامعین کو ایک اور ہی انداز سے دیکھتے تھے، اور ناکامی کی صورت میں نگاہوں کے زاویے بالکل دوسرے ہی ہوتے تھے۔

عدالت میں ایک نمایاں شخصیت ملک سعید کی تھی، جو مولانا کی کرسی کے ساتھ زمین پر کاغذات کے انبار رکھے ان میں کھوئے ہوئے تھے اخبارات کے فائلوں اور لٹریچر کی کتابوں کے اندر نشانات کی سلپس جا بجا چسپاں تھیں، اور جس جس چیز کی ضرورت پڑتی، نہایت پھرتی سے آپ پیش کر دیتے۔

کارروائی کے بیچ میں وقفہ ہوا تو مولانا خود ہی ہماری طرف بڑھے مصافحہ کرتے ہی پہلا فقرہ یہ کہا کہ

"آپ لوگوں نے سخت غداری کی"

میں نے فوراً جواب دیا کہ

"نہیں، مولانا! فکر نہ کیجیے، ہم دوبارہ لائے جانے والے ہیں"

اور میری نگاہ اچانک رشید خاں صاحب پر پڑی جو ہمارے گرفتار کنندہ تھے۔

مولانا سے اتنے دنوں بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ قلعہ کا حال پوچھا تو فرمانے لگے کہ

"ظالموں نے مجھے پورے ۲۱۶ گھنٹے کامل تنہائی میں رکھا ہے"

پھر یہ بھی پوچھا کہ آپ کو وہاں تنگ تو نہیں کیا گیا؟ فرمانے لگے کہ

"نہیں، معاملہ شریفانہ رہا ہے، اور میرے ساتھ یہ اس طرح کی حرکت نہیں کر سکتے۔"

پنڈلیوں کی تکلیف کا حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ جو مرض مہینوں کے علاج سے نہیں جا رہا تھا، وہ ہر علاج سے محروم ہو جانے کی حالت میں شافیٔ مطلق کے فضل و کرم سے خود بخود ختم ہو گیا۔

میں نے باتوں باتوں میں مولانا سے ذکر کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے، فرمانے لگے کہ

"ایسے نہیں! جیل آ گئے تو اس طرح چھوڑ دیجیے کہ گویا کبھی پیا ہی نہ تھا، اور پھر موقع ملے تو پھر پیجیے، اور خوب پیجیے! اس کے بعد پھر وقت آئے تو پھر چھوڑ دیجیے۔"

درحقیقت مولانا نے پان کے بارے میں اپنے مسلک کو سگریٹ کے ذکر میں بیان کر دیا۔ واضح رہے کہ مولانا کو ان دنوں پان ملتا ہے اور کھاتے ہیں، لیکن عادت پر کنٹرول اتنا ہے کہ جب چاہیں باگ کھینچ لیں، اور جب چاہیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

پھر میں نے اپنا ایک شعر سنایا:

یا تو تجربے کی شامت آئی ہے
یا مرے بال و پر کی خیر نہیں!

بولے :

"شامت تو بس پنجرے ہی کی آئی معلوم ہوتی ہے"

فوجی عدالت کے مقدمے سے گذرنے والے اس شخص کو یوں اپنی اصلی حالت پر مستقل دیکھ کر خیال آیا کہ ایسے مضبوط آدمی کو پھانسنے کے لیے یہ تدبیریں! اور یاد پڑتا ہے کہ اسی لمحے یہ خیال شعر کے سانچے میں ڈھل گیا :

تارِ عنکبوت کے جال میں الجھے ہوئے

لومڑی کی گھات میں، شیر کا شکار ہے

کیا عجب دیار ہے!

بعد میں اس شعر پہ ایک مکمل نظم تیار ہو گئی۔

بقیہ کارروائی کے خاتمے پر دوپہر کو عدالت برخاست ہو گئی۔ مولانا عدالت سے نکلے تو لوگوں کا ہجوم کا ہجوم ساتھ ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ جلوس سنٹرل جیل کے دروازے تک پہنچ گیا۔ آخر مولانا سلام کہہ کر اندر داخل ہو گئے اور کھڑکی بند ہو گئی۔

ہم گھروں کو واپس روانہ ہو گئے۔ ملک سعید صاحب نے دوپہر میرے ہاں گذارنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ دوستی کا تقاضا یہی تھا۔ ملک سعید صاحب پنجاب کے صوبائی نظام جماعت کے امیر اور مقدمے میں جماعت کی طرف سے چودھری نذیر احمد صاحب کے معاون ہیں۔ ملک سعید صاحب مزاحاً کہنے لگے کہ "میں اب ۱۲۴ الف کے مقدمے کا اتنا ماہر ہو گیا ہوں کہ اگر ضرورت پڑے تو بطور خود مقدمہ لڑ سکتا ہوں۔

ملک صاحب ایک طرف مقدمے سے متعلق حوالے جمع کرنے میں مصروف رہتے، دوسری طرف ہر روز شام کو چودھری صاحب کے ہاں جا کر ان سے اگلے دن کی کارروائی کے بارے میں ہدایات حاصل کرتے، اور جماعت کی پوزیشن بھی ان کو ذہن نشین کراتے۔

۸ رمئی کو بحث مولانا کے ایک بیان پر تھی، جس میں حکومت کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ تھانیدار کے دماغ سے سوچتی ہے۔ چودھری نذیر احمد خاں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اگر مولانا پسند کریں تو وہ صرف اتنی بات کہہ دیں کہ تسنیم میں شائع ہونے والے حرف حرف کا درست ہونا اور میری تحریر کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، پھر میں خود بحث کر سکوں گا۔ لیکن مولانا نے اس مشورے کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ جب عدالت نے تسنیم کا پرچہ پیش کر کے اس بیان کے بارے میں پوچھا تو مولانا خود اٹھ کر سامنے آئے اور کہا کہ

"ہاں یہ بیان میرا ہے، اور میں اس کے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔"

آج دونوں طرف سے شہادتیں مکمل ہو گئیں۔ کل سے وکلا کی بحث ہو گی۔ جہاں تک مقدمے کی ظاہری کارروائی کا تعلق ہے ہم مطمئن ہی نہیں، بہت خوش تھے۔ لیکن ایک "واقف حال" نے عدالت کے احاطے میں ایک ایسی اطلاع ہم تک پہنچائی کہ سارا سکون درہم برہم ہو گیا۔ وہ اطلاع خود مولانا مودودی کو بھی مل گئی۔ چنانچہ احاطہ عدالت سے سنٹرل جیل کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے خاص طور پر

مولانا نے مجمع عام سے الگ ہو کر دو سیکنڈ میں کوئی کلمہ مولانا اصلاحی کے کان میں کہا۔ ہم اس کلمے کو سنے بغیر جانتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت دھوپ اور بھوک کے ساتھ جب یہ اطلاع سنی گئی تو حالت ایسی ہو گئی جیسے بخار ہوتا ہے گھر پہنچ کر مقدمے کا حال بڑی احتیاط سے بیان کیا گیا، اور اپنے داخلی اثرات و کیفیات کو چھپانے کی کوشش کی گئی بے دلی سے کچھ کھانا کھایا، اور پھر تھکا ماندہ جسم نیند کی لہروں میں ڈوب گیا — لیکن نیند بھی عجیب بے سکون نیند تھی جیسے بخار میں غنودگی ہوتی ہے۔ اٹھ کر نماز پڑھی، اور صورت حال پر غور کرنے کے لیے مرکز پہنچے۔

وہاں سے ہمیں دوبارہ گرفتاری کے لیے طلب کر لیا گیا۔

اب ہم پھر اسی سیاست خانے میں تھے، جس سے نجات پائے کوئی زیادہ وقفہ نہ گزرا تھا۔ دن کو بھی، اور رات کو بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ دوبارہ گرفتاری کا راز کیا ہے۔ اب یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ — ایک رائے یہ تھی کہ شاید اب پولیس نے کوئی نیا الزام لگا کر ہمارے خلاف مقدمہ تیار کر لیا ہو، اور ہمیں عدالت میں پیش کر کے باقاعدہ سزا دلوائی جائے۔ دوسرا قیاس یہ تھا کہ شاید مولانا مودودی کے مقدمے کا کوئی ایسا فیصلہ سنایا جانے والا ہے جس کے رد عمل کو روکنے کے لیے ہم لوگوں کو مزید کچھ مدت کے لیے اندر رکھنا ضروری ہے — اور مولانا کو سزا ہو جانا ہمارے نزدیک قطعی تھا۔ اندازہ سات سال قید کا تھا۔

شاہی مہمان

جیل میں ان دنوں عام چرچا ہے کہ دو قادیانی قیدیوں (مرزا ناصر احمد اور مرزا محمد شریف جو مرزا بشیر الدین محمود کے بیٹے اور بھائی ہیں) کے ساتھ نہایت درجہ امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ ان کو شاہی وارڈ" میں جگہ دی گئی تھی، اور جیل کے افسر، بلکہ خود آئی جی صاحب (جو خود بھی قادیانی ہیں) صبح و شام ان کے پاس جاتے تھے اور ان کی ضروریات اور شکایات معلوم کرتے تھے — ایک طرف یہ نازبرداری، اور دوسری طرف مولانا مودودی سے وہ سلوک کہ "سی کلاس" دے کر کبھی یہاں ڈال دیا اور کبھی وہاں جا رکھا۔

سزا

۱۲ مئی کو علی الصباح پھر بلاوا آیا کہ مارشل لا والے سب کے سب گھنٹی گھر چلیں۔ ہم جانتے تھے کہ وہی فہرستیں بنانے اور ان کی جانچ پڑتال کرنے کا عمل ہو رہا ہو گا۔ نام پڑھے جائیں گے، اور دو چار گھنٹے بٹھا کر رخصت کر دیا جائے گا۔ اس پھیکے پن کے باوجود ہمیں یہ جانا پسند آتا تھا۔ ایک تو احاطے سے نکلنے تو سیر ہو جاتی، دوسرے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوتیں اور خوب دل کھول کر باتیں بھی ہوتیں۔ علاوہ بریں خبریں، خصوصاً جیل کے محکمہ تعلیمات عامہ کی نشریات کے

سننے کا موقع ملتا۔ پھر خیال یہ بھی تھا کہ مارشل لا جلد ہی اُٹھنے والا ہے، اس لیے شاید معاملہ بٹنا یا جانے والا ہو۔ اغلباً ادھر کی، یا اُدھر کی صورت ہو جائے گی۔ نمبردار کی قیادت میں ہمارا گروپ نکلا تو نسیم صبح پوری طرح مہربانی فرما رہی تھی۔ اس کے جھونکوں سے دلوں کے کنول کھل رہے تھے۔ ان جھونکوں کی قدر و قیمت کو وہی جان سکتا ہے جس نے مئی کی رات لاہور میں ایک تنگ کوٹھڑی کے اندر گزاری ہو۔ آپس میں ہنسی، دل لگی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ یہ ہوا اور یہ سماں ہو تو پھر یہ لوگ ہمیں بلاتے رہیں تو اچھا ہو۔ سیر و تفریح ہو جایا کرے۔ میں جس سرور و کیف میں یہ باتیں کہہ رہا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اپنے پیچھے کتنا بڑا کاروانِ آزمائش لا رہا ہے۔ بس دس قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ بدھی خانے سے لوگوں نے ہمیں پکارا اور اظہارِ افسوس کے لیے کہا کہ "مولانا کو سزا ہو گئی" اور ہم سب دھک سے رہ گئے۔ کتنی سزا ہوئی؟ کب ہوئی؟ — جلدی بتاؤ؟ — پھر ہمیں تفصیل بتائی گئی کہ "رات کو مولانا کو پھانسی کا حکم ملا ہے، ایک مولوی صاحب کو ۹ سال اور دوسرے کو ۵ سال اور ۳ سال"۔ ہمارے اوپر تو جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ اعصاب سُن سے ہو گئے، اور مجسموں کی طرح ہم آگے کو حرکت کرنے لگے۔ رات رات میں تقریباً ساری جیل میں یہ خبر پھیل گئی تھی، مگر ہم اس سے بالکل بے خبر بیمار رکھے گئے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا آخری گھڑی آگئی؟ — کیا اب قوم اور اس ملک کا

فیصلہ ہو جانے والا ہے؟ کیا دین کے دیئے اب یہاں بالکل گل کر دیئے جائینگے؟ کیا واقعی ہمارے ملک کے دشمنانِ دین کی حقیر اقلیت کے نمائندے اتنی قوت رکھتے ہیں کہ وہ مولانا مودودی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیں؟ —

اور مجھے مولانا مودودی کے وہ تاریخی فقرے یاد آگئے جو پندرہ سولہ برس قبل قلمبند کیے گئے تھے کہ "نام نہاد قوم پرست مسلمان اسلامی تحریک کو کچلنے میں کفار سے زیادہ بے باک ہونگے۔ کفار جس چیز پر قید اور جرمانے کی سزا دیتے ہیں وہ اس پر پھانسی کی سزا دیں گے، اور پھر بھی جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔"

اصلاحی نظم کا یہ بند بھی ذہن میں گونجنے لگا کہ:

کرسی پہ عدالت کی ڈاکو پہلے بھی قابض پائے گئے
پیشی میں اُن کی اہلِ حق الزام لگا کر لائے گئے
جو خونی سے سرکاری تھے ———
تاریخ کے یہ اعجوبے ہیں
——— جو محسن تھے غدار بنے
کچھ ہم پہ نرالا ظلم نہیں پہلے بھی کرم فرمائے گئے

دل میں نئے جذبے نے کروٹ لی۔ خیال آیا کہ یہ لوگ مولانا مودودی کو پھانسی دے بھی ڈالیں تو کیا یہ مودودی کے پیغام اور اس کی فکر کو بھی پھانسی دے سکتے ہیں جو گھر گھر پہنچ چکا ہے، اور جس نے نوجوان نسل کو مغرب کی مرعوبیت سے نکال کر اپنے

حلقۂ اثر میں لے لیا ہے! ـــ اب مودودی کا پیغام موجودہ دور کی تاریخ کی رگوں کے اندر اتر چکا ہے۔ اس کے خیالات اس کے مخالفین تک کے ذہنوں میں بولتے ہیں۔ اس کی اصطلاحات اس کے حاسدوں تک کا جزوِ دماغ ہو چکی ہیں۔ اس کی بولی کی گونج اب دُور دُور تک سنائی دیتی ہے! جس تحریک کو اس نے اپنے پسینے سے پرورش دی ہے، اگر اس کی جڑوں کو اس کے خون کے قطروں سے سیراب کر دو گے تو وہ آناً فاناً ایک تناور درخت میں بدل جائے گی۔ اب تو اس کی موت اس کے پیغام کو زندہ تر کر دے گی۔

یہ سوچتے سوچتے ہم دیوانی گھر کے پاس آپہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔

مولانا اصلاحی، چودھری محمد اکبر، میاں طفیل محمد سبھی دروازے پر آئے۔ تاثرات کا دو طرفہ یہ عالم تھا کہ نہ ہم بات میں پہل کرنا چاہتے تھے، اور نہ وہی حضرات اس ذکر کو چھیڑنا چاہتے تھے۔ ہماری نگاہوں ہی نگاہوں نے استفسار کیا، اور ان کی نگاہوں ہی نگاہوں نے خبر کی تصدیق کر دی۔ اصلاحی صاحب نے تفصیل بتائی کہ جیل کے ایک افسر کی معیت میں فوجی افسر حکم لے کر پہنچا۔ نماز مغرب کے بعد مولانا کو حکم سنایا گیا، اور ان کو اسی وقت وہاں سے پھانسی کی کوٹھری کی طرف لے جایا گیا۔ یہ بات سنتے سناتے ہوئے اس طرح محسوس نہیں ہوتی جیسے کسی دیکھنے والے کو محسوس ہو سکتی ہے۔ ہمارے جن رفقاء نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا ـــ اور مولانا کے علاوہ ملک نصراللہ خاں عزیز اور سید نقی علی کی جدائی کا بھی ـــ وہی جانتے ہیں کہ ابر پہ

کیا گزری! اصلاحی صاحب جیسا خوگر ضبط آدمی بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پھر وہ سماں کہ مولانا کو جیل کا لباس پہنا کر ان کے ذاتی کپڑے راتوں رات دیوانی گھر واپس کیے گئے تو ایک مرتبہ پھر دلوں پر قیامت گزر گئی۔

مولانا اصلاحی

اصلاحی صاحب کو نمبردار نے بتایا کہ آپ کی رہائی کے کاغذات آ گئے ہیں۔ مولانا نے خاموشی سے سنا بلعد میں جذبات امڈ آئے تو کہنے لگے کہ

"جب وہی شخص دنیا میں نہ رہا کہ جس کی رفاقت میں رہنے سے زندگی تھی، تو پھر میں رہا ہو کر کیا کروں گا؟ میرے لیے اب رہائی میں کونسی خوشی باقی رہ گئی ہے؟ جیل سے باہر اب میرے لیے کیا دلچسپی ہوگی؟"

مجھے اصلاحی صاحب کے طرز عمل سے یہ تو معلوم تھا کہ وہ اور مولانا اقرب ترین رفقاء میں لیکن مجھے اس والہانہ محبت کا اندازہ نہ تھا ــــ اور شاید کسی کو بھی نہ ہوگا۔ جو اس جملے سے ظاہر ہوئی خالص اللہ کے لیے سچی اور گہری محبت کی مزید ایک مثال اصلاحی صاحب نے تاریخ انسانیت کو فراہم کر دی۔ اصلاحی صاحب کی آنکھوں میں یہ الفاظ کہتے ہوئے آنسو تیر گئے لیکن ضبط نے انہیں پلکوں کے اندر ہی اندر خشک کر کے رکھ دیا۔ کچھ دیر پھر خاموش رہے۔ اس کے بعد پھر بولے تو کہا:

"میں مودودی صاحب کو ایک بڑا اور بہت بلند آدمی سمجھتا تھا لیے

آدمی کم پیدا ہوتے ہیں، مگر آج تک میں ان کو اتنا بڑا نہیں سمجھتا تھا جتنا وہ آج بڑے ہو گئے ہیں مجھے اس کا کبھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے ان کے لیے ایک ایسی سعادت مخصوص کر رکھی ہے کہ وہ اس کے دین کی راہ میں ایک دن پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہزارہا ہستیوں میں سے چن کر ایک اونچے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔"

کوٹھی ٹوٹ گئی

۱۴ رمئی کو، بعد دوپہر، ہماری پشت کی بیرونی کوٹھریوں سے یہ خبر روشندان کے راستے منتقل ہو کر آئی کہ مولانا عبدالستار نیازی کی "کوٹھی ٹوٹ گئی" (یعنی سزائے موت منسوخ ہو گئی)۔ ہم نے دلچسپی سے خبر کو سنا، کیونکہ اگر مولانا نیازی کو پھانسی کی سزا نہیں دی جا رہی تھی تو پھر مولانا مودودی کو تو بالکل نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگرچہ ساتھ ہی یہ برعکس خیال بھی آیا کہ مولانا نیازی سے بہر حال وہ خطرہ حکومت کو نہیں، جو مولانا مودودی سے ہے، نیز مولانا نیازی کی طرف سے تو رحم کی اپیل کی گئی تھی لیکن مولانا مودودی تو اس پر تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم نے روشندان ہی کے ذریعے جب تفصیل مانگی تو جواب ملا کہ مولانا نیازی کی کوٹھی ٹوٹنے کی خبر عام ہے، اخبار میں بھی آگئی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ مولانا مودودی کی کوٹھی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ شبہ ہوا کہ مولانا مودودی کا نام یونہی شامل کیا جا رہا ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا

کہ خبر کا اصل ذریعہ باہر کی کوٹھری عا میں ہے تو ہم اس کے بالمقابل کی اندرونی کوٹھری میں پہنچے۔ پکار کر خبر کی تفصیل پوچھی تو باٹا پور کے تعلیم یافتہ حوالاتیوں نے جواب دیا کہ خبر صحیح ہے، اور اخبار میں بھی ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ اخبار میں خود ہم نے نہیں پڑھی۔ یہ بھی ان سے معلوم ہوا کہ مولانا مودودی کی سزا کے خلاف کراچی اور سندھ اور بعض دوسری جگہوں میں سخت احتجاج ہوا ہے تسلی نہیں ہوئی مگر امیدوں کے لیے میدان کھل گیا۔ اس کے بعد ہم کو کوٹھری میں حسب معمول مقفل کر دیا گیا، اور بیرونی دنیا سے ہم کٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد گنتی کرنے ہمارا عیسائی منشی آیا۔ اس نے جنگلے پر آکر یہی خبر سنائی ہم نے کہا دیکھیے ہم ٹھیک ٹھیک اطلاع چاہتے ہیں۔ اس پر وہ بگڑ کر چپ چاپ چلا گیا۔ گویا اس نے محسوس کیا کہ ہم اس پر جھوٹ کا الزام لگا رہے ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر منظور صاحب بھی اسی دوران میں گشت پر آئے تھے۔ اور انہوں نے بھی تصدیق کر دی۔ اب خبر یقینی ہو گئی تھی۔ بالآخر وہ خاص نمبردار اس خبر کو پہنچانے کے لیے آگیا جو ہمارے لیے واحد معتمد ذریعہ معلومات تھا۔ بس اس وقت گویا ہم سو فی صدی یقین کی حالت کو پہنچ گئے۔ اب تو یہ بھی بتا دیا گیا کہ ہم مولانا کو خود دیکھ کر آئے ہیں۔ وہ کوٹھری سے نکال کر ہسپتال میں لائے جا چکے ہیں۔ سجدۂ شکر ادا کیا!

یہ جان کر کہ پھانسی کی سزا چودہ سال قید بامشقت میں بدل گئی ہے، ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے مولانا بالکل آزاد ہو چکے ہیں، اور چودہ سال قید بامشقت کوئی

چیز نہیں ہے۔ اندازہ یہ بھی تو تھا کہ اگر رائے عام اسی طرح حساس رہی تو مولانا کو قید میں رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔

سیر راہے

اتفاق کی بات کہ ۱۵ مئی کو میری ہفتہ وار ملاقات تھی۔ ہماری ملاقات حوالاتی ہونے کی وجہ سے "سی" کلاس کے عام قیدیوں کے کمرے میں اس طرح ہوتی تھی کہ جنگلے کے باہر دوست احباب، بیوی بچے آجاتے اور جنگلے کے اندر سے ان سے مصافحہ کر لیا جاتا۔ باتیں ہوتیں اور کھانے پینے کی چیزیں لی جاتیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ملاقات پندرہ منٹ کی ہوتی تھی۔ ملاقات سے فارغ ہو کر ڈیوڑھی کے گیٹ کے ساتھ بغلی دروازے سے نکلا ہی تھا کہ کسی نے یہ اطلاع دی کہ مولانا مودودی بھی ملاقات کو آئے ہوئے تھے اور اب واپس نکلنے والے ہیں گیٹ کے سوراخ میں سے ان کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ اس مسافر حق کے چہرے کو دیکھ لوں جو پھانسی کی کوٹھری تک کی منزل سے ہو کے لوٹا ہے۔ وہ چہرہ کیسا ہو گا؟ وہ پیشانی کیسی ہو گی؟ وہ آنکھیں کیسی ہوں گی؟ اور اس مسافر نے یہ سفر طے بھی کیا تو بڑی سرعت رفتاری سے کیا۔ وہی بات کہ

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

ڈیوڑھی کے گیٹ کی کھڑکی کھٹ کھٹاک کے شور سے کھلی، اور اب وہ چہرہ

بالکل سامنے تھا۔ آگے بڑھ کر ملاقات کی، مولانا بغل گیر ہو کر ملے۔ یہ موقع پھر ایسا موقع تھا کہ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر گئے ــــ زبان پر تحمید کے کلمات تھے۔ مولانا نے اس موقعہ پر جیل کا لباس پہن رکھا تھا۔ بڑے بڑے خانوں والے کھدر کا کرتا اور پاجامہ ــــ چلتے چلتے "منزل جاناں" کے احوال پوچھے۔ مولانا نے بتایا کہ "بڑے اطمینان سے تین راتیں گزریں اور کل انہیں باہر نکالنا پڑا۔ مجھ سے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں رحم کی اپیل ان کے سامنے کروں۔ اس کے لیے تو میری جوتی کی نوک بھی تیار نہیں ہے" (روایت بالمعنیٰ)۔ مولانا باہر کے تازہ حالات سے بھی باخبر تھے کہ احتجاج کس پیمانے پر ہوا۔ خود مجھے بھی ملاقات میں کچھ معلومات مل گئی تھیں۔ اس مختصر سی سرراہے ملاقات نے صبر و ہمت کی تاب میں مزید اضافہ کر دیا۔ اور میں اس ملاقات کی عجیب بے پایاں سی مسرت سینے میں لیے جلدی جلدی واپس پہنچا تاکہ اپنے ساتھیوں کو بھی اس میں شریک کر سکوں۔ سب نے پورے اشتیاق سے روداد سنی۔

پچھر خطہ

۱۹ مئی وہ تاریخی دن تھا جب کہ ہمیں رہائی کے پرچے دے کر ڈیوڑھی بھیجا گیا لیکن گھنٹی گھر ہی میں معلوم ہو گیا کہ آگے سیفٹی ایکٹ کا دام پھیلائے شکاری موجود ہیں۔ پھر مہینے کی نظر بندی قبول کر کے ہم لوٹے تو اتفاقاً راستے میں مولانا

مودودی سے ملاقات ہوگئی طفیل صاحب اور اصلاحی صاحب تو ان کے پاس ہی سے آئے تھے ہمیں واپس آتے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ہم پر کیا گزری ــــ تاہم دریافت کیا کہ "کہیے! جناب! کیا ہوا؟" ــــ ہم نے بتایا کہ چھ چھ مہینے مل گئے ہیں۔ فرمایا کہ "اطمینان سے ڈٹ جائیے" اور یہ الفاظ نہایت مطمئن اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کہے گئے، جیسے سیفٹی ایکٹ کا یہ وار سہنا ایک کھیل ہو، جیسے چھ مہینے کی نظر بندی ایک تفریح ہو، جیسے حکمراں طبقے کی یہ زیادتی محض ایک مذاق ہو! اور معاً محسوس ہوا کہ چھ مہینوں کا بوجھ ہلکا ہو کر چھ دنوں کے برابر رہ گیا ہے۔

عجلت تھی، لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ مولانا کے لیے سوت کاتنے کی مشقت تجویز ہوئی ہے۔ ابتدائی چند دن ٹریننگ کے ہیں۔ یہ شخص جس کے سپرد تاریخ کے چرخے پر قوم کی قسمت کا تار کاتنے کا فریضہ ہے، وہ اب سوت کاتے گا، اور اس سے جیل کے قیدیوں کے کپڑے بنے جائیں گے وہ ہاتھ جو "تفہیم القرآن" لکھنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اب یہاں چرخہ چلائیں گے۔ مشقت ضروری سہی۔ مگر ایک تعلیم یافتہ شخصیت ــــ بلکہ ایک عظیم مفکر کی شخصیت ــــ کے لیے کیا چرخہ کاتنے سے بہتر وقت کا کوئی اور مصرف باقی نہیں رہا تھا اور چند گز سوت کات کر ملک کی دولت میں جو اضافہ کرے گا کیا وہ اس سے زیادہ گراں بہا ہے جتنا وہ اپنی دماغی محنت کے نتائج پیش کر کے اضافہ کر سکتا ہے؟ ــــ پھر قوم کو ایک معمارِ فکر و بصیرت کی اصل خدمت سے محروم کرنے کے لیے اسے غیر مفید کام

میں لگانا خود قوم پر ہی ایک ظلم نہیں ہے۔ اور کیا یہ حرکت خود ایسے قیمتی شخص کے لیے ٹارچر کرنے کے مترادف نہیں ہے؟

احاطے پہنچے، اطمینان سے ٹک گئے، تو پھر طفیل صاحب نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا کہ مولانا کو "بی کلاس" وارڈ میں خالص اخلاقی قیدیوں کی سوسائٹی میں جا ڈالا گیا ہے۔

کھری کھری

"لاہور سنٹرل جیل نیوز سروس" کی نشر کردہ یہ تازہ خبر موصول ہوئی اور مجمع عام میں سنائی گئی کہ مولانا مودودی نے چودھری علی اکبر صاحب، وزیر جیل خانہ جات کو جیل کی فضا اور اس کے نظم و نسق کی اصلاح کے لیے مفید مشورے دیئے۔ مثلاً ان کی توجہ اس امر پر مبذول کرائی کہ یہاں قیدیوں سے "پوچا" جیسی مشقتیں لی جاتی ہیں۔ جن پر قوت و وقت کا صرف زیادہ ہوتا ہے، لیکن مقابلتہً نتیجہ بالکل ہیچ ہوتا ہے۔ خود قیدیوں کو تو ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، نہ مالی فائدہ، نہ تربیتی، نہ ذہنی! کیوں نہ قیدیوں کو اچھی اچھی صنعتیں سکھا کر باہر بھیجا جائے کہ وہ باعزت طریق سے روزی کما سکیں۔ ان کی مشقت کے ان کو اسی شرح سے معاوضے بھی دیئے جائیں جو ملک میں رائج ہے۔ ایسی ہی اصلاحات کی طرف توجہ دلانے کے بعد مولانا نے کچھ کھری کھری باتیں سیاسی تبدیلیوں اور نظربندوں

کے بارے میں بھی کہیں حالات و واقعات کے افسوسناک پہلو بیان کرنے کے بعد مولانا نے کہا کہ "کیا آپ لوگ اس اصول پر عمل پیرا ہیں کہ جو پارٹی برسراقتدار آجائے وہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ بدترین، توہین آمیز اور انتقامی سلوک کرے! اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس کے نتائج آپ کے حق میں کبھی اچھے نہیں ہو سکتے۔"

جیل میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ قیدیوں کو حیرت تھی کہ ایک وزیر کے سامنے یہ صاف گوئی!

مجلس مشاورت

راقم چوہدری اختر صاحب نے مژدہ سنایا کہ مولانا اصلاحی، چوہدری محمد اکبر، میاں طفیل محمد اور مجھ کو ڈیوڑھی بلایا گیا ہے۔ مولانا سے ملاقات کے لیے اسات بجے احاطے سے چلے جانا ہے۔ نہانے سے فراغت پا کر کپڑے بدلے، جلدی جلدی ناشتہ کیا اور نمبردار کی نگرانی میں روانہ ہو گئے۔ دوسرا پہر آدھ گھنٹے گھر تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ڈیوڑھی میں ملاقات کا وقت ۱۰ بجے ہے۔ سو آدھ گھنٹہ یہاں گزارنا پڑا۔ یکایک درختوں کی جھکی جھکی ٹہنیوں کے خلا میں سے مولانا کی صورت دکھائی دی۔ "آ گئے" کی آواز بلند ہوئی، اور سب جلدی سے لپکے۔ خود مولانا ہم سے زیادہ تشنۂ ملاقات معلوم ہوتے۔ مصافحہ کے بجائے معانقہ ہوا۔ واضح رہے کہ جیل میں آ کر مولانا نے معانقہ کی تربیت ہی نہیں پائی، بلکہ اب

ان کے اندر اس کا پورا پورا ذوق ابھر آیا ہے پہلے اگر مولانا سے کوئی صاحب آکر زبردستی معانقہ کرتے تھے تو مولانا ہمہ تن صبر ہونے کی وجہ سے اسے بس سہ جاتے تھے۔ لیکن اب تو مولانا خود پیش دستی فرما لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے درحقیقت احباب و رفقاء سے جدا رکھے جانے کا!

مولانا نے راستہ چلتے چلتے خود ہی بیان کیا کہ میانوالی میں سے جا کر ان کو بالکل قید تنہائی میں ڈال دیا گیا تھا۔ سوائے ایک وارڈر کے اور ایک مشقتی کے کسی ابن آدم کا گذر نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ اور تو اور اسسٹنٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی مولانا کے احاطے میں نہیں جاتا تھا۔ ڈاکٹر کو اگر کبھی جانا پڑتا تو اس کے ساتھ بھی نگراں ہوتے۔

مولانا کے ساتھ ملک عزیز بھی تھے۔ باہم دگر خیر و عافیت پوچھتے ڈیوڑھی پہنچے۔ بورسٹل جیل سے ہمارے ملتانی رفقاء کو بھی بلوایا گیا تھا۔ ان سے ملاقات تو بالکل ہی نعمت غیر مترقبہ تھی۔ ۶ ، ۷ مارچ کو ان سے آخری ملاقات مرکز میں ہوئی تھی۔ بعد میں وہ اپنی جگہ گرفتار ہو گئے اور ہم اپنی جگہ مارشل لاء کے تحت جکڑے گئے۔ پھر یہ اطلاع تو مل گئی کہ ان کو بورسٹل جیل میں لایا گیا ہے ، مگر تفصیل سے کچھ نہیں معلوم ہو رہا تھا بورسٹل کے ساتھ جب ہم طور صاحب کا تصور کرتے تھے تو ہم ان رفقاء کے بارے میں تشویش میں پڑ جاتے تھے الحمد للہ کہ آج باقر خاں، چودھری نذیر احمد، خان محمد ربانی صاحبان سے بالمشافہ حالات

معلوم ہوئے اور اطمینان ہوا کہ وہ ہم سے بھی کچھ بہتر حالات میں ہیں، کیونکہ "ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا" ــ یعنی موصوف تشریف لے جا چکے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد چودھری غلام محمد، ملک سعید اور صفدر تینوں ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ معانقے کے بعد "معاملے" کی بات چیت شروع ہو گئی۔ یہ دراصل ایک مجلس مشاورت تھی جو خاص اجازت سے سنٹرل جیل میں منعقد ہو رہی تھی۔ سب سے آخر میں جماعت اسلامی کے وکیل چودھری نذیر احمد اور غیاث الدین تشریف لائے۔

دلیل کی بجائے کورٹ مارشل

چودھری نذیر احمد صاحب مقدمے کے سلسلے میں مختلف نکات پر لانا سے مفصّل گفتگو کرتے رہے جس میں ضرورتاً دوسرے بھی حصہ لیتے رہے۔ چودھری نذیر احمد صاحب نے فرنگیت مآب طبقے ــ جس میں سے ہماری حکمراں طاقت اُبھری ہے ــ کے رجحانات کو بھی ضمناً بیان کیا کہ ان رجحانات کو ذہن میں رکھ کر عدالتی کارروائی میں حصہ لینا چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ جماعت اسلامی کے بارے میں اوپر والوں کا تصوّر یہ ہے کہ یہ لوگ نہ تو خریدے جا سکتے ہیں، نہ ڈرائے جا سکتے ہیں، اور نہ بوقت ضرورت استعمال کیے جا سکتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ اس تحریک کے ذریعے مولانا مودودی برسر اقتدار آ کر

ایک بدترین ڈکٹیٹر شپ جانا چاہتے ہیں، اور اسی لیے مولانا مودودی نے انتخابات میں حصہ لینے کا اقدام بھی کیا ہے، اور دستور کا مسئلہ بھی چھیڑا ہے۔ یہ مذہبی ڈکٹیٹرشپ اگر ایک مرتبہ قائم ہو گئی تو پھر کسی کی خیر نہیں، لہٰذا پوری سختی سے اس طاقت کو کچل دینا چاہیے۔ ضمناً اس نکتے پر تھوڑی سی گفتگو ہو گئی۔ مولانا فرمانے لگے کہ اس معاملے میں ہمارا لٹریچر اور دستور اور ہمارا نظامِ جماعت یہ بتا سکتا ہے کہ ہم لوگ سب سے زیادہ جمہوریت پسند ہیں اور ہمارے ہاں ڈکٹیٹرانہ ذہنیت کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ جو شخص ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہو، وہ کسی ایسے نظامِ جماعت کو کب گوارا کرتا ہے جس میں عہدوں کے لیے انتخابِ افراد کا پورا پورا حق عام ارکان کو حاصل ہو، اور انتخاب کرنے کے ساتھ ساتھ وہ معزول کرنے کا اختیار بھی رکھتے ہوں، اور جس میں امیر اور ارکانِ شوریٰ اور عام ارکان پر ہر رکن کو تنقید کا پورا پورا حق دیا گیا ہو، اور جس میں امیر اپنی شوریٰ کے مشورے کا پابند بنا دیا گیا ہو۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ یہ طبقہ اپنی مطلب برآری کے لیے مغرب کی تھیوکریسی کا تصور اٹھا کر ہمارے نظامِ فکر پر چسپاں کر دیتا ہے، حالانکہ دونوں میں کوئی بعید ترین نسبت بھی نہیں۔

مولانا مودودی نے فرمایا کہ ہم نے تو بڑی محنت کر کے اس خلیج کو پاٹا ہے جو ہمارے ہاں کے مذہبی طبقے اور جدید طبقے میں حائل تھی۔ یہ دونوں بالکل جداگانہ طور پر پروان چڑھے تھے کہ نہ یہ اس کو جانتا تھا اور نہ وہ اس کو سمجھتا تھا۔ ہم نے بیچ کی راہ نکالی ہے اور کام کرنے کی صحیح تدبیر اختیار کی ہے۔ لیکن اقتدار پر

کیا ہوا مغرب پرست طبقہ ہماری مخالفت "ملاازم" کا نام دھر کر کرتا ہے یعنی اصل اسلام کو براہ راست گالیاں دینا چونکہ ممکن نہیں، اس لیے اسے "ملاازم" کا نام دے کر پھر دل کا بخار نکالا جاتا ہے۔

چودھری نذیر احمد صاحب نے اس پر "جرح" کرتے ہوئے پوچھا کہ حکمران طبقے کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اصل اسلام کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ اسلام کی اس شکل کے مخالف ہیں جو ملاؤں نے بطور خود بنادی ہے، اور اسی کو ہم "ملاازم" کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنے تصور کے مطابق "ملاازم" جیسی غلط اور خطرناک چیز کو کیوں نہ کچلیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کو اختلاف اگر صرف تصورِ اسلام پر ہو تو سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ ہمارے "ملاازم" کے مقابلے میں اپنا خالص اسلام پبلک کے سامنے اپنے استدلال کے ساتھ رکھ دیں، اور پھر لوگوں کو حق دیں کہ وہ جس تصور کو چاہیں اختیار کریں اور جس کو چاہیں رد کر دیں۔ لیکن یہ کیا طریقہ ہے کہ یہ لوگ اپنے "خالص اسلام" کو منوانے کے لیے مجھے پھانسی دیتے ہیں۔ میں نے ہر چیز دلیل کے ساتھ پبلک کے سامنے رکھی ہے، اور دلیل ہی کے ذریعے رائے عام کو مطمئن کیا ہے لیکن یہ لوگ دلیل کے بجائے کورٹ مارشل کے ذریعے اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔

یہاں بیچ میں مطالعہ نگار یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا مودودی کی خدمات میں سے ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے عوام کو اندھے جوش سے ہٹا کر ہوش

کا درس دیا ہے۔ انہوں نے مسائل کو سنجیدگی سے سوچنا اور سمجھنا سکھایا ہے انہوں نے دلیل کا وقار مضبوط کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی ہے۔ انہوں نے اختلاف کے حق کو تسلیم کیا ہے، اور تسلیم کرانے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے تبدیلی کے لیے رائے عام کی تیاری کو ایک لازمی عامل د ، قرار دیا ہے۔ انہوں نے ہوائی تقریروں کے بجائے ٹھوس علمی لٹریچر کو خیالات پیش کرنے کا بنیادی ذریعہ بنایا ہے پھر انہوں نے انتخابات کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس سے زیادہ جمہوری طریقہ اب تک دنیا میں زیر استعمال نہیں ہے۔ یہ شخص ایک طرف عوام کو تلقین کرتا ہے کہ ہلڑ اور ہنگامہ آرائیوں اور نعرہ بازیوں کے بجائے پُرامن جمہوری طریقوں سے کام کریں اور دوسری طرف کئی کئی بار حکمران طبقے کو نصیحت کر چکا ہے کہ دیکھئے لوگوں کے مطالبات اور ان کی شکایات کو محض معقول دلائل اور رائے عام کی تائید کی بنا پر قبول کرنے کی عادت ڈالیے، ورنہ لوگوں کو آپ مشتعل کر کے ہنگامہ آرائی کی راہ پر ڈال دینگے اور وہ اپنے آپ کو سرپھرے لوگوں کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا

آئی۔ جی جیل خانہ جات کی آمد کا انتظار رہا۔ لیکن ان کا وقت دوسرے احاطوں میں اتنا صرف ہو گیا کہ ہمارے احاطے میں نہ آ سکے۔ ایک راوی کے ذریعے معلوم ہوا

کہ موصوف اپنے ساتھیوں سمیت مولانا مودودی کے ہاں بھی گئے تھے۔ وہاں خاصی گفتگو رہی۔ وہ ہاری کمیٹی رپورٹ والے مسعود صاحب ساتھ تھے۔ وہ بولنے اور بحث و گفتگو کرنے اور خاص طور سے مذہبی مسائل سے تعریج کرنے کا دیرینہ ذوق، بلکہ "بحث خو لیا" رکھتے ہیں۔ انہوں نے مولانا سے قادیانی مسئلہ کے بارے میں اظہار اختلاف کیا۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ پہلے مسئلے کو سمجھئے پھر رائے قائم کیجئے۔

ایک لطیفہ خوب رہا!

مسعود صاحب نے مولانا سے آغاز کلام یوں کیا کہ "فرمایئے مولانا اونٹ (مراد: ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک) کس کروٹ بیٹھے گا؟" ــــ مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ "اونٹ رہا ہی کب، وہ تو گدھا بن گیا ہے۔ اب کروٹ کا کیا سوال!" ہمارے حلقے میں جب اسے بیان کیا گیا تو اس لطیفے کی تکمیل یوں کی گئی ــــ "اور گدھا بھی وہی روائتی گدھا جس پر نون لدا ہوا ہے"۔

لطیفہ گوئی

مولانا مودودی کی لطیفہ گوئی کا ایک خاص اسٹائل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بڑا مواد جمع کیا جاسکتا ہے، اور ادبی حیثیت سے اسے مرتب کر کے مولانا کے اسٹائل کی خصوصیات کی تحقیق کی جاسکتی ہے۔ اولین چیز تو یہ ہے کہ مولانا کی

لطیفہ گوئی انتہائی حاضر دماغی کا جوہر اپنے پیچھے رکھتی ہے یعنی مولانا لطیفہ کہتے ہیں تو ہمیشہ برجستہ کہتے ہیں، اور تیر بہ ہدف بنا دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ مولانا لطیفہ گوئی یا مزاح یا نکتہ آفرینی کے مریض بہر حال نہیں ہیں۔ وہ جا و بے جا فقرے گھڑتے نہیں رہتے۔ بس آسمانِ مجلس پر ان کی گفتگو کے اڑتے ہوئے لکہ ہائے ابر کے درمیان مناسب موقعوں پر مزاح کے ستارے کبھی کبھی چمک جاتے ہیں۔ رنگ ہمیشہ پیازی یا زیادہ سے زیادہ گلابی رہتا ہے۔ اتنا تیز نہیں ہوتا کہ ذوقِ سلیم کے لیے بار ہو سکے۔ مولانا کی لطیفہ گوئی اپنے دوستوں اور ملنے والوں کی دلآزاری یا توہین پر کبھی مبنی نہیں ہوتی۔

ذکر چھڑا تو جی چاہتا ہے کہ دو تین نمونے مولانا کی لطیفہ گوئی کے پیش کر دوں۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولانا نے لائل پور اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے۔ میں بھی تھا۔ ایک مقام پر کار کسی ضرورت سے رک گئی۔ چودھری صاحب ضرورت کے بلاوے پر لبیک کہہ کر لوٹے تو مولانا نے پوچھا "کیا پانی کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا "نہیں، دوسری طرح کام چلانا پڑا ہے۔" مولانا نے فوراً کہا "اچھا تو یوں کہیے کہ ڈرائی کلیننگ کی ہے۔"

مرکز کی گلی فیروزپور روڈ سے جہاں ملتی ہے پہلے وہاں نشیب تھا۔ بعد میں مٹی ڈلوا کر راستہ اونچا کیا گیا، جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دن کہیں سے گاڑی

پر آرہے تھے تو ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا، مولانا نے کہا "دیکھنا بھئی! احتیاط سے! کہیں قادیانیت قائمہ ہاویہ ہی نہ ہو جائے"
ایک لطیفہ ۔۔۔ جو ہے تو پرائیویٹ قسم کا لیکن شاہکار درجے کا ہے اسے راز نہیں رکھا جا سکتا ۔۔۔ ایک موقعہ پر مولانا کی طرف سے چائے دی گئی بسکٹ اور پیسٹری ساتھ تھی۔ مولانا نے باقر خاں صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ افسوس ہے کہ ہم باقر خانی کا انتظام نہ کر سکے! ۔۔۔ خوب قہقہہ پڑا۔

مجھے دنیا بھول نہیں سکتی

اچانک اطلاع ملی کہ چار آدمیوں کے لیے مقدمے کے سلسلے میں مولانا سے ملاقات کی اجازت آگئی ہے۔ ان چار میں میرا نام بھی ہے۔ چند منٹ تیاری میں لگے۔ مگر ہم احاطے سے باہر تھے۔ جیسے لاہور کے ایک محلے سے دوسرے محلے کی طرف جا رہے ہوں۔ وہاں پہنچے تو برآمدے میں سے مولانا نے دور سے پہلے دیکھ لیا۔ جوشِ محبت میں کچھ کلماتِ مسرت کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے مصافحہ ہوا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہاں "مشقت" ہو رہی تھی۔ جیل کا کتا ہوا سوت نقی علی صاحب دوہرا کر رہے تھے، اور ملک صاحب گولے لپیٹ رہے تھے۔ مولانا نے بتایا کہ آج بہت دنوں کے بعد ان کے سپرد یہ "مشقت" آئی تھی لیکن مقدمے کی تیاری کی وجہ سے قبول نہیں کی گئی۔

مقدمے کے سلسلے میں گفتگو رہی۔ پاس سے مولانا اختر علی خاں گزرے (اپیل کا زمانہ کاٹ کر قریب ہی میں واپس آئے تھے)، تو مولانا سے علیک سلیک کے لیے ادھر کو مڑے۔ تپاک سے ملے۔ اپنی صحت کی خرابی کا حال سنایا پھر مولانا ظفر علی خاں کی علالت کا تذکرہ آیا پھر مقدمے کے سلسلے میں فرمانے لگے کہ میں نے تو بلا خوف لومتہ لائم جو کچھ حق تھا ٹھیک ٹھیک پیش کر دیا۔ نہ جانے کس کے حوالے سے کہنے لگے کہ اس سے بات ہوئی کہ کچھ کرو۔ وہ کہنے لگا کہ مولانا! آپ اس وقت تو تقریروں میں کہتے تھے کہ ہم پھانسی پر لٹک جائیں گے، اور اب اتنے مضطرب ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ پھانسی پر لٹکا ہوتا تو ہوں۔ اب اور کیا کسر رہ گئی ہے۔

مولانا اختر علی خاں کچھ مشورۃً اور کچھ استفساراً مولانا مودودی سے فرمانے لگے کہ اس ملک کے جو حالات ہیں۔ قانون ہیں تو اندھے اور حکمران ہیں تو نا اہل، ان کے لحاظ سے کیا مخلصانہ کام کرنے والے لوگوں کے لیے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ جوں توں کر کے وہ جیل سے نکل جائیں۔ ورنہ مولانا! آپ اور آپ کے ساتھی یہاں بالکل معطل رہیں گے، جیسے عبدالغفار خاں چھ سال سے پڑے ہیں۔ جواب میں مولانا نے فرمایا کہ میرا معاملہ عبدالغفار خاں سے مختلف ہے۔ خاں صاحب کا تو کوئی ذکر چھیڑے تو ملک ان کو یاد کرتا ہے۔ مگر میری کتابیں گھر گھر میں موجود ہیں۔ میری یاد ہر وقت تازہ ہے۔ کسی کے یاد کرانے کی ضرورت نہیں مجھے یہ

لوگ نہ چھوڑیں گے تو خود ہی بدنام ہوتے رہیں گے۔ میں نے تو اوّل روز سے تہیہ کر لیا ہے کہ نہ ان سے اپیل کروں گا نہ رحم کی درخواست! چنانچہ انہوں نے موت کی سزا دی تو میں نے ان سے کوئی درخواست کرنا گوارا نہیں کیا۔ پھر انہوں نے ۱۴ سال قید بامشقت میں اسے تبدیل کر دیا تو بھی میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ چاہے ساری عمر جیل میں گزر جائے مجھے ان لوگوں سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ حالات خود ہی ان کو بتا دیں گے کہ یہ غلطی پر ہیں اور ان کو غلطی کا ازالہ کرنا ہو گا۔"

منزلِ جاناں

مولانا سے باتوں باتوں میں پھانسی کی کوٹھری کی گھڑیوں کی روداد پوچھنے کا موقع مل گیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مولانا کی شخصیت کا رنگ اس "منزلِ جاناں" میں پہنچ کر کیا تھا اور مولانا نے تسلسل سے چند باتیں بیان کر دیں:۔

"جب دیوانی احاطے میں مجھے پھانسی کا حکم سنایا گیا اور ساتھ ہی ایک ہفتہ کے اندر رحم کی اپیل کرنے کے حق سے مجھے آگاہ کیا گیا تو میرے ذہن میں علی الترتیب تین خیال فوراً آئے:۔

ایک یہ کہ ظالم سے رحم کی اپیل کرنا میرے اصول اور میری عزتِ نفس کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ میں معافی کس بات کے لیے مانگوں؟ — کیا اس بات کے

لیے کہ مجھے جنت میں کیوں بھیج رہے ہو؟ ظاہر بات ہے کہ ساری عمر دین کی خدمت کر کے بھی دوسری طرح موت مرتے ہوئے جنت جانا ویسا یقینی نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس شہادت کی موت کی صورت میں یقینی ہے۔ پھر کیا میں یہ کہوں کہ مجھے جنت سے بچاؤ؟

تیسرے یہ کہ اگر مجھ جیسے آدمی نے بھی رحم کی اپیل کر دی تو پھر اس ملک کے عام لوگوں میں غیرت و حمیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

چنانچہ میں نے رفقاء کو سخت تاکید کر دی کہ میرے لیے نہ تو میرے گھر کے لوگ رحم کی اپیل کریں، نہ جماعت کے ارکان، ورنہ جس نے ایسا کیا، اسے میں کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

پھر جب کوٹھری کے اندر لے جایا گیا تو تمام ضروریات اور سارے سامان لے لیے گئے اور کامل بے سروسامانی کے عالم میں مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میرے کپڑے مجھ سے لے لیے گئے، اور جیل کا ایک جوڑا دے دیا گیا۔ پاجامہ حسب قاعدہ بغیر ازاربند کے دیا گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید ازاربند دینا یہ لوگ بھول گئے ہیں مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ازاربند نہیں دیا جاتا (اس لیے کہ جان سے تنگ آیا ہوا مجرم خودکشی کے لیے اسے ذریعہ نہ بنا لے) مجبوراً پاجامے کو سامنے کے نیفے کے دونوں سروں سے گرہ دینی پڑی لیکن پھر بھی یہ کسی طرح ساتر نہ ہو سکا، نماز پڑھنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ قرآن شریف پہلے تو میں نے رکھنا چاہا، لیکن جب یہ

معلوم ہوا کہ اسے رکھنے کے لیے سوائے فرش زمین کے اور کوئی جگہ نہیں اس لیے واپس کر دیا۔ جتنا حصہ یاد تھا، وہی ساتھ رہ گیا۔"

"بہر حال جب سب لوگ چلے گئے تو پہلے ایک نمبردار یا وارڈر آیا اور اس نے حکومت اور وزرا کو موٹی موٹی گالیاں دیں، پھر دوسرا، پھر تیسرا، اور جو بھی آتا، اسی طرح لعنت ملامت کرتا۔"

رات کو پھانسی کی کوٹھڑیوں کی پوری قطار میں اتنا شور تھا کہ دو بجے تک نیند نہ آسکی۔ کوئی با آواز بلند ذکر کر رہا ہے، کوئی کسی بزرگ کو پکار رہا ہے، کوئی شعر پڑھ رہا ہے، اور کوئی مسلسل یہ کہے جا رہا ہے "مولا! کر دے بری! مولا کر دے بری!"

دریافت کیا گیا کہ سزا کے نفاذ کے متعلق آپ کا کیا اندازہ تھا؟

مولانا نے جواب دیا:

"میرا اندازہ یہ تھا کہ اگر پبلک کی طرف سے کافی شور نہ مچا تو پھر حکمران حضرات کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ پھانسی دے دیں گے، اور اگر ان کو یہ قدم اٹھا لینے کا موقع مل گیا تو پھر اور کسی کی خیر نہیں اور پھر دین کا کام یہاں مدتوں تک کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لیکن اگر پبلک نے پوری طرح احساس سے کام لیا اور ان کو ایک مرتبہ یہ قدم واپس لینا پڑا تو پھر یہ حضرات ان شاء اللہ پسپا ہی ہوتے چلے جائیں گے، اور پھر تحریک اسلامی کا راستہ روکا نہ جا سکے گا۔ یہ گھڑی گویا ملک کے لیے بڑے امتحان

کی کوٹھری تھی۔"

"دوسرے روز شیخ سلطان احمد صاحب اور صفدر صاحب بچوں کو ساتھ لے کر ملنے کے لیے آئے۔ انہوں نے رحم کی اپیل کے بارے میں ایک بار پھر میرا عندیہ معلوم کرنا چاہا، میں نے ان کو بھی تاکید کر دی کہ درخواست رحم ہرگز نہ کی جائے۔

"پھر میاں محمود علی قصوری ملنے آئے اور انہوں نے رحم کی اپیل پیش کرنے کے لیے اپنی خدمات کی پیش کش کی، مگر میں نے ان کو بتایا کہ یہ چیز تو کسی طرح میرے دماغ میں اتر ہی نہیں سکتی"۔

جب پوچھا گیا کہ کوٹھری میں کسی خاص طرح کی تکلیف تو نہیں، تو مولانا نے بتایا کہ:

"ایک تو وہی لباس کی نامعقولیت اور شور کی تکلیف تھی، دوسری خرابی یہ تھی کہ پھانسی کی کوٹھری کی ساخت قبیدی کے لیے ہر موسم میں تکلیف دہ ہے۔ کوٹھری کے تنگ سے دروازے کے سامنے کا دیوار بند احاطہ جو کوٹھری ہی کے سائز کا ہے۔ اس پر چھت بھی تھی، بالکل کوٹھری کے دروازے کے اوپر دو تین فٹ کا خلا تھا اور یہی روشنی پہنچانے کا ایک ذریعہ تھا لیکن اس سے گرمیوں میں دھوپ، سردیوں میں ٹھنڈی ہوا اور بارش میں بوچھاڑ بالکل اندر جاتی ہے۔ موسمی اثرات سے کوئی پناہ نہیں۔ پھر پھانسی کی کوٹھریوں میں کھانا لازماً دیسی کلاس

کا جاتا ہے" دیوبندی موبل آئل اور خمیرہ ابریشم" جس کے بیان سے ہم اپنے قلم کو پہلے مشرف کر چکے ہیں۔

تیسرے روز دو بجے کے قریب ایک آدمی دوڑا دوڑا آیا اور اس نے آ کر کہا، مولانا! مبارک ہو، آپ کی کوٹھی ٹوٹ گئی۔ کوٹھی ٹوٹنے سے مراد جیل کی شعبۂ ہیں پھانسی کی سزا کا منسوخ ہو جاتا ہے۔ پھر اس خبر کو پہنچانے اور مبارک باد کہنے والوں کا تانتا بندھ گیا، اور تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے نکال کر مجھے اور مولانا نیازی کو ہسپتال کے ایک وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔

"منزلِ جاناں" کی اس روداد کی مزید تفاصیل سننی نہ ملیں اور قصہ یہیں ختم ہو گیا!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

اپنے ہاتھ کے نقوش ہیں!

محمد اکرم ملک۔ بی اے

پامسٹری کی سائنٹفک بنیادوں پر پختہ یقین ہونے کے باوجود ایک چیز جو میرے ذہن میں کھٹکتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس علم سے متعلق صحیح اسلامی نظریہ کیا ہے اور اس کی شرعی پوزیشن کیا ہے۔ عام مذہبی نقطۂ نظر سے جو ہر ایسی چیز کو بدعت کہہ کر رد کر دیتا ہے میں مطمئن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں عرفان چغتائی لعنت اکبر نصرت جعفری کی معیت میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اقامت گاہ پر ملاقات کے لیے گیا تو جہاں میرا سب سے بڑا مقصد ان کے ہاتھ کا مطالعہ کرنا تھا، وہاں دوسرا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ مولانا سے اس کے صحیح پہلو پر راہ نمائی بھی حاصل کی جائے۔ چنانچہ گفتگو کا آغاز اسی مسئلہ سے ہوا۔

مولانا۔ اگر آپ قسمت بتانے کے لیے نہیں بلکہ سیرت و کردار کا مطالعہ کرنے کے لیے

پامسٹری کا استعمال کرتے ہیں تو اس میں کوئی امر خلافِ اسلام نہیں ہے، یہ علم بھی قیافہ کی ایک شاخ ہے۔ بزرگانِ کرام میں سے بعض علم قیافہ کے بڑے ماہر تھے، اور اس کے ذریعہ لوگوں کی سیرت و کردار کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔

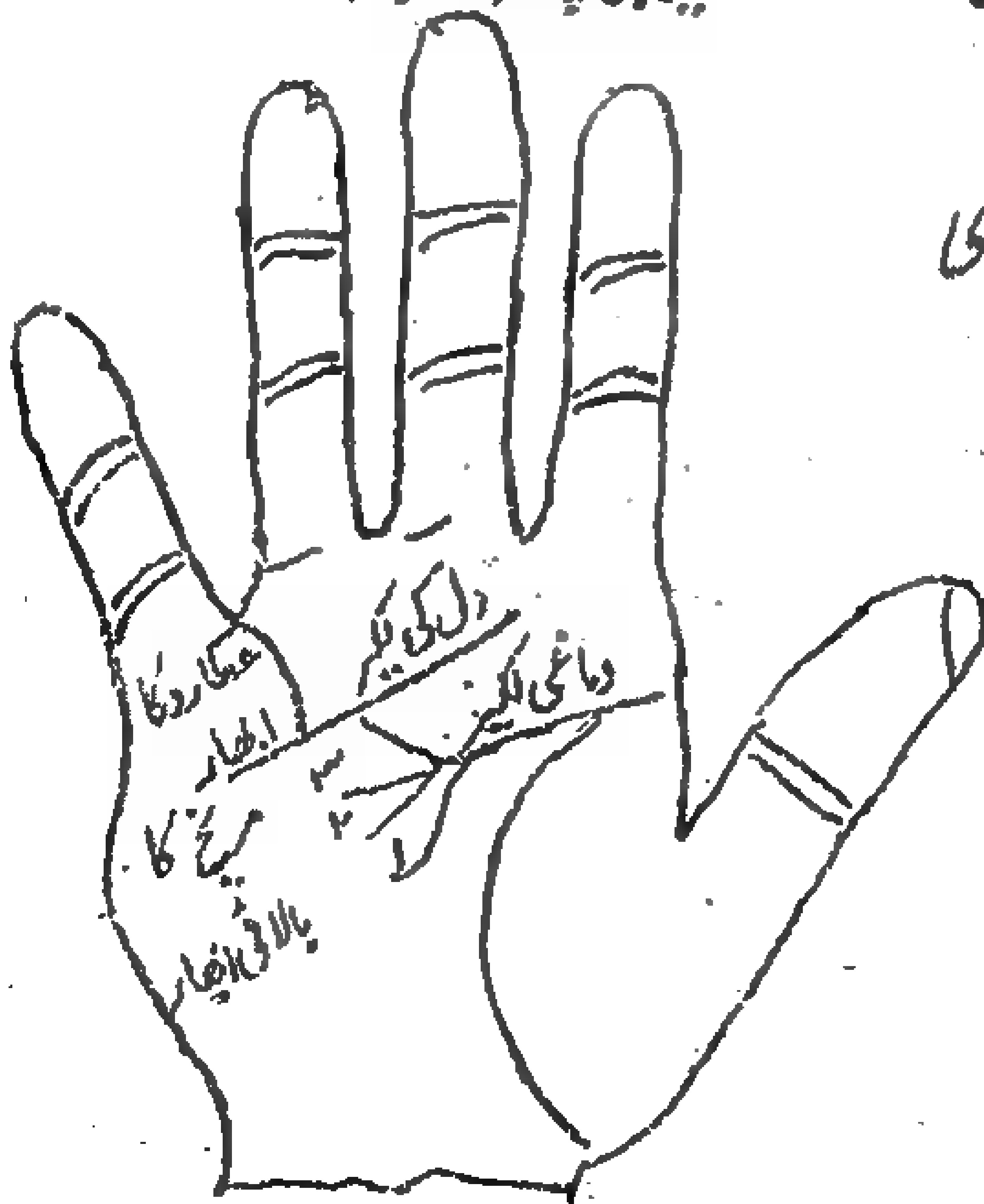
میں ۔ سیرت و کردار کا صحیح مطالعہ کرنے کے بعد اگر کسی شخص کے متعلق یہ بھی کہا جائے کہ اس سیرت و کردار، صلاحیت و استعداد کا مالک اس قسم کے واقعات و حالات سے دوچار ہوگا تو اس میں کیا حرج ہے۔

مولانا ۔ آپ اس بات کو اس طرح پیش نہ کیجیے کہ فلاں بات "ہوگی" بلکہ یوں کہیے کہ "ہو سکتی ہے"۔ ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں ہر شخص واقعات و حالات سے مستقبل کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگاتا ہے اور یہ پیشین گوئی نہیں۔ خود ہم لوگ ملکی اور سیاسی حالات سے آنے والے واقعات کا اندازہ لگاتے ہیں اسے سیاسی پیشین گوئی کہتے ہیں "یہ ہوگا" یا "ہوگی" کہنے سے کسی چیز کے متعلق حتمی طور پر فیصلہ دینا ہوتا ہے اور اس قسم کی حتمی رائے قائم کرنا ان واقعات و حالات کے متعلق جن کا انسان کو یقینی طور پر کچھ علم نہیں خلافِ اسلام ہے۔ "یہ ہو سکتا ہے" کہنے سے کسی بات کے نہ ہونے کا امکان بھی پایا جاتا ہے اور انسان غیب دانی کے گناہ سے بچا رہتا ہے۔

وقت کم تھا۔ مولانا نماز عصر کے لیے مسجد میں جانے کو تیار بیٹھے تھے، میاں طفیل محمد، مولانا کے پی اے کی نگاہیں گھڑی پر جم گئی تھیں، وقت کی نزاکت کا

احساس کرتے ہوئے عرفان چغتائی نے گفتگو کا رخ "اصل مقصد" کی طرف پھیر دیا اور کہا کہ "ملک صاحب نے ہفت روزہ "چٹان" میں "مشاہیر" کے ہاتھوں کے مطالعات کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس وقت تک قائداعظم کے ہاتھ کا مطالعہ پیش کر چکے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ آپ کے ہاتھ کا بھی مطالعہ کیا جائے"

مولانا نے کہا کہ وہ "مشاہیر" میں سے نہیں تاہم ہاتھ دکھانے میں انہیں کوئی عذر نہیں۔ اس پر عرفان چغتائی نے برجستہ جواب دیا کہ "یہ فیصلہ کرنا وقت کا کام ہے کہ آپ "مشاہیر" میں سے ہیں یا نہیں، آپ خود واقعی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے" مولانا نے نہایت بے تکلفی سے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے انکشاف کیا کہ پامسٹری سے شغف انہیں بھی کچھ عرصہ رہا ہے



سید ابوالاعلیٰ مودودی
کے
ہاتھ کا
ایک اسکیچ

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے ہاتھ کا مطالعہ کرنے سے پیشتر پامسٹری کی ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے آدمی جنہیں قدرت نے کوئی خاص وصف عطا کر رکھا ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھوں پر عام انسانوں کی نسبت کوئی نہ کوئی امتیازی یا غیر معمولی نشان ضرور رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر قائد اعظم کے ہاتھ میں امتیازی نشان ان کا انگوٹھا ہے۔ مہاتما گاندھی کے ہاتھ پر ان کی دو شاخہ (DOUBLE) (FORNED) دماغی لکیر ہے، ہٹلر کے ہاتھ پر دل و دماغ کی دو علیحدہ علیحدہ لکیروں کی بجائے صرف ایک ہی لکیر کا نشان ہے، سٹالن کے ہاں دل کی لکیر تقریباً مفقود ہے، رابندر ناتھ ٹیگور کی وجدانی لکیر (LINE OF INTUITION) نہایت اہم نشان ہے۔ اسی طرح دنیا کے تمام اکابر اور مشاہیر کے ہاتھوں پر کوئی نہ کوئی امتیازی علامت ضرور پائی جاتی ہے۔ مودودی صاحب کے ہاتھ پر ان کا امتیازی نشان اُن کی سہ شاخہ (TRIPLE FOR KED) دماغی لکیر ہے۔

پامسٹری میں اس طرح کی دماغی لکیر کا پایا جانا ایک اعجوبہ (PHENOMENA) سے کم نہیں۔ تقریباً ہر شخص کے ہاتھ پر واحد دماغی لکیر ہوتی ہے جو آغاز تا اختتام ایک ہی چلی جاتی ہے اور اس بات کی مظہر ہوتی ہے کہ ایک شخص قدرت کی جانب سے صرف ایک ہی کام، ایک ہی صلاحیت اور ایک ہی قوت لے کر پیدا ہوا ہے۔ وہ ادیب ہے، یا سائنس دان ہے یا کاروباری اور عملی انسان ہے۔ وہ بیک وقت

ان تین شخصیتوں کا مالک نہیں۔ وہ مجبور ہے، قدرت نے اسے صرف ایک ہی صلاحیت سے نوازا ہے، سائنس دان کے لیے شاعر بننا آسان نہیں اور نہ شاعر کے لیے کاروباری بننا آسان ہے، اگر وہ کوشش بھی کرے تو تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ مگر مولانا کے ہاتھ پر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں تینوں صلاحیتوں کا جو بظاہر مختلف اور متضاد نظر آتی ہیں نہایت عمدہ اور حیرت انگیز امتزاج ہے۔ یہ تین صلاحیتیں دماغی لکیر کی تدریج تین مختلف شاخوں سے ظہور پذیر ہیں۔

(۱) شاخ نمبر ۱ علمی اور ادبی صلاحیتوں کی مظہر ہے اور عموماً ان ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے ہاتھوں میں پائی جاتی ہے، جن میں تخیل کی فراوانی ہوتی ہے۔

(۲) شاخ نمبر ۲ سائنٹفک اور حقائق پسند رجحانات کی عکاس ہے اور عموماً سائنسدانوں، منطقیوں، ڈاکٹروں، حساب دانوں، ناقدوں اور قوانین فطرت کا مطالعہ کرنے والوں کے ہاتھوں میں پائی جاتی ہے۔

(۳) شاخ نمبر ۳۔ کاروباری، عملی اور دنیاوی معاملات کی سمجھ بوجھ کی آئینہ دار ہے اور عموماً بڑے بڑے دستکاروں، کارخانہ داروں، صناعوں، انجینئروں اور عمدہ کاروباری صلاحیت رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں پائی جاتی ہے۔

بینہم، فن پامسٹری کا امام اپنی کتاب "مطالعۂ الید کے سائنٹفک قوانین" میں لکھتا ہے:

• یہ ایک عظیم الشان نشان ہے۔ ان لوگوں کے ذہن میں بے پناہ وسعت، ہمہ گیری، تو قلمونی اور موزونیت پائی جاتی ہے، اور بیک وقت مختلف اور بہت سی صفات اور صلاحیتوں کا نفیس اور متناسب امتزاج ہوتا ہے۔ یہ امتزاج عموماً کامیاب کیریر (CAREER) کی تخلیق کرتا ہے بشرطیکہ یہ کم حوصلہ اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بے سود ضائع کرنے والے نہ ہوں، تو سہ شاخہ دماغی لکیر والے اپنی زندگی میں بہت سے عزائم کی تکمیل کر لیتے ہیں"

سہ شاخہ دماغی لکیر کی ایک اہم صفت یہ بھی ہے کہ اس کا حامل مسائل زندگی کے متعلق کبھی یک طرفہ (ONE-SIDED) انتہا پسند، محدود اور متعصبانہ زاویہ نگاہ نہیں رکھتا اور عموماً تحقیق اور اظہار رائے کرتے وقت معاملہ کے تمام پہلوؤں پر برابر نگاہ رکھتا ہے، حتیٰ کہ مخالف نقطہ نظر کو بھی بلا کم و کاست اور بلا تغیر و تبدل پیش کر دیتا ہے اور اگر اس کی تردید میں کچھ کہنا بھی ہے تو جذبات کی بجائے استدلال کی زبان میں بات کرتا ہے۔ میرے نزدیک سہ شاخہ لکیر مولانا کے ایک ایسے محقق ہونے کی بھی دلیل ہے جو بیک وقت معاملہ کے روحانی، عقلی اور عملی پہلوؤں پر نگاہ رکھتے ہوئے اعتدال اور توسط کی راہ اختیار کرتا ہے۔ مشاہیر عالم میں سے جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں صرف مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں اس قسم کی دماغی لکیر ہے مگر وہاں بھی سہ شاخہ نہیں فقط دو شاخہ ہے اور یہ مہاتما گاندھی کے بیک وقت مفکر اور عملی انسان ہونے کی علامت ہے۔ معلوم نہیں

مولانا میں کونسی بات گاندھی سے زائد یا مختلف ہے ؟

ہاتھ دیکھنے سے پہلے مودودی صاحب کے متعلق میرا یہ قیاس نہایت قوی تھا کہ وہ مولانا ابو الکلام آزاد کی طرح ایک بلند پایہ انشا پرداز اور ادیب ہیں۔ ان کی سائنٹفک اور عملی صلاحیتوں کے متعلق میری معلومات محدود تھیں اور اب تک ہیں بلکہ ہاتھ کے ذریعہ جو تعارف مجھے ان کی شخصیت سے ہوا ہے اور جو تغیر میرے قیاسات میں بعد ازاں واقع ہوا ہے اسے میں فقط لفظ حیرت سے تعبیر کر سکتا ہوں۔

مولانا کے دائیں اور بائیں ہاتھ کی دماغی لکیروں کا موازنہ کرتے ہوئے ایک اور بات جو مجھ پر واضح ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جن تین شاخوں کا ذکر میں نے کیا ہے وہ دائیں ہاتھ کی دماغی لکیر میں تو ہیں مگر بائیں ہاتھ میں نہیں، وہاں صرف ایک شاخ دماغی لکیر ہے جس کا جھکاؤ قمر کے ابھار کی طرف ہے اور وہ فقط ادبی اور تخیلاتی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی ادبی صلاحیت تو وراثتی ماحول (HEREDITARY ENVIRONMENT) کی پیداوار ہے اور ان کی باقی دو صلاحیتیں زیادہ تر اکتسابی (AQUIRED) ہیں، یہ کہاں تک درست ہے، اسے مودودی صاحب خود جانتے ہوں گے۔

دماغی لکیر کا آغاز ہاتھ پر دو طرح ہوتا ہے۔

(۱) عمر کی لکیر (جو انگوٹھے کے ارد گرد چکر لگاتی ہے) اس سے مل کر۔

(۲) عمر کی لکیر سے ہٹ کر بالکل مستقل بالذات (INDEPENDENT)

یہ آغاز پامسٹری میں خاص مفہوم کا حامل ہے، یہ معلوم کرنے کے لیے ایک شخص اپنی صلاحیتوں کو زندگی کے کس شعبہ میں استعمال کرتا ہے، ہمیں دماغی لکیر کے آغاز کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

پہلی صورت یعنی دماغی لکیر کا عمر کی لکیر سے ملا ہوا (JOINNED) ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ شخص متعلقہ ماضی کی قدروں کا قدردان، اسلاف کی عظمت کا قائل اور رعایات مذہبی کا علمبردار ہے اور اس کی تحقیقات اور الفاظ (INSPIRATION) کا منبع بزرگوں کی میراث، اخلاق کی پاکیزہ تعلیمات اور مذہب کی عالمگیر سچائیاں ہیں۔

دوسری صورت یعنی دماغی لکیر کا عمر کی لکیر سے مستقل بالذات ہونا اس حقیقت کا مظہر ہے کہ شخص متعلقہ آزاد منش، بے قید طبع اور خود رائے ہے۔ نقادیں مشرق کا اتنا خواں نہیں، لامرکز اور غیر مقلد ہے، جدید نظریات اور فلسفہ ہائے حیات کے اثرات جلد قبول کرتا ہے، اخلاقی بندشوں سے آزاد ہے، ماضی کی ہر بات سے متنفر ہے یعنی دوسرے لفظوں میں "ترقی پسند" ہے! مودودی صاحب کی دماغی لکیر کا آغاز پہلی صورت سے ہوتا ہے اور یقیناً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کا سرچشمہ الفاظ (SOURCE OF INSPIRATION) مذہب اور اخلاق ہی کے پاکیزہ افکار و نظریات ہیں۔ زمانہ حال کے اور مشاہیر کے ہاں دماغی لکیر کا آغاز بہت کم اس صورت سے پایا جاتا ہے۔

دماغی لکیر کے بعد ایک امتیازی نشان جو شاید کسی اور کے ہاتھ پر تو نہیں مگر مودودی صاحب کے ہاتھ پر دیکھ کر ایک پامسٹ کو یقیناً حیرت ہوتی ہے، مریخ کے بالائی ابھار (THE UPPE MOUNT OF MORS) کا بلند اور نمایاں ہونا، یہ جرأت اور شجاعت، تہور اور مردانگی، جارحیت (AGRESSION) اور مدافعت (RESISTANCE) کا اظہار ہے اور عموماً بڑے بڑے جنگی جرنیلوں، سپہ سالاروں، کمانڈروں اور فنون حربیہ کے ماہروں کے ہاتھ پر پایا جاتا ہے، جن کی فتوحات سے تاریخ کے اوراق مزین ہیں۔ یہ نشان مولانا کے ہاتھ پر کیوں پایا جاتا ہے، اس کی حقیقت امام فن بینہم کی زبان سے سنیے:۔

"یہ نتیجہ اخذ کرنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ مریخی ابھار والا ہمیشہ تلوار اور پستول کی جنگ لڑتا ہے یا وہ "گھونسہ بازی" سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ اکثر ذہنی اور مادی "دنیا" میں مخالف حالات و عناصر سے بھی جنگ کرتا ہوا آزمایا گیا ہے، تمام مریخی سپاہی نہیں ہوتے۔ اگرچہ تمام سچے مریخی مقدس نصب العین اور وطن کی خاطر جنگ لڑنے کے لیے مستعد پائے جائیں گے، لیکن جس چیز سے بھی وہ متعلق ہوں گے اس کو جرأت سے آگے بڑھائیں گے اور جو لوگ بھی ان کے راستے میں مزاحم ہوں گے ان کی مدافعت دوسری قسم کے لوگوں کی نسبت زیادہ شدت سے کریں گے۔ بہر حال زندگی کے جس شعبہ میں بھی ہوں وہ ٹھہریں گے ضرور، جارحیت ان کی صفت ہے۔" (مطالعۃ الید کے سائنٹفک قوانین صفحہ ۲۷۲)

تقریباً ہر شخص کے ہاتھ پر اس ابھار کا پایا جانا ضروری ہے اور ہر بڑے آدمی کے ہاتھ پر تو اس کا وجود لازماً ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کشمکش حیات میں غلبہ مشکل ہے۔ جن لوگوں کے ہاں یہ بالکل مفقود ہوتا ہے وہ مشکلات و مصائب کی تاب مقاومت نہ رکھتے ہوئے فوراً دب جاتے ہیں اور خواہ وہ کتنے ہی ذہین اور صاحب علم کیوں نہ ہوں دنیا میں اپنا نام روشن نہیں کر سکتے۔

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:

"اس ابھار کا حامل تمام حالات کا نہایت دلجمعی، استقلال اور ٹھنڈے دل و دماغ سے مقابلہ کرتا ہے اور رفتار زمانہ کو اپنے خلاف جاتا دیکھ کر کبھی مایوس اور دل شکستہ نہیں ہوتا۔ خواہ امکانات بہت کم ہوں وہ ہتھیار نہیں ڈالتا اور گر پڑنے کی صورت میں پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور تقریباً شکست سے نا آشنا ہوتا ہے ہنگامی صورت حالات سے عہدہ برآ ہونے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے، شکست سے نا آشنا ہونے کا یہ جذبہ مدافعت، یہ عدیم النظیر قوت، ہنگامی حالات کا سامنا کرنے کی یہ صفت مریخی فطرت کو بالآخر تمام مشکلات پر غالب کر دیتی ہے"۔

مریخی ابھار جو مودودی صاحب کے ہاتھ پر دوسرے تمام ابھاروں کی نسبت نمایاں طور پر بلند ہے، اس کی تشریح کرنے کے بعد غالباً مجھے یہ حاجت نہیں کہ میں "جنگ" کی اس "قسم" اور "گولہ بارود" کی اس "نوعیت" کی بھی تشریح کروں جس سے مودودی صاحب لڑ رہے ہیں۔ میرے لیے تو لطف کی بات یہ ہے کہ ہاتھ کس

صحت کے ساتھ شخصیت کا ترجمان ہے اور اس کی ساخت کی بنیادیں کتنی پختہ ہیں

اس سے آگے بڑھ کر جس ابھار سے پامسٹ کی نگاہیں مودودی صاحب کے ہاتھ کا مطالعہ کرتے وقت ٹک جاتی ہیں وہ عطارد کا ابھار (MOUNT OF MERCURY) ہے۔ یہ ابھار عموماً ایسے لوگوں کے ہاتھوں پر پایا جاتا ہے جو فطرت انسانی کے نباض، عوامی نفسیات سے گہرے واقف، دلائل و براہین میں یکتائے روزگار، اظہار بیان پر پوری طرح قادر، فصیح و بلیغ خطیب، سحر بیان ادیب، شیریں گفتار، برجستہ کلام، متکلم، علمی مباحث میں حصہ لینے والے ہوتے ہیں، شعلہ کی مانند اپنی تیز قوت وجدان و بصیرت، فہم و فراست کی برق رفتاری اور طبعی امنگ کی وجہ سے یہ لوگ نت نئی اسکیمیں ایجاد کرتے ہیں۔ یہ ابھار فن خطابت کے ماہرین یعنی (ORATORS) اور بہت سی کتابوں کے مصنفوں (AUTHORS) اور اس کے علاوہ دیگر اور کسی فن کے موجدوں کے ہاتھوں پر نمایاں ہوتا ہے۔

ان تین نمایاں علامات یعنی سر شاخہ دماغی لکیر، مریخ اور عطارد کے ابھاروں کے علاوہ جو اور علامات ہمیں مودودی صاحب کے مطالعہ سیرت میں مفید ملتی ہیں وہ بااختصار حسب ذیل ہیں۔

نمبر ۱۔ مضبوط اور بے لچک انگوٹھا جو اصول پرستی، ضابطہ پسندی، قوت ارادی اور قوت متخیلہ کو ظاہر کرتا ہے۔

نمبر ۲۔ صاف، سیدھی اور واضح سی دل کی لکیر جو اپنے مخرج سے سیدھی مشتری کے ابھار پر آکر ختم ہوتی ہے جو کسی عامی میں پائی جاتے تو اکھڑپن اور کھردراپن کی علامت ہے اور کسی بڑی شخصیت میں پائی جائے تو حق گوئی اور بے باکی کی علامت ہے۔

نمبر ۳۔ انگلیوں کی بالائی پوریں نچلی پوروں کی نسبت لمبی ہیں جو فہم و بصیرت اور تدبر کی علامت ہے۔

نمبر ۴۔ دماغی لکیر پہ اٹھنے والی باریک لکیریں (UPRISING LINES) جو تخلیقی اور تنقیدی قوتوں کے ساتھ ندرتِ فکر و عمل کا نشان ہیں۔

نمبر ۵۔ مشتری کا ابھار (MOUNT OF JUPITERS) دوسرے ابھاروں کی نسبت کم نمایاں جو حکومت و اقتدار کے جذبہ کی کمی ظاہر کرتا ہے۔

مذکورہ بالا استعداد اور صلاحیتوں کے حامل "مستقبل" میں عموماً جن سیرت و کردار کا اظہار کرتے ہیں" اور عموماً جن حالات و واقعات سے دوچار ہو سکتے ہیں" "کریں گے" یا "ہوں گے" کے الفاظ استعمال نہیں کر رہا) ان کے متعلق میرے نتائج حسب ذیل ہیں۔

ا۔ متعدد شعبہ ہائے حیات میں نظریاتی انقلاب بپا کرتے ہیں۔

ب۔ انسانوں کے ایک گروہ کثیر پر اپنے فکری اور ذہنی نقوش اور تاثرات چھوڑ جاتے ہیں۔

(ت) تمام عمر تنگی اور ہنگامی سی صورت حالات کا سامنا رہتا ہے۔

(ٹ) انتہا پسند عناصر و تحریکات سے جنگ آزما رہتے ہیں۔

(ث)۔ اقتدار سے خطرہ رہتا ہے۔

(ج) اقتدار حاصل نہیں کرتے۔

(د) تصادم کے مواقعات اکثر پیدا ہوتے ہیں۔

(ذ)۔ عوامی رجحانات کے قریب ہوتے جاتے ہیں اور مقبولیت پاتے ہیں۔

(ر) تمام عمر ایک ہی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں اور اصول اور ضابطہ کے پابند رہتے ہیں۔

(ز) مصلحت پسند مصالحت نہیں کرتے۔ واللہ اعلم بالصواب

چند تصریحات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ہاتھ دیکھنے کا مجھے دو بار اتفاق ہوا۔ ایک بار جولائی ۱۹۵۱ء میں ——— دوسری دفعہ یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو یعنی تحریک ختم نبوت میں ان کے گرفتار ہونے سے تقریباً تین ہفتے پہلے ——— اوّل بار مجھے دس منٹ ہی مل سکے، پہلی بار مولانا کو ہاتھ دکھانے کے لیے آمادہ کر لینا ہی میرے نزدیک اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ ان کے ہاتھ کا پرنٹ حاصل کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس مطالعہ میں جو کچھ دیکھا جا سکا اس کی روشنی میں گذشتہ صفحات میں کچھ کہہ دیا گیا تھا۔ تاہم سچی بات یہ ہے کہ جس طرح کا مکمل مطالعہ در حقیقت میں کرنے کا متمنی تھا وہ نہ

کیا جا سکا۔ تحقیقی مطالعے کے لیے بہ فراغت کافی وقت درکار ہے۔ لہٰذا پہلی بار کی ملاقات کے بعد میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مولانا کے نیا نقش پھر حاصل کیے جائیں اور ان سے نقش دینے کی پھر درخواست کی جائے۔

فروری ۱۹۵۳ء کے آخری ہفتہ میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو محترمی وقار حسین صاحب نیوز ایڈیٹر پاکستان ٹائمز سے اس خواہش کا اظہار کیا اور ان سے حالات کا عمدہ جائزہ تصور کیجیے یا پامسٹری کا کمال کہ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ ہمیں اس سلسلہ میں جلدی کرنی چاہیے کہیں مولانا بھی گرفتار نہ کر لیے جائیں۔

وقار صاحب جو اپنی برادرانہ شفقت کی بنا پر میری پامسٹری کی سرگرمیوں کا ہمیشہ ہمدردانہ جائزہ لیا کرتے ہیں۔ ساتھ چلنے پر فوراً آمادہ ہو گئے اور اس طرح ہاتھ دیکھنے کے سلسلے میں دوسری بار مجھ کو مودودی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

تقریباً دس گیارہ بجے دوپہر کا وقت ہو گا کہ میں، وقار صاحب، مسٹر ایم اے چوہدری اور مسٹر کرم الٰہی خاں، مودودی صاحب کے مکان واقع اچھرہ روڈ پر حاضر ہوئے۔ اطلاع کروائی۔ باریابی ہوئی۔ تعارف کی کوئی اتنی لمبی چوڑی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ کیونکہ مولانا ایسی صلاحیت کے لوگوں کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہوتا کہ ان سے باربار اپنے تعارف کی ضرورت محسوس ہو اور ویسے مجھے ان سے ہاتھ کی ریڈنگ کی اشاعت کے بعد بھی ایک بار ملنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ آپ غالباً اپریل ۱۹۵۲ء میں کیمبل پور جماعت اسلامی کے کارکنوں کے اجتماع کو خطاب کرنے کی غرض سے تشریف لائے

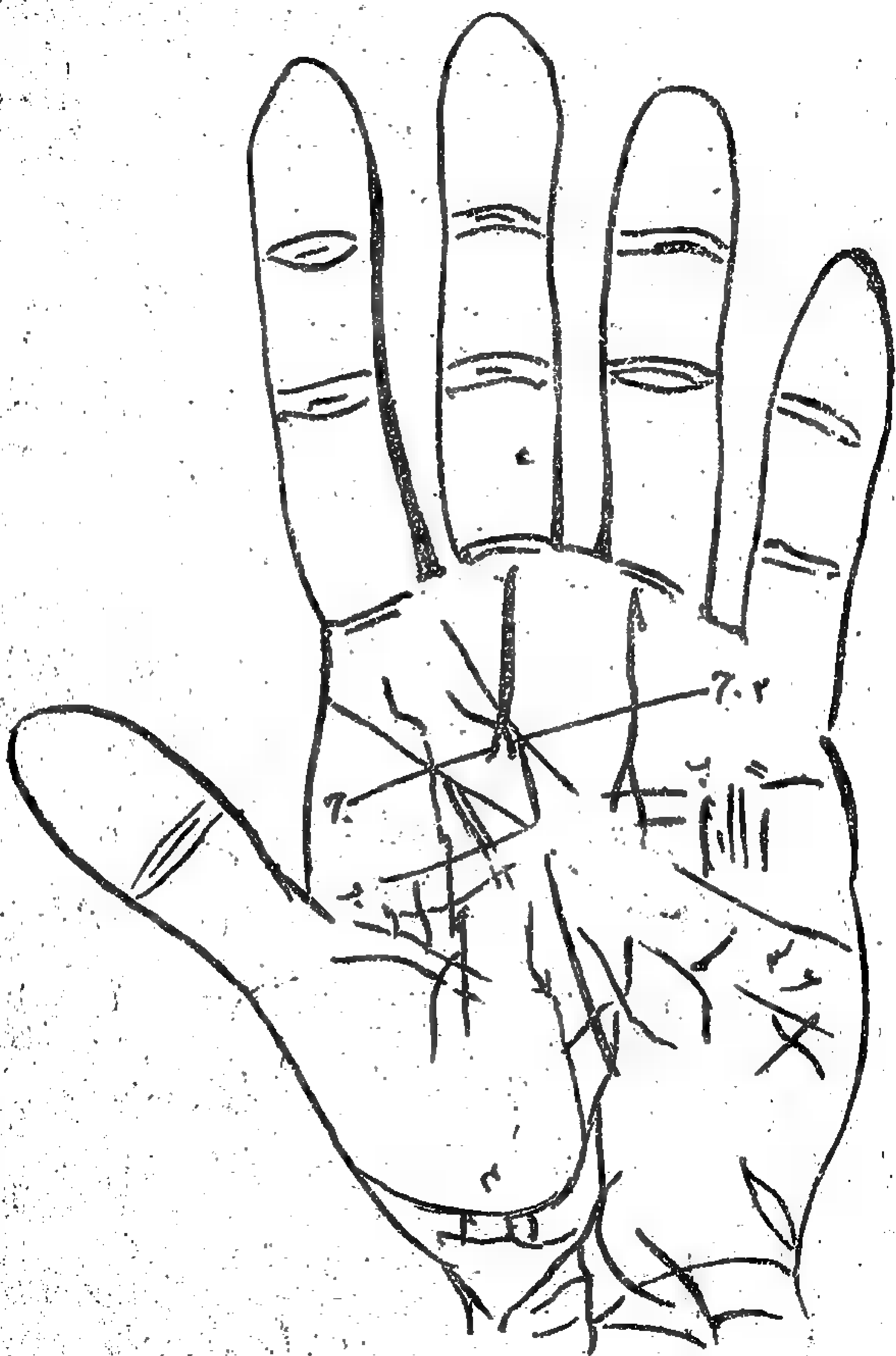
تھے کہ میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ وہ وہیں سے مجھے پہچان لیا اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی سے مخاطب ہو کر فرمایا "مولانا! یہ ہیں کیرو آف پاکستان، جنہوں نے میرے ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں لکھا تھا۔"

آپ کا قیام کیمبل پور میں نہایت مختصر تھا۔ شائقین ملاقات کی موجودگی میں مجھے اتنی مہلت نہ ملی کہ اس موقعہ پر پرنٹ کے لیے درخواست کر سکتا۔ بہرحال وہ ملاقات بڑے پرسکون ماحول میں ہوئی۔

بات چھیڑتے ہوئے وقار صاحب نے عرض کیا کہ "مولانا یہ ہیں ملک صاحب" اور پھر وقفہ کے بعد کہا "جب یہ تعارف کروا دیا جاتے تو غالباً یہ بتلانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔ یہ اپنے شعبے کی یکتا جانی پہچانی شخصیت ہیں۔"

مولانا میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ جب سے آپ کے ہاتھ کے بارے میں لکھا ہے، بہت سے احباب کا اصرار رہا ہے کہ آپ کے ہاتھ کا پرنٹ بھی شائع کیا جاتے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ہاتھ کا پرنٹ لے لیا جاتے۔ میں نے عظیم انسانوں کے ہاتھوں کے پرنٹس جمع کرنے کی ایک مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس میں آپ کے ہاتھ کا پرنٹ ایک قابل قدر اضافہ ہو گا اور اس سے پامسٹری کے طالب علم بہت کچھ سیکھیں گے بھی۔

مولانا مودودی صاحب نے پہلے تو کچھ تامل کیا۔ لیکن پھر غالباً یہ سوچ کر کہ اس سے ایک طالب فن کی حوصلہ شکنی ہو گی، خاموش سے ہو گئے۔ وقار صاحب جنہیں مودودی صاحب



کی مزاج شناسی میں کافی ملکہ حاصل ہے تاہے نیم رضا سمجھے اور مجھے اشارہ کیا کہ پرنٹ لے لیجیے۔

پرنٹ لینا بھی اچھا خاصا ایک ناخوشگوار سا عمل ہے۔ اچھے اچھوں کے پاکیزہ اور مصفا ہاتھوں پر سیاہی آلودہ رولر دوڑانے پڑتے ہیں۔ مودودی صاحب کے گرد و پیش میں جس نفاست و پاکیزگی کا دور دورہ تھا۔ اس کے مدنظر اس قسم کی زیادتی ایک ارتکاب گناہ سے یقیناً کم محسوس نہیں ہوتی تھی، مگر انہوں نے بہ کمال تحمل و بردباری اسے گوارا کیا۔

پامسٹری پر بات چیت کے دوران میں، میں نے مودودی صاحب کو بتایا کہ ہر شعبہ کے ممتاز نمائندوں کے ہاتھوں کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا تو میں بڑے شد و مد سے قائل ہو چکا ہوں کہ ہاتھ کی لکیریں ایک فرد کے پیدائشی رجحانات کی عکاس ہیں لیکن یہ بات بھی سراسر غلط نہیں ہے کہ ان سے ماضی، حال اور مستقبل کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ پامسٹری کے ساتھ اپنے طویل ربط کے دوران میں مجھے وقتاً فوقتاً ایسے مشاہدات بھی ہوتے رہتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کی یہ لکیریں اور علامات انسان کے ماضی، حال، مستقبل کے ایسے واقعات و حادثات کی بھی آئینہ دار ہیں جن کا انسانی کردار سے کوئی تعلق نہیں اور یہ بات مجھے حیرت میں ڈال دیتی ہے اور اکثر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ پامسٹری کا قسمت شناسی سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔

مودودی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے کچھ اس قسم کی گنجائش ان لکیروں وغیرہ میں رکھ دی ہو، لیکن اس بارے میں کافی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مزید فرمایا کہ جس حد تک ہاتھ کی ساخت اور اس پر منقش علامات سے خداداد صلاحیتوں کے ادراک کا تعلق ہے یہ بات ذہن کو کافی اپیل کرتی ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا کہ میرے ہاتھ کے بارے میں لکھتے ہوئے آپ نے جن تین (ادبی، فکری تنظیمی) صلاحیتوں کی وضاحت کی ہے، میں بھی جب اپنے طور پر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تینوں صلاحیتیں مجھ میں موجود ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے مودودی صاحب کو بتایا کہ قومی افادیت کے نقطۂ نگاہ سے پامسٹری بہت مفید خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔ اس کی مدد سے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والی نئی پود کی افتادِ طبع کا اندازہ لگا کر یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ فطرت نے اسے کس پیشے یا شعبۂ حیات میں ترقی کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ علاوہ ازیں پامسٹری پولیس کے شعبۂ تحقیق و تفتیش جرائم میں گراں قدر خدمات بجا لا سکتی ہے۔ اس کی مدد سے مجرموں کی شناخت، ان کے ذہنی تجزیے اور ان کے مواخذہ وغیرہ کے سلسلہ میں نہایت قیمتی انکشافات ہو سکتے ہیں اور اسی سلسلہ میں میں نے انہیں بتایا کہ انگلینڈ کی مشہور پولیس درسگاہ اسکاٹ لینڈ یارڈ میں محکمۂ سراغرسانی کے ماہرین کو جہاں نفسیات اور دیگر علوم کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں پامسٹری کو بھی ایک لازمی علم کی حیثیت سے سکھایا جاتا ہے۔

مولانا کے اس سوال کے جواب میں کہ میں نے آج تک کن کن اہم شخصیتوں کے ہاتھوں کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ میں نے آج تک سیاسی لیڈروں میں سے قائداعظم، مس فاطمہ جناح، حسین شہید سہروردی، نواب ممدوٹ، چوہدری غلام عباس، اللہ رکھا ساغر۔ نوابزادہ نصراللہ خاں اور ادیبوں اور صحافیوں میں سے حمید نظامی، شورش کاشمیری، م۔ش، مولانا ظفر علی خاں، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، احمد ندیم قاسمی، منٹو وغیرہ کے ہاتھ دیکھے ہیں۔

اس موقع پر مولانا نے خاص طور پر قائداعظم، سہروردی صاحب اور مولانا ظفر علی خاں صاحب کے بارے میں دریافت فرمایا کہ ان کے ہاتھوں پر کیسی علامات تھیں؟ اور میرے دلچسپ جوابات پر بڑے محظوظ ہوتے رہے اور پھر دفعتہً پوچھا کیا آپ نے علامہ مشرقی صاحب کا بھی ہاتھ دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میری بےحد خواہش کے باوجود ابھی ان تک رسائی نہیں ہو سکی جب کبھی لاہور آنے کا اتفاق ہوا وہ یا تو بیمار تھے یا لاہور سے باہر ——— البتہ جب کبھی موقعہ ملا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کروں گا۔

پھر کچھ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد مولانا نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں فرمایا کہ انسانی نفسیات کردار کا مطالعہ ایک بڑا دلچسپ مطالعہ ہے مجھے بھی اس کا ذوق ہے۔ آپ تو اس کا مطالعہ لوگوں کے ہاتھوں کی لکیروں سے کرتے ہیں۔ مگر میں ان کے ہاتھوں کی تحریروں سے کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک شخص کی تحریر

(طرزِ بیان اور مفہوم دونوں کے لحاظ سے) نہ صرف اس کی ذہنی صلاحیت بلکہ اخلاقی حیثیت کو بھی ظاہر کر دیتی ہے۔ اور اس کے کردار، افعال و عادات و خصائل کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔ میں نے اکثر سیاسی لیڈروں اور ادیبوں کو شخصی ملاقات کے بغیر فقط ان کی تحریروں سے (خواہ وہ خطوط یا ایک پیراگراف ہی کی حد تک کیوں نہ ہو) نہایت صحت کے ساتھ سمجھا ہے اور میرا اندازہ بفضلِ خدا کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔ مودودی صاحب غالباً انہی دنوں ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کی تازہ تصنیف "ایک اسلام" کا مطالعہ فرما رہے تھے اس لیے بات قدرتی طور پر برق صاحب تک جا پہنچی۔

برق صاحب کے ذکرِ خیر کے بعد ملک کے صحافیوں کا تذکرہ چھڑ گیا تو مولانا نے فرمایا "کبھی اس ملک کے صحافیوں کا بھی جائزہ لیجیے گا۔"

میں نے عرض کیا، مجھے صرف پانچ سات صحافیوں کے ہاتھ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان میں سے دو تین صحافیوں کے ہاتھ فی الواقع صحافی عظمت کے آئینہ دار ہیں لیکن ایک صحافی کا ہاتھ زیادہ تر قمار بازوں کے ہاتھ سے ملتا جلتا ہے اور جب میں نے مولانا کو ان کا نام بتایا تو وہ مسکرائے اور فرمایا، ہاں اس سے بڑھ کر قمار بازی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص ہر موقعہ پر قوم کے اعلیٰ مفاد کو داؤں پر لگاتا آیا ہو۔ اختتام گفتگو کے طور پر مولانا نے مجھے مشورہ دیا کہ پاکستان کی اہم شخصیتوں کے مطالعہ کا سلسلہ جو میں نے شروع کر رکھا ہے اُسے جاری رہنا چاہیے۔ اس سے فی الواقع ان کے

سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس تمام گفتگو کے دوران میں خاصی ذہنی لذت کے باوجود مجھے شدید طور پر اس بات کا احساس ہوتا رہا کہ ہم مودودی صاحب کا قیمتی وقت نہایت بے دریغی سے صرف کر رہے ہیں۔

لاہور کے پندرہ روزہ قیام کے دوران میں مودودی صاحب کے پرنٹس کا مطالعہ نہ کیا جا سکا۔ ادھر ڈسٹرکٹ ایکشن سے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ واپسی پر اطمینان کے ساتھ ایک روز جب پرنٹس پر نظر دوڑائی تو میں نے محسوس کیا کہ میری ریڈنگ نامکمل تھی۔ بہت سی ایسی علامات نظر پڑیں جنہیں پہلی مختصر سی ملاقات میں نوٹ نہ کر سکا تھا۔ مودودی صاحب کے ہاتھ کے بارے میں لکھتے ہوئے اتنا تو بتایا جا سکا کہ ان کی زندگی میں اقتدار سے کسی خطرناک تصادم کے امکانات ہیں لیکن وقت کا تعین نہ کیا جا سکا۔ اب جو مودودی صاحب کی تاریخ پیدائش کو سامنے رکھ کر حساب لگایا تو عین پچاس برس کے لگ بھگ ایک "خط مخالف" کو قسمت کی لکیر کو منقطع کرتے ہوئے پایا۔ اس سے جو میں نے نتیجہ نکالا وہ زیادہ سے زیادہ یہی تھا کہ مودودی صاحب کو ان دنوں پھر کسی خطرے کا سامنا ہے۔

چنانچہ مارشل لا کے ایام میں جب مودودی صاحب ابھی گرفتار نہیں ہوئے تھے تو کئی بار خیال آیا کہ انہیں خط لکھ کر اس بارے میں مطلع کیا جائے، لیکن پھر اس خوف سے کہ سنسر شپ کے اس دور میں پاسٹ صاحب خواہ مخواہ ہی کہیں دھر نہ لیے جائیں، احتیاط برتی۔ اس تمام عرصہ میں میرے کان مودودی صاحب کے بارے میں کسی بری خبر پر

برا میڈ لگے رہے۔ آخر جب ایک روز ریڈیو پر یہ خبر سنی کہ مودودی صاحب گرفتار کر لیے گئے ہیں تو میرے لیے یہ خبر قطعاً غیر متوقع نہ تھی۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد جب مودودی صاحب کی سزائے موت کی خبر میں نے اخبارات میں پڑھی تو یہ میرے لیے بھی اتنی ہی غیر متوقع تھی جتنی کہ دوسروں کے لیے میں نے یہ خبر لائل پور سے لاہور جاتے ہوئے بس کے ایک سفر میں پڑھی۔ میرے سامنے فرنٹ سیٹ پر ایک صاحب جن کی شکل و صورت سے جماعت اسلامی کے کارکن ہونے کا گمان ہوتا تھا تشریف فرما تھے۔ ان کی حرکات و سکنات سے اضطراب و پریشانی کا اظہار ہوتا تھا میں سمجھا کہ کسی قریبی عزیز کو کوئی صدمہ پیش آیا ہے۔ دریافت کرنے پر کچھ کہنے کے بجائے انہوں نے اخبار اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ پہلے صفحہ پر نظر دوڑاتے ہی مجھے اپنے رفیق سفر کی پریشانی کا علم ہو گیا اور لوگوں کو نہ معلوم یہ خبر سن کر کیا سوجھا ہو گا مگر مجھے تو وہی سوجھا جو سوجھنا چاہیے تھا۔

سال ڈیڑھ سال قبل کا ذکر ہے کہ میں کیمبل پور سے راولپنڈی بس کے ذریعے سفر کر رہا تھا کہ ایک بچہ سڑک عبور کرتے ہوئے بس کی جھپٹ میں آ کر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا اور لوگ تو اسے پانی پلانے اور ہوش میں لانے کی فکر میں تھے مگر پامسٹ اس کے ننھے ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے کی فکر میں تھا کہ آیا یہ حادثہ مہلک ثابت ہو گا یا نہیں اگر ہو گا تو وہ کون سی علامات ہیں جو ہلاکت ظاہر کرتی ہیں۔

اپنی اس حرکت پر جب کبھی بھی سوچتا ہوں تو مجھے سخت ندامت ہوتی ہے۔

مگر معلوم تحقیق و تجسس کا یہ جذبہ بھی کیا جذبہ ہے۔

ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ مودودی صاحب کی سزائے موت کی خبر پڑھ کر معاً مجھے خیال آیا تو ان کے ہاتھ کی لکیروں کا پرنٹ، اتفاق سے ساتھ ہی بیگ میں تھا۔ آہستہ سے بیگ کھولا۔ پرنٹ پر نظر دوڑائی، گوشے گوشے کا بغور مطالعہ کیا۔ سوائے ایک ہی معاملے کے کہیں پھانسی کی علامت نظر نہ آئی۔ عمر کی لکیر بھی بفضل خدا دونوں ہاتھوں پر صحیح سالم تھی۔

رفیق سفر سے تعارف پر معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی لائل پور کے صدر مسٹر عبدالحمید بی ایس سی یہی ہیں۔ سوال کیا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب کو پھانسی دے دی جائے گی؟ ان کا جواب مایوس کن تھا۔ میں نے عرض کیا میں تو کم از کم ایسا نہیں سمجھتا۔ عبدالحمید صاحب نے میرے ایسا سمجھنے کی دلیل طلب کی۔ انہیں توقع تھی کہ شاید میں اپنے اس خیال کی تائید میں کچھ سیاسی وجوہ پیش کروں گا لیکن بیچارے پامسٹ کو سیاست سے بھلا کیا غرض، وہ تو لکیر کا فقیر ہے۔ میں نے کہا میری ریڈنگ پامسٹری کی رو سے ہے۔ عبدالحمید صاحب میری اس انوکھی منطق کو غالباً پا نہ سکے۔ اس لیے انہیں کچھ حیرت سی ہوئی لیکن میں نے جب انہیں اپنے بارے میں بتایا تو فوراً پوچھا اچھا آپ نے تو مولانا کا ہاتھ بھی دیکھا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جی ہاں، لیکن اس میں تو کوئی ایسی علامت نہیں دکھائی دیتی۔ ویسے اللہ بہتر جانتا ہے۔

لاہور پہنچے تو اس دن ہر محفل کا موضوع گفتگو مودودی صاحب کی سزا تھی۔ میرا جانا جس جگہ بھی ہوا، میری جان پہچان والے لوگوں نے مجھ سے یہی سوال کیا۔

سائیں صاحب! آپ نے مودودی صاحب کا ہاتھ بھی دیکھا تھا، اس میں کہیں پھانسی وغیرہ کی علامت بھی پائی تھی؟ میرا جواب ہر جگہ یہی تھا کہ علامت تو کوئی ایسی نہیں لیکن خدا بہتر جانتا ہے۔

اس سوداد کے بعد آیئے اب ہم ایک بامان کے پرنٹ کی روشنی میں مودودی صاحب کے ہاتھ کا تجزیہ کریں حسب ذیل علامات ونقوش قابل غور ہیں۔

۱۔ مربع نما ہتھیلی ——— کسی مخصوص اور مقررہ اصول اور ضابطہ کے تحت زندگی بسر کرنے والے آئین پسند، اور وضعدار انسان کی علامت ہے معاملات کے ٹھوس اور عملی پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہے اور غیر ضروری خیال آفرینیوں اور بے مقصد باتوں میں وقت صرف نہیں کرتا۔

۲۔ ہتھیلی اور اس کی جلد دونوں مضبوط اور سخت ——— مزاج میں شوریت کا فقدان ہونے کے علاوہ مشقت پسند اور غیر راحت طلب طبیعت کی مظہر۔

۳۔ چپٹی انگلیاں جن کے جوڑ گٹھیلے اور سر چپٹے ہیں ——— قوت تنقید و تجزیہ کے ساتھ قوت ایجاد و اختراع۔ جدت طرازی اور تدرت پسندی کی صفات کی مظہر!

۴۔ دوسرا پورا دونوں میں بتا ہوا مضبوط انگوٹھا ——— قوت استدلال، قوت فیصلہ اور قوت ارادی میں بے پناہ ہم آہنگی۔ ایسے لوگوں میں فیصلہ کرنے، اس پر مضبوطی سے ڈٹ جانے اور متوقع نتائج حاصل کرنے کی بے اندازہ صلاحیت

ہوتی ہے۔

۵۔ دماغی لکیر، اختتام پر سہ شاخہ ــــــ ایک غیر معمولی علامت جو بیک وقت تین مختلف خوبیوں کے حاملین میں پائی جاتی ہے۔ یہ خوبیاں علمی، جنگی اور تنظیمی میدان میں اکثر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

۶۔ دماغی لکیر، اپنے مقامِ آغاز پر خطِ حیات سے قدرے وابستہ ــــــ کسی مرکز سے وابستہ ہونے یا کسی مقصد کا پابند ہونے کی علامت، اس کے علاوہ یہ علامت (جیساکہ دماغی لکیر پر بحث کے مطالعہ سے واضح ہے) ایک آزاد منش اور بے قید طبع کے مقابلہ میں ایک فکر مند، محتاط اور حساس طبع ہونے کی علامت ہے۔

۷۔ دل کی دو شاخہ لکیر، جس کی ایک شاخ کا آغاز پہلی اور دوسری انگلی سے ہوتا ہے اور دوسری کا آغاز مشتری کے اُبھار سے ــــــ ایک غیر جذباتی، معتدل مزاج، متوازن طبع ہونے کی علامت، جو اپنے عزائم اور مقاصد کو حاصل کرنے میں عجلت، جذباتیت اور بے تدبیری سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کام کرتا ہے۔ اور "وادیٔ عشق" میں بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

۸۔ دل اور دماغ کی لکیروں کے درمیان مناسب فاصلہ ــــــ اس بات کا مظہر کہ دل اور دماغ اپنے اپنے مقام پر مناسب طور پر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے بہت کم الجھتے ہیں۔

۹۔ مریخ مثبت و مریخ منفی کے دونوں ابھار نمایاں ــــــ شجاعت،

عالی ہمتی، جرأت و بے باکی کے مظہر۔ یہ علامات فنونِ حربیہ کے ماہرین اور فاتحین کے ہاتھوں پر پائی جاتی ہیں۔ اس قسم کے لوگ ذہنی اور جسمانی دونوں لحاظ سے اپنے ماحول کے ساتھ مسلسل جنگ آزما رہتے ہیں۔

۱۰۔ عطارد کا نمایاں اُبھار اور اس پر متعدد عمودی لکیریں —— فصاحت و بلاغت اور اظہارِ بیان پر قدرت کے علاوہ ٹیکنیکل مسائل کو سمجھنے بوجھنے کی صلاحیتوں کا مظہر۔

مندرجہ بالا سطور میں علم پامسٹری کی رُو سے مودودی صاحب کی ان ذہنی صلاحیتوں کا اجمالی طور پر جائزہ لیا گیا ہے جو قدرت نے انہیں بخشی ہیں۔ ان جملہ صلاحیتوں کے ترکیبی عناصر کو مجموعی طور پر سامنے رکھتے ہوئے یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ مودودی صاحب ایک غیر معمولی شخصیت و صلاحیت کے انسان ہیں اور ان عظیم دماغی قوت کے لوگوں میں سے ایک ہیں، جو تاریخ عالم میں اپنا منفرد مقام پیدا کر لیتے ہیں بشرطیکہ ماحول بیحد ناسازگار اور ناقدر شناس واقع نہ ہو۔

لیکن چونکہ پامسٹری صرف صلاحیتوں ہی کا جائزہ نہیں لیتی بلکہ ان "نتائج" کا بھی نقشہ پیدا کرتی ہے جو ایک فرد کے ماحول کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے بعد ظہور میں آتے ہیں اور جنہیں ہم دوسرے لفظوں میں "قسمت" کے نام سے پکارتے ہیں، اس لیے آیئے ہم مودودی صاحب کے ہاتھ سے ان علامات کو تلاش کریں جو ان نتائجِ قسمت کو پیش کرتی ہیں۔

مودودی صاحب کے دائیں ہاتھ پر قسمت کی لکیروں کی تعداد حسب ذیل ہے:-

۱۔قسمت کی لکیر آغاز سے مبہم اور غیر واضح اور بعد میں واضح اور روشن، لیکن عمر کی لکیر کے ساتھ جکڑی ہوئی ——— شروع شروع میں ناموافق معاشی ماحول کا سامنا اور پھر ذاتی ہمت اور کوشش سے حالات سدھارنے کی مظہر!

۲۔مریخ مثبت کی جانب سے عمر اور قسمت کی لکیروں کو قطع کرتی ہوئی مخالف لکیریں ——— مخالف عناصر کی جانب سے متعدد پیدا شدہ رکاوٹیں، جو اگر عمر اور قسمت کی لکیروں کو کمزور اور ٹکڑے ٹکڑے کردیں تو رکاوٹیں تباہ کن ہوتی ہیں اور اگر ان پر کوئی ایسا اثر نہ چھوڑیں تو رکاوٹوں کو عبور کرجانے کی علامت ہے۔

۳۔مریخ مثبت کی جانب سے عمر، قسمت، دل، دماغ اور شمسی پانچوں لکیروں کو قطع کرتی ہوئی بالخصوص تین بڑی "مخالف لکیریں" جو تقریباً ۲۷ برس — ۵۰ برس اور ۵۸ برس کی عمر کو قطع کرتی ہیں (وقت کا اندازہ اس مقام سے کیا گیا ہے جہاں سے یہ مخالفانہ لکیریں قسمت کی لکیر کو قطع کرتی ہیں) مخالف عناصر کی طرف سے پیدا شدہ تین رکاوٹیں جو دل، دماغ، صحت، کیریئر اور کامیابی پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔

نوٹ:- جو مخالف لکیر ۲۷ برس کے قریب قسمت کی لکیر کو کاٹتی ہے وہ غالباً مودودی صاحب کی پہلی نظر بندی کی مظہر ہے جو پچاس برس کے قریب قطع کرتی ہے وہ غالباً اس موجودہ نظر بندی کی مظہر ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان

پہلی "مخالف لکیروں" سے قسمت، عمر، دل اور دماغ کی لکیروں میں نہ تو کوئی ضعف پیدا ہوا ہے اور نہ کوئی شکست ـــ جہاں یہ شمسی لکیر کو کاٹتی ہیں وہاں ایک بڑا سا جزیرہ بن جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مخالف لکیریں کامیابی کی راہ میں ضرور حائل ہوئی ہیں۔ ویسے بھی جزیرہ ہاتھ کی کسی بھی لکیر پر کسی اچھی علامت کا مظہر تصور نہیں کیا جاسکتا تیسری "مخالف لکیر" قسمت کی لکیر کو اس وقت منقطع کرتی ہے جب وہ دل کی لکیر سے آکر ملتی ہے۔ یہ کسی تیسری بڑی رکاوٹ کی آئینہ دار ہے۔ جس کا اندازہ تقریباً ۵۸، ۶۰ کی عمر کے لگ بھگ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ دیکھا جاسکتا ہے، قسمت کا اصلی خط یک لخت ختم ہوجاتا ہے۔ یہ بتانا قطعی طور پر ذرا مشکل ہے کہ یہ کیفیت آخر کس واقعہ کی مظہر ہے۔ میرے نزدیک ایسی علامت یقیناً خطرناک تصور کی جاتی ہے اگر کچھ فاصلے پر ایک اور قسمت کی لکیر زحل کے اُبھار پر دکھائی نہ دیتی۔ صحیح مفہوم تو ان علامات کا صرف خدائے علیم و برتر ہی جانتا ہے مگر میری یہ ریڈنگ ہے کہ اگر مودودی صاحب ۵۸، ۶۰ کے دور سے بخیریت گزر گئے تو دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جس کو وہ پار نہ کرسکیں۔

مودودی صاحب کے ہاتھ پر چند اور قابلِ ذکر علامات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) مریخ منفی کے اُبھار پر مثلث نما، نشان ذہنی فتوحات کا مظہر (ملاحظہ فرمایئے مہاتما گاندھی کے ہاتھ پر یہی نشان) (۲) عمر کی لکیر سے ایک شاخ مشتری کے اُبھار کی طرف نکل کر جاتی ہوئی ـــ عزائم میں کامیابی کی علامت (۳) شمسی لکیر انجام پر سیدھی، واضح اور روشن۔ شہرت اور مقبولیت کی علامت (۴) زہرہ کے اُبھار پر عمر کی لکیر سے وابستہ مربع۔ نظر بندی اور اسیری کی علامت (۵) خط حیات کے اختتام پر چند شاخیں قمر کے ابھار کو جاتی ہوئی۔ کسی غیر ملکی سفر کے امکانات۔

مَن ھُوَ المودودی

علامہ محمد البشیر الابراہیمی

(صدر جمعیۃ العلماء المسلمین الجزائر)

آپ علامہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں جماعت اسلامی پاکستان کے امیر ہیں ان کے حالات ایک ایسے واقف حال کی طرح بیان کر رہا ہوں جس نے ان کے بارے میں پڑھا بھی ہے اور انہیں دیکھا بھی ہے آپ ایسے انسان ہیں کہ ان جیسے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ بلکہ اس زمانے میں ان کی جیسی منفرد خصوصیات کا حامل جن کی بنا پر وہ علماء اسلام میں ممتاز ہیں بالکل نہیں دیکھا۔ حق پر ثابت قدمی، راہ حق کے مصائب پر صبر، اور حکام وقت کی خوشامد سے مکمل کنارا ان کے قریب پھٹکنے تک سے احتراز! اُن کی چند خصوصیات ہیں۔

پاکستان و ہندوستان میں مَیں نے جن لوگوں کو دیکھا یا جن کے متعلق سُنا، اسلام کے تشریعی اور تاریخی حقائق کی سمجھ بوجھ آپ ان سب سے زیادہ رکھتے ہیں۔ آپ کا

مطالعہ بڑا وسیع ہے۔ آپ دقیق فہم، اعلیٰ دماغ، روشن فکر اور عظیم عقل کے مالک ہیں
آپ پر ظاہری سنجیدگی کے باوجود روح کی جھلک نمایاں ہے۔ اشیاء کے باہمی مقابلہ،
موازنہ اور استنباط میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ استدلال میں ایک حد تک منفرد حیثیت
کے حامل ہیں۔ شریعت کو عمومی مقاصد (GENERAL OBJECTIVES) پر
منطبق کرتے وقت جزئیات کو صرف اُس حد تک اہمیت دیتے ہیں جس حد تک
وہ اصول پر اثر انداز نہ ہوں۔ نکات کے استخراج میں ان کی فکر بہت گہری جاتی ہے
آپ پختہ عقائد کے مالک ہیں جس کا اثر آپ کے اعمال و مواقف میں قوت و
ثبات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس طرح اچھی غذا کا اثر ان کے جسم پر چستی اور
تر و تازگی کی شکل میں نمایاں ہے، آپ ایک فلسفی ہیں مگر آپ کا رجحان علمی ہے
نہ کہ عقلی۔ حقائق، واقعات اور اعداد و شمار (FACTS AND FIGURES)
سے گہرا شغف آپ کے عقلی فلسفی بننے میں مانع ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ ضرور
عقلی فلسفی ہوتے۔ آپ نص اور حقیقت واقعہ کی ہیئت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور
اس میں غور و فکر اور استنباط کے بھی قائل ہیں اور اس میں وہ ایک حد تک اضافہ
کرتے ہیں۔

آپ کا رہن سہن عام طرز کا ہے لیکن قیادت بہر حال اپنا خاص مقام رکھتی
ہے۔ آپ کی رائے میں قیادت ۔۔۔ (نہ کہ قائد) کے کچھ حقوق ہیں۔ اور یہ نظم و ضبط
کی نگرانی اور صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار کرتی ہے سلوک نا اہلوں کو ان کی حد سے

آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ یہ سب کچھ میں نے ان کے مجموعی حالات اور ان کے بعض رفقاء کے میل جول سے معلوم کیا ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق ان سطروں میں میں نے ان کی تصویر کھینچی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ قیادت اور قائد میں بہت نازک فرق ہے اور اس کی یہی نزاکت ہی قائدین کو خود فریبی میں مبتلا کرتی ہے اور ان کے متبعین کو ان کے معاملے میں فریب دیتی رہتی ہے۔

آپ عربی زبان بولنے میں ہچکچاتے ہیں، حالانکہ قرآن، حدیث اور دینی لٹریچر میں ان کی نظر بڑی گہری ہے اور اُن کو حالات و مسائل پر منطبق کرنے پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ عربی بولنے میں ان کی کمزوری کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اسے بول چال اور تحریر میں بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ اس قدر کثیر تصنیفات کے باوجود جن کی تعداد چالیس، پچاس تک پہنچتی ہے، آپ نے عربی زبان میں ایک کتاب بھی نہیں لکھی۔ آپ کی تمام تصنیفات اردو اور انگریزی میں ہیں، اور تمام کی تمام ایسے اہم اسلامی موضوعات پر ہیں جن کا موجودہ بیداری اور ترقی اور نئی روشنی تقاضا کرتی ہے۔ جو اس عہد میں زیادہ موضوع بحث اور اہل مغرب کی تنقید و تخریب کا ہدف بنے رہتے ہیں۔

علوم حاضرہ اور تہذیب جدید کے مطالعہ میں مولانا مودودی کو خاص دستگاہ حاصل ہے۔ آپ ان کو عدل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ نہ ان کا انکار کرتے ہیں اور نہ اس رو میں بہ نکلتے ہیں۔ بلکہ ان چیزوں کے مقابلے میں احتیاط اور ہوشیاری سے کام

لیتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے ایک رکن نے آپ کی چند کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے اہل عرب کے لیے آپ کے افکار کے مطالعہ کا سامان کر دیا ہے۔ یہ رکن ہمارے صدیق باوفا مسعود عالم صاحب ندوی ہیں کئی برس ہوئے انہوں نے یہ ترجمہ شدہ کتب مجھے الجزائر میں بطور ہدیہ بھیجی تھیں جن میں مجھے ایک نکھری ہوئی فکر، حکمت سے لبریز، عقل اور گہری سوچ کے آثار دکھائی دیئے اور الفاظ و معانی میں ایک ایسا تسلسل نظر آیا، جو ان رسالوں کے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہونے کی غمازی نہیں کرتے۔ اس ترجمہ سے ایک بات واضح ہو گئی کہ موضوعات بھی اسلامی ہیں اور دونوں زبانیں بھی! اور مصنف و مترجم ایک تخیل کی پیداوار ہیں۔ روح کی یکرنگی نے اس ترجمہ میں ایک عجیب اثر بھر دیا ہے۔ ہمارے دوست مسعود عالم، الندوی پر مہربان ہو — برصغیر ہند میں "ثانی اثنین" ہیں، جو ایسی ہی عمدہ عربی تحریر لکھتے ہیں جیسے عرب کے اہل زبان! دوسرے صاحب ابوالحسن علی ندوی ہیں۔

علامہ مودودی اخبار "البصائر" کے ذریعے "جمعیت العلماء الجزائریین" سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ اس تحریک کے اصولوں اور اپنے اصولوں میں قریبی یگانگت کا انہیں قوی شعور ہے۔

وہ اپنے پہلو میں ایک ایسا دل رکھتے ہیں جو مسلمانوں کے حالات میں گہری دلچسپی، ان کے حاضر سے ہمدردی و غم خواری اور ان کے ماضی پر اعجاب و پسندیدگی

اور اسلام کے نظام کی مدح و منقبت سے معمور ہے۔ آپ کی رائے میں یہ نظام تمام نظامہائے انسانی سے زیادہ مبنی بر عدل ہے۔ بشری خواہشات و جذبات کے لیے محکم ترین ضابطہ ہے۔ اور یہ انسان کی باہم و دگر مربوط مصلحتوں اور تقاضوں کا محفوظ ترین نظام ہے۔ اسی سے حکومت اسلامی کے بارے میں آپ کا تخیل پروان چڑھا ہے۔

میرے عالم اسلام کے سفر میں جو مقاصد پنہاں تھے ان پر آپ نے مسرت کا اظہار فرمایا۔ کیونکہ آپ کے خیال میں مسلمانوں کا تعارف کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آنا اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حالات کی اصلاح میں تعاون سے کام لیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ نے مجھ میں ایک عیب کی نشاندہی کی۔ اور وہ یہ ہے کہ جس طرز پر انہوں نے مجھ سے گفتگو سنی اس طرز پر میں نے مسلمانوں کے حالات پر کتابیں لکھنے کا اہتمام نہیں کیا۔ میں نے انہیں اس کا جواب دیا، مگر وہ اس پر مطمئن نہ ہوئے۔ کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ یہ روزمرہ کی گفتگو بھی دراصل مکمل کتابچے ہیں۔ ان میں اگر کمی ہے تو صرف تالیف کی۔ تصنیف کے بارے میں آپ کی رائے یہ ہے کہ کتابیں کم حجم کی ہوں تاکہ ان کا مطالعہ قیمت گراں بار نہ ہو۔ آپ تصنیف کتب کے اسی طریقے پر عمل پیرا ہیں۔ آپ کی تمام تصانیف مستقل موضوعات پر کتابچوں کی صورت میں ہیں۔

جب میں پہلے پہل کراچی میں آتا، تو آپ کے کچھ رفقاء نے مجھ سے

ملاقات کی۔ وہ مجھ سے اس طرح ملے جیسے بھائی بھائی سے اور ہم مشرب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ الجزائر کی جمعیت علماء سے اس حد تک واقف ہیں جس حد تک اخبار "البصائر" کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔

مودودی صاحب اس وقت اپنے مرکز صوبۂ پنجاب کے دارالخلافہ لاہور میں مقیم تھے۔ انہیں جب میری آمد کی خبر ملی تو میری ملاقات کا انتظار کرنے لگے۔ جب میں نے اندرون ملک سفر کا ارادہ کیا تو لاہور اترنے سے پیشتر ان سے شخصی تعارف حاصل کرنے کے شوق میں انہیں لکھا کہ آپ مجھ سے لاہور اسٹیشن پر ملیں مگر بدقسمتی سے میرا خط وقت پر نہ پہنچا، کیونکہ حکومت سے اختلاف کے سبب آپ کی تمام ڈاک سنسر کے لیے روک لی جاتی ہے۔ ہم اس اختلاف پر بعد میں کلام کریں گے۔ جب آپ کو میرا خط پہنچا تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ اور آپ نے میرے پیچھے راولپنڈی جہاں میرا ریل کا سفر ختم ہوتا تھا ایک قاصد بھیجا۔ لاہور اور راولپنڈی کے درمیان کئی سو میل کی مسافت ہے۔ قاصد مجھے وہاں آملا اور آپ کے سلام، افسوس اور انتظار کا پیغام دیا۔ جب میں کشمیر اور پشاور کی سیاحت سے واپس پہنچا تو میں نے چاہا کہ آپ کو بے چین کروں۔ اس لیے میں نے اپنی آمد کی خبر اسی وقت دی جب میں لاہور کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہو گیا۔ آپ فوراً مجھ سے ملنے آئے۔ پہلے ہماری روحیں متعارف تھیں اب جسم بھی متعارف ہو گئے۔

میں نے اپنے سامنے ایک گٹھے ہوئے جسم کا انسان دیکھا پیشانی پُروقار، جسم زندگی اور توانائی سے بھرپور، گنجان اور بارعب ڈاڑھی جس کی سیاہی پر سفیدی غالب! آپ نے ملاقات کے بعد مجھے اپنے مکان پر دعوت دی۔ جو جماعت کا مرکز ہے، ہم جماعت کے کچھ ارکان کے ساتھ چائے پر بیٹھے ہوئے، چائے کا دور چل رہا تھا کہ انہوں نے مجھ سے تقریر کا مطالبہ کیا میں نے تقریر شروع کی اور اسلامی موضوعات پر جو آج کل افکار کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں جی بھر کے گفتگو کی۔ اور مولانا مودودی ــ خدا آپ کی مشکلات دور فرمائے ــ جہاں کہیں میری زبان مبہم ہو جاتی اور اس میں اشارات و کنایات آجاتے، مجھے روکنے کو کہتے، تاکہ آپ کا ایک لائق عربی داں شاگرد ترجمہ کر کے مطالب کی پیچیدگی کو دور کر دے اور کہیں تقریر کا کوئی مطلب سمجھنے سے نہ رہ جائے۔

رہا آپ کے اور حکومت کے مابین اختلاف کا مسئلہ تو اس کا سب سے بڑا اور واضح سبب یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا مقصد پاکستان میں صحیح اور مکمل معنوں میں اسلامی حکومت کا قیام ہے جس میں نہ نرمی کی گنجائش ہے نہ تساہل کی اور جس کا دستور ان تمام احکام پر مشتمل ہو جو اللہ تعالیٰ نے معاملات، حدود اور قصاص کے بارے میں نازل کیے ہیں۔ اس سلسلے میں مودودی صاحب کے خیالات واضح ہیں، اور پروگرام، منصوبے اور طریق کار آزمودہ اور جانے بوجھے ہیں جن میں ردوقدح کی گنجائش نہیں بلکہ آپ نے ایک مکمل دستوری خاکہ بھی مرتب کیا ہے جس کے چند حصے مصر کے مؤقر مجلہ "المسلمون" نے ترجمہ کیے ہیں اور جو مذکورہ بالا امور اور علامہ مودودی کے بارے میں اس امر کی دلالت

کرتے ہیں کہ انہیں اسلامی نظام کے فہم میں کس درجہ دسترس حاصل ہے؟ اس ضمن میں "جماعت اسلامی" کی حجت یہ ہے کہ مسلمان تقسیم ہند پر صرف اس لیے رضامند ہوئے تھے اور انہوں نے جان و مال ایسی عظیم الشان قربانیاں جو آج تک کسی قوم نے نہیں دی ہیں صرف اس بنا پر خوشی خوشی برداشت کر لی تھیں کہ وہ اپنے دین کو اس کی اصلی حیثیت میں قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اگر اب بھی صورت حال وہی رہی جو تقسیم ملک سے قبل قائم تھی تو یہ نہ ان قربانیوں کا صلہ ہو سکتا ہے نہ ان کے کسی ادنیٰ حصے کا بدل!

حکومت پاکستان جو اگرچہ بظاہر اسلامی اور حقیقت کے اعتبار سے جمہوری طرز کی حکومت ہے اب تک اسی نظام پر چل رہی ہے جو انگریز نے ہندوستان کے لیے وضع کیا تھا۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کا دستور اسلامی ہو اس لیے کہ عوام یہی چاہتے ہیں یا اس لیے کہ عوام کی اکثریت یہی چاہتی ہے لیکن حکومت اسے تدریج، نرم روی، سہولت کے ساتھ اور حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر لانا چاہتی ہے، پھر پاکستان میں ایک مغرب زدہ طبقہ بھی ہے جو اسلامی دستور نہیں چاہتا، لیکن وہ عوام کے مقابلے میں قلیل ہونے کی وجہ سے در پردہ سرگرم عمل ہے۔ صاحب بصیرت لوگوں کا خیال ہے کہ اس طبقہ کو بیرون ملک سے کافی تائید حاصل ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان دو افکار میں سے کسی ایک کو قابل ترجیح قرار دیا جا سکے۔ اگرچہ اس بارے میں ہماری بھی ایک رائے ہے جس کا اظہار ہم نے بعض ذمہ دار اشخاص سے اس وقت کر دیا تھا۔

مفصلہ بالا وجوہ کی بنا پر حکومت مولانا مودودی، ان کے سخت اور بے لوچ مسلک،

کھری کھری باتوں اور زعم خود ان کی عجلت کی تاب نہ لاسکی۔ اس لیے جب بھی خاص موقع پر انہوں نے پُرزور خیالات کا اظہار کیا اور فتوے صادر کیے تو حکومت نے انہیں قید و بند میں ڈال دیا اور ہمیشہ انہیں خوف و ہراس کی نظر سے دیکھتی رہی جن دنوں کشمیر کا قضیہ اپنی شدت پر تھا اور وہاں مسلح جھڑپیں ہو رہی تھیں آپ کی طرف ایک فتویٰ منسوب کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اس فتوے سے دشمن کو ایک حربہ ہاتھ آگیا ہے اور ہندوؤں کے پروپیگنڈے کو اس سے مدد ملی ہے۔ یہ فتویٰ مجھے بہت کھلتا رہا اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہونے کی مجھے بڑی تمنا رہی۔ کیونکہ یہ فتویٰ مجھ سے اس طور پر بیان کیا گیا تھا کہ اگر یہ درست ہوتا تو میں سب سے پہلا شخص ہوتا جو اس کی مخالفت کرتا۔ مولانا کی قیام گاہ پر ان کی صحبت میں میں نے یہ سوال کیا لیکن میرا سوال ان دیگر مسائل کے غل غپاڑے میں گم ہو گیا جن پر باتوں میں باتیں نکل رہی تھیں۔ پھر اس صحبت میں جو باتیں ہوئیں ان میں گم ہو کر میں اس سوال کا اعادہ کرنا ہی بھول گیا۔ اس فرصت کو ہاتھ سے دے کر میرے دل میں ایک خلش سی رہی خدا معلوم یہ فرصت دوبارہ مل سکے گی یا نہیں۔ میرا یہ شوق سوال اس لیے ہے کہ میں حقیقت کا سراغ اس کے اصل ماخذ سے لگاؤں اور مولانا سے ان کے خلاف کہی ہوئی باتوں پر تبادلہ خیالات کروں۔

باوجودیکہ ہم نے اسلامی دستور کی بنیاد پر حکومت قائم کرنے کے بارے میں حکومت اور مولانا مودودی کے اختلاف پر اپنی رائے محفوظ رکھی ہے ہم حق کی خاطر ایک بات صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ مولانا مودودی ہی وہ آدمی ہیں جو دولت پاکستان

کے لیے مطلوبہ اسلامی دستور وضع کرنے پر سب سے زیادہ قدرت رکھتے ہیں اور علماء میں سب سے قابل آدمی ہیں جو بڑی عمدگی و مہارت سے قرآن و حدیث، اسلامی قانون کے مقاصد عامہ اور امت مسلمہ کے متفق علیہ اصولوں سے دستور کو اخذ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی میں اس بات کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ مودودی صاحب اور ان کے مرتب کردہ دستور کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ صرف حکومت ہی نہیں بلکہ فقہاء مذاہب کا جمود ہے جو ہمتوں کو پست کر دیتا ہے اور پاکستان میں فقہی مسالک کی کثرت کا کیا کہنا!

گزشتہ ماہ پاکستان میں سخت ہیجان برپا ہوا اور جس طرح ابھی ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں بیشتر عربی اخبارات نے اختصار کیا اس لیے ہم اس ہیجان کے اسباب و وجوہ اور اغراض و مقاصد سمجھنے سے قاصر رہے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ اس کا محور حکومت اسلامی کا مطالبہ ہے۔ اور شاید حکومت نے ملک میں مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کے اثر و نفوذ کو بہت بڑھتے دیکھ کر انہیں اور ان کے بیشتر رفقاء کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا پھر اس معاملے کو فوجی حکومت کے سپرد کر دیا جو لاہور میں قائم کی گئی اور جس نے ان کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ سزائے موت کو چودہ سال قید با مشقت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ پاکستان کے مسلمان اس ظالمانہ فیصلہ اور اس کی شدید و تخفیف شدہ دونوں صورتوں پر بہت برافروختہ ہوئے اور حکومت پر غیظ و غضب سے لبریز احتجاجوں اور مظاہروں کا ایک طوفان امنڈ پڑا۔ ہمیں اس میں ذرا شک نہیں کہ تخفیف سزا اسی غیظ و غضب کے اظہار کا نتیجہ ہے۔

53 ماہنامہ

پھر مصر، شام، عراق اور کویت سے تمام منظم اسلامی اداروں اور انجمنوں نے بھی صدائے احتجاج بلند کی، اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مجھے ان خبروں کی تصدیق اسی وقت ہو گئی تھی جبکہ میں کویت میں تھا۔ میرے ان کے ساتھ تعلقات اور جمعیت العلماء اور ان کے درمیان ایک دوسرے کی قدر و منزلت کی بنا پر مجھے غم اور افسوس ہوا کیونکہ مودودی کسی ایک محدود علاقے کی شخصیت نہیں بلکہ تمام مسلمانان عالم کی متاع ہیں۔ ان کے ہم پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اب جبکہ حکومت نے ان کی سزائے موت بدل دی ہے ہم ان کی رہائی کے لیے کوشش کریں۔

بنابریں میں نے جمعیت علماء مسلمانان الجزائر کی طرف سے جن کی نمائندگی یہاں اس کے قابل فخر فرزند جناب فضیل ورتلانی کرتے ہیں اور تمام عرب مغربی کی طرف سے گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کو الگ الگ برقیہ ارسال کیا ہے، جس کی نقل اس مضمون سے پہلے شائع کی گئی ہے۔ کیونکہ اسلام کی خدمت اور اس کے حامیوں کی نصرت و تائید میں موصوف نے کچھ کم حصہ نہیں لیا اور توقع ہے کہ پاکستان کی مسلمان حکومت اس اسلامی شعور کو ملحوظ رکھے گی جو کل اس کے وجود میں آنے کی خوشی میں موجزن تھا اور آج اس اندیشے کی بنا پر مضطرب ہے کہ کہیں اس کی نیک نامی کو اس بنا پر بٹہ نہ لگ جائے کہ وہ اظہار رائے بلکہ دینی آزادی کے خلاف بھی نبرد آزما ہے، اور اسے اس بات کا احساس ہو کہ مودودی صاحب نے جو صدا بلند کی ہے وہ اسے ایسا بڑا جرم سمجھتی ہے کہ اس پر انہیں موت یا عمر قید کی سزا دی جانی چاہیے۔ دراصل یہ حکومت

کے بارے میں تمام مسلمانوں کی رائے ہے۔ ان سب کی یہ خواہش ہے اور وہ سب اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہونی چاہیئے تاکہ وہ مسلمانوں کے لیے وجہِ افتخار، مرکزِ پناہ اور اسلام کے لیے باعثِ عزت اور ملجا و ماویٰ ثابت ہو۔ اپنے دوست کے حق میں حمایت و نصرت کی اس ناچیز سی کوشش کے بعد میرا انتہائی فرض تھا کہ میں انہیں اپنے ابنائے وطن اور قارئین "البصائر" سے متعارف کراؤں، تاکہ وہ بخوبی جان لیں کہ یہ قہر و غضب کس شخص پر ٹوٹ پڑا ہے۔ امید ہے کہ عنقریب ان کی رہائی و خلاصی کی خوشخبری ہمیں پہنچے گی۔ اور اس طرح مسلمانوں کا غم و غصہ مسرت و رضامندی میں تبدیل ہو جائے گا۔

مولانا مودودی صاحب نے اسلام کی راہ میں جس جہاد کا بیڑا اٹھایا ہے اس دنیا میں اس پر اتنا اجر بھی کافی ہے کہ مسلمان ان کی حمایت و نصرت پر اس کثرت سے مجتمع ہو گئے ہیں، اور انہیں جو اجر اللہ کے ہاں ملے گا وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر و پائیدار ہے۔

مودودی صاحب کو آزادی اور قید ہر دو حالتوں میں ہمارا اسلام پہنچے۔

(ترجمہ: جناب رحمت باری صاحب ازغاران)

ابوالاعلیٰ مودودی

ـــــــ ایک انقلابی مفکر

(نعیم صدیقی۔ ایڈیٹر چراغِ راہ۔ کراچی)

[یہ ایک تعارف ہے اس دلچسپ تاریخی شخصیت کے ایک پہلو کا جو درحقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں ـــــــ وہ کہ جس کے حصے میں سب سے زیادہ گالیاں بھی ہیں، اور سب سے زیادہ محبت و احترام بھی!]

۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" کے الفاظ میں انسانی کردار کا جو آئیڈیل اقبال نے پیش کیا تھا اسے واقعی انسانی پیکر میں دیکھنے کی تمنا سے بے تاب ایک مدت تک حسرت ناکام رہی۔ اس مصرعہ کو ہزاروں نوجوانوں کی طرح میں نے بھی برسوں گنگنایا ہے لیکن اپنے گردوپیش دنیا وہ دیکھی جس کے چیدہ اور

نامور ترین افراد کو "حدیثِ بے خبراں" پر کاربند پایا۔ بالآخر اقبال کا وہ آئیڈیل گوشت پوست کے ایک پیکر میں ملا جو تن تنہا اپنے فکر و عمل کا سرمایہ لے کر میدان میں نکلتا ہے اور یہ عزم کر کے نکلتا ہے کہ کوئی میرے پیچھے آئے یا نہ آئے مجھے بہر حال ایک متعین نصب العین کی طرف ایک مقررہ راستے سے قدم بہ قدم بڑھتے جانا ہے، اور پھر واقعی وہ پوری شانِ یکتائی کے ساتھ ترجمانِ قرآن کا ایک "ٹمٹاتا دیا" لیے ناسازگار حالات کی تاریکیوں میں، مخالفتوں کے جھکڑ چلتے ہیں، غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے بگولوں میں کئی سال رواں دواں رہتا ہے، اپنی منزل کا سراغ خود لگاتا ہے، اپنا راستہ آپ بناتا ہے، اس راستے پر سنگِ میل خود نصب کرتا ہے، پھر اکا دکا مسافر رفیقِ راہ بنتے ہیں، اُن سے وہ پہلے ہی قدم پر کہہ دیتا ہے کہ جسے میرے ساتھ چلنا ہو وہ پہلے سے منزل کی دوری، راستے کی صعوبت اور ہم سے مردانہ ہونے کا پورا پورا اندازہ کر کے چلے، جسے بھی پیشِ نظر مقصد کی سرزمین پہ میرے ساتھ قدم رکھنا ہو وہ واپسی کی کشتیاں جلا کے آئے، جو آگے کو قدم اُٹھائے وہ یہ طے کر کے اٹھائے کہ آگے بڑھا ہوا قدم واپس نہیں لیا جا سکتا۔ چنانچہ کچھ ساتھی چلتے ہیں، کچھ تھوڑی دور چل کر ہمت ہار دیتے ہیں، کچھ نئے ہم سفر آملتے ہیں، مگر وہ کٹنے والوں اور جڑنے والوں سے بے نیاز ہو کر اپنی ایک ہی دُھن میں، ایک ہی چال سے، ایک ہی رُخ پر گامزن رہتا ہے، آہستہ آہستہ ایک کارواں کا کارواں اس کے جلو میں

متحرک نظر آتا ہے۔ یہ شخص جو دنیا بھر پر چھائی ہوئی عالمگیر (یورپین) مشرق و مغرب کے ایک ایک چپے پر کوسِ لِمَنِ المُلک بجانے والی جہانی تہذیب کو چیلنج کرنے کے لیے ایک دن اس طرح بے یار و مددگار اور بے ذریعہ و وسیلہ آگے بڑھتا ہے اور زمانے کی طاقتوں کو بالآخر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کی دعوت کو وزن دیں،

یہی ہے مودودی ——— "بازمانہ ستیز" کی زندہ تصویر!!

آیئے اس کردار کو خود اس کے اپنے لفظوں میں پڑھیں۔ "ترجمان القرآن" کا ساتواں سال شروع ہونے پر اس کا جو اداریہ مارچ ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا، اس کا ایک حصہ یہ ہے:-

"..... یہ تمنائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ برس سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں انہیں حاصل کرنے کے لیے خرچ کر رہا ہوں، مگر بدقسمتی سے اکیلا اور تنہا ہوں۔ میری طاقت محدود ہے، وسائل مفقود ہیں، اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا۔ ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر وہ کمیاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں، جس جنوں میں مبتلا ہوں اس کا مجنوں مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچاتا رہا ہوں اُن کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دُور نظر آتے ہیں۔ اُن کی دُھن میری دُھن سے الگ، اُن کی [illegible]

کے مرکز میرے مرکزِ گرویدگی سے جدا۔ ان کی رُوح میری روح سے ناآشنا، اُن کے کان میری زبان سے بیگانہ۔ یہ دُنیا کوئی اور دنیا ہے جس سے میری فطرت مانوس نہیں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جن نظریات، جن جذبات، جن اغراض و مقاصد اور جن اصولوں کی بنا پر ہو رہا ہے سب کے خلاف بغاوت کا عَلم بلند کرنے پر مَیں مجبور ہوں۔ مَیں اس کے اجزا میں سے بعض کا باغی اور بعض کا حامی نہیں ہوں بلکہ کُل کا باغی ہوں۔ میں ترمیم کا خواہشمند نہیں ہوں بلکہ موجودہ زندگی کی پوری عمارت کو توڑ ڈالنا چاہتا ہوں، اور اس کی جگہ خالص اسلامی اصولوں پر دوسری عمارت بنانے کا خواہاں ہوں۔ اس کلی وہمہ گیر بغاوت میں کوئی مجھے اپنا ساتھی نہیں ملتا، ہر طرف مجھے جزوی باغی ہی ملتے ہیں جو اس بُت خانے کے کسی نہ کسی بُت سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کا مطالبہ یہ ہے کہ سب بُتوں کو توڑ دو مگر میرے بُت کی طرف نظر اٹھاکر نہ دیکھنا۔ ایسی حالت میں ناگزیر ہے کہ جزئی باغی کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مجھ سے الگ ہو جائیں۔ میرا ساتھ صرف کُلّی باغی ہی دے سکتے ہیں اور وہ کم یاب ہیں۔ جب تک وہ نہ ملیں اپنے محدود وسائل اور اپنی محدود طاقت سے محدود پیمانہ پر مَیں تنہا جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کرتا رہوں گا۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر ذہن و کردار کا مطالعہ کرنے والی کوئی مردم شناس نگاہ مودودی کے بارے میں ان الفاظ کے سوا اور کوئی چیز نہ پاسکے تو محض اس ایک اقتباس سے اس کی شخصیت کا مقام دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے کیرکٹر کی تصویر مرتب کی جا سکتی ہے، اس کی نفسیاتی ساخت کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے، اور اپنے دور کی تاریخ میں اس کا مرتبہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

مودودی ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے کسی نفسیاتی مرض سے مجبور ہو کر اپنے لیے سب سے الگ ایک راستہ نکال لیتے ہیں، جن کا احساسِ کمتری یہ ردِ عمل دکھاتا ہے کہ وہ بڑا بننے کے درپے رہتے ہیں، جن میں "خود امتیازی" (SELF-IMPORTANCE) کا ایک طوفان موجزن رہتا ہے اور وہ ان کو وقت اور معاشرے اور ماحول کے خلاف ضدم ضدا میں مبتلا کر دیتا ہے اور جو دوسروں پر اپنی "ذات" کو ٹھونسنے کی مختلف تدبیریں اختیار کرتے رہتے ہیں، یا جو اپنے لیے شخصیت گر (PERSONALITY BUILDER) بن کر ہر میدان میں تماشائے فردِ واحد (ONE MAN SHOW) دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ شخص نفسیاتی لحاظ سے معیاری صحت و توازن کا ایک نایاب نمونہ ہے اور اس کا سارا جہاد ایک ایسے اصول، آئیڈیل اور آئیڈیالوجی کے لیے ہے جس کے فکری و عملی تقاضوں کی کشمکش سے اس نے اپنے ذہن کو کبھی قرار نہیں دیا۔ وہ اپنی ذات کی تعمیر میں نہیں، تاریخ کی تعمیر میں مصروف ہے۔

مودودی کی شخصیت پر قلم اٹھانے کا حق مجھے پہنچتا ہے لیکن میرے لیے سب سے بڑی پیچیدگی یہ اندیشہ ہے کہ میں چونکہ اس شخصیت کے ساتھ گہری محبت رکھنے والوں، اس سے ہر طرح کا استفادہ کرنے والوں اور اس کی مشفقانہ رفاقت میں برسوں سے کام کرنے والوں میں سے ایک فرد ہوں، اس لیے اگر میں کچھ لکھوں گا تو چاہے وہ مبالغہ سے کتنا ہی پاک اور قصیدہ آرائی سے کتنا ہی بالاتر کیوں نہ ہو، اس پر "مریداں می پرانند" کا فقرہ بآسانی چسپ کیا جا سکتا ہے۔ مگر جب واقعہ یہ ہے کہ یہاں کوئی "پیر" ہے جو "مریدوں" کی بے پر کی اڑائی ہوئی باتوں کے بل پر اڑنے کا آرزومند ہو، نہ کوئی مرید ہیں جو کسی بے بال و پر "پیر" کو اڑانے کے درپے ہوں تو سوچتا ہوں کہ آخر میں کیوں دین و ملت، زبان و ادب اور تاریخ وقت کی ایک ایسی خدمت انجام دینے سے باز رہوں جس کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ اپنی استطاعت کی حد تک اسے ادا کر سکتا ہوں یہ شخص جو منبر سے دار تک کے ہر مرحلے سے گزر گیا ہے اور جس کا نام لاکھوں افراد کی زبانوں پر ہے، لوگ اسے جاننا بھی تو چاہتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ کیا ہے۔ اس سوال کا جواب اگر اسے جاننے والے ——— قریب سے جاننے والے ——— برسوں ساتھ رہ کر جاننے والے بھی نہ دیں گے تو اور کون دیگا! لوگ اس کے متعلق متضاد باتیں سنتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کا بے مثل مفکر ہے اور وہ ایک رجعت پسند ملا ہے، وہ موجودہ نظام کو بدل ڈالنے کے

لیے زور کر رہا ہے اور وہ جاگیرداروں کا حامی ہے! وہ اسلامی دستور چاہتا ہے اور وہ ملک کا غدار ہے! وہ امریکی ایڈ کا مخالف ہے اور وہ امریکہ سے خفیہ ایڈ حاصل کر رہا ہے! — ان متضاد باتوں کے درمیان لوگ سے بکتے ہو کر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پھر آخر اصل حقیقت کیا ہے۔ مان لینا چاہیے کہ مودودی صاحب جیسے افراد کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے، وہ سب سے زیادہ معروف ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ نامعلوم! وہ سب سے زیادہ قریب بھی ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ دور بھی! وہ سب سے بڑھ کر آشنا بھی ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اجنبی بھی! وہ انسانیت کے اول درجہ کے خادم ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ پہلے درجے کے مجرموں میں شمار کیے جاتے ہیں ایسے افراد کو اس مظلومی سے پوری طرح تو بچایا نہیں جا سکتا، تاہم ان کو جاننے پہچاننے والوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ نہ جاننے والوں کو صحیح معلومات بہم پہنچائیں۔

میں ان سطور کو لکھتے وقت اس فتنہ سے پوری طرح خبردار ہوں جسے شخصیت پرستی کہا جاتا ہے (HERO WORSHIP) لیکن کوئی بھی شخص جو پورے شعور کے ساتھ ایک مرتبہ خدا پرستی اختیار کر لیتا ہے وہ پھر کبھی کسی دو پرستی میں مبتلا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے جذبات عبودیت کے لیے ایک ہی بارگاہ پالی ہے اور اب اس پر میرا ایک سجدہ مجھے ہزاروں سجدوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ دوسرے خود مولانا مودودی کی تعلیم و تربیت سے جو چیزیں ان کے

صاحبوں اور ان کے قدر دانوں اور ان کے محبت کرنے والوں میں نمایاں طور پر پیدا ہو جاتی ہیں اُن میں سے ایک یہی ہے کہ شخصیت[1] پرستی کی پستی سے آدمی بسا بلند ہو جاتا ہے۔ تیسری اہم حقیقت یہ ہے کہ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو اقبال کے پیغام کی روشنی میں اقدام کرتے کرتے مودودی تک آ پہنچے ہیں اور جنہوں نے مودودی سے اوّلین تعارف ہوتے ہی یہ محسوس کیا کہ وہ "دگر دانائے راز" یہی ہے جس کے نمودار ہونے کی دلی حسرت[2] اقبال کے لبوں پر آخری گھڑیوں میں

---

[1] میں نے اور میری طرح کے بہت سے اور لوگوں نے مولانا مودودی کے مقابلے میں اپنے نظریات کی سرزمین کے ایک ایک چپے پر دفاعی جنگ لڑی ہے، اور ایسے ہی لوگوں کو خود مولانا نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہم لوگوں نے شعبدے اور کرامات دیکھ کر بیعت نہیں کر لی، بلکہ جو کچھ مانا ہے عقل و استدلال کے محاذ پر لڑ کر مانا ہے اور آئندہ بھی ہم سے جو کچھ منوایا جا سکتا ہے اسی طرح منوایا جا سکتا ہے۔

[2] اقبال جیسا حقیقت شناس آدمی تاریخ اور معاشرۂ انسانی کے قوانین کی روشنی میں خوب سمجھتا تھا کہ جن شعور کی شعاعیں میں نے ماحول میں بکھیر دی ہیں اور جن جذبات کو میں نے چھیڑ دیا ہے وہ اب علمی میدان میں ایک تحریک کی شکل اختیار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اس تحریک کے لیے کوئی نہ کوئی شخصیت ایک پیغام انقلاب کے اٹھے گی۔ چنانچہ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اقبال مرحوم اپنے آخری ایام میں نوجوان نسل کو پیش نظر نصب العین کے لیے تیار کرنے کی جو اسکیم بنا رہے تھے اس کے لیے واحد رفیق کار جو انہوں نے منتخب کیا وہ مولانا

آئی اور جس کے لیے اس نے دعا کی تھی کہ:

اگر می آید آں دانائے رازے
بدہ او را نوائے دلنوازے
ضمیر امتاں را می کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

اقبالؒ کے چشمۂ فکر پر پوری طرح سیراب ہو جانے کے بعد کوئی شخص مشکل ہی سے شخصیت پرست ہو سکتا ہے!

میری دوسری مشکل یہ ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت پر مجھ جیسا قریبی آدمی اگر چند سرسری تاثرات دے کر رہ جائے تو اس سے بڑی مایوسی ہوگی لیکن اگر میں مطالعۂ شخصیت کا حق ادا کرنا چاہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شخصیت سے فکر و عمل کی کئی دنیائیں پے بہ پے ظہور پذیر ہو رہی ہوں، جس نے زندگی کے ہر مسئلے اور ہر موضوع پر بے شمار لٹریچر میدان میں ڈال دیا ہو، جس نے ایک ہمہ گیر تحریکِ تعمیر اٹھا کھڑی کی ہو اس کا مطالعہ کس گوشے سے کس طرح شروع کر کے کس پہلو پر جا کر کس طرح ختم کیا جائے۔ پھر اس کام کے لیے بڑا وقت چاہیے جو مجھے میسر نہیں۔ بہت سوچا، بہت سوچا، آخر یہ ٹھانی کہ جس موقع پر جتنا کام

مودودی نے اقبال ہی کے بلاوے پر مولانا پنجاب آ گئے، مگر ادھر خود اقبال کو عالمِ جاوید سے بلاوا آ پہنچا۔

ممکن ہو اتنا کر دینا چاہیے اور بقیہ کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔ سو اب
سامنے میہماں کے جو کچھ تھا میسّر رکھ دیا! غالبؔ

بڑے آدمی

بڑے آدمی کون ہوتے ہیں؟ ان کی تعریف کیا ہے؟ ــــ اس سوال کے مختلف جواب سوچے جا سکتے ہیں، مگر تمام ممکن جوابات کا اگر کوئی جوہر نکالا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ہر وہ فردِ انسانی جو انسانیت کو خیال اور عمل کے کسی بھی دائرے میں اپنے پاس سے کچھ دے کے جاتا ہے، جو زندگی کو نئی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں سے آراستہ کرتا ہے، جو تاریخ کی شاہراہ پر نئے نقوشِ قدم بناتا اور نئے چراغ روشن کرتا ہے، بڑے آدمیوں کی صف میں شامل ہے۔ جو لوگ دوسروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انسانیت کے پچھلے کارناموں سے نفع اندوز ہوتے ہیں، لیکن جواب میں انسانیت کی کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے الٹا اسے چرکے لگانے میں عمریں گذار دیتے ہیں (اور ایسے لوگ مجرموں سے لے کر وزیروں، لیڈروں، صحافیوں اور ادیبوں تک کی صفوں میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں)، وہ بنی نوع انسان کا سب سے ذلیل اور گھٹیا عنصر ہوتے ہیں۔ اُن سے اوپر دوسرا عنصر آتا ہے جو جتنا فائدہ انسانی کارناموں سے اٹھاتا ہے، اپنی صلاحیتوں کی حد تک اس کے جواب میں زندگی کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر وہ خال خال پائے جانے والے افراد ہمارے سامنے آتے ہیں جو جتنا کچھ لیتے ہیں اُس سے کئی گنا زیادہ دیے کے جاتے ہیں اور وہ کچھ دیے کے جاتے ہیں جو ہر آدمی کے پاس نہیں پایا جاتا انہی کو ہم بڑے لوگ کہتے ہیں۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت کا ایک نمایاں مقام اسی آخری قسم کے خال خال پائے جانے والے افراد کی صف میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو مجھ سے اختلاف ہو، وہ اپنے اختلاف پر قائم رہ سکتے ہیں، میں اپنی رائے دوسروں سے منوانے کے لیے یہ سطور نہیں لکھ رہا، نہ میری زندگی کے مشن کا یہ کوئی جزو ہے کہ میں مودودی کی عظمت دوسروں سے تسلیم کراؤں!

مودودی میرے نزدیک ویسا ہی گوشت پوست کا ایک متحرک پیکر ہے جیسے پیکر اس کرۂ ارضی پر اربوں کی تعداد میں زندگی کی راہ پر رینگ رہے ہیں۔ میں اسے کوئی فوق الانسانی مخلوق نہیں سمجھتا، میں اسے ایک معصوم اور بے عیب ہستی نہیں مانتا، میں اسے تنقید سے بالاتر تسلیم نہیں کرتا، میں اسے یہ حق نہیں دیتا کہ وہ میری خودی کا خراج مجھ سے لے سکے، میں اس کے سامنے اختلاف رائے کے فطری حق سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا، میں اسے ایک بُت بنا کر پوجنے پر تیار نہیں ہوں بلکہ اگر وہ میرے ذہن میں بُت بن کر رہنا چاہے تو میں اسے ایک آن میں چور چور کر کے رکھ دوں۔ البتہ میں اس کا احترام کرتا

ہوں، اُس کی عزت میرے دل میں ہے، میں اُس سے محبت رکھتا ہوں کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس کچھ نہ کچھ ایسا ہے ___ بہت کچھ ایسا ہے ___ جو میرے پاس نہیں ہے، وہ میں نے اس سے لیا ہے اور اس سے لینا ہے، وہ مجھے کسی اور سے نہیں مل سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس وہ کچھ ہے جو میرے ملک کو، میری قوم کو، میرے معاشرے کو، اور کرۂ ارضی پر بسنے والی میری محبوب انسانی برادری کو اُس سے لینا ہے۔ بس یہی چیز ایک بڑے آدمی کی علامت ہوتی ہے اور یہی دوسروں کو مجبور کر دیتی ہے کہ اسے بڑا آدمی مانیں۔ اور یہی چیز ہوتی ہے جس کے لیے بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے، ان کی شخصیتوں کو کریدا جاتا ہے، ان کی تحریروں کو پڑھا جاتا ہے، ان کے کارناموں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ بڑے لوگوں سے ہماری کوئی دلچسپی ہے تو صرف یہ ہے کہ کیا کیا استفادہ ہم اُن سے کر سکتے ہیں، اُن کی سیرت اور ان کے کارنامہ حیات میں ہمارے لیے کیا ہے، انسانیت کے لیے کیا ہے، زندگی کے لیے کیا ہے؟ وہ ہمارے امن و مسرت کے خزانہ میں کیا دے سکتے ہیں، وہ ہماری ترقی میں کیا مدد بہم پہنچاتے ہیں، وہ ہماری قوتوں میں کونسا اضافہ کرتے ہیں۔ اس مدعا سے ہٹ کر محض اکابر پرستی (HERO WORSHIP) کے گھٹیا ذوق کی تسکین میں جا پڑنا دنیا کے فضول ترین کاموں میں سے ہے۔

البتہ صاف بات یہ ہے کہ میں کسی کی غلط فہمی کے اندیشے سے مودودی

کے متعلق اپنے گہرے اور حقیقی تاثرات کو مصنوعی جھوٹے انکسار کے خول میں چھپا کر پیش نہیں کر سکتا۔

اس شخصیت کا عنوان

مودودی کی شخصیت کو اگر ہم کوئی عنوان دینا چاہیں تو اس میں بڑی مشکل پیش آتی ہے وہ بیک وقت ایک اونچا مصنف، ایک ادیب، ایک عالم دین، ایک ماہر تعلیم، ایک انقلاب پسند داعی، اور ایک سیاسی لیڈر ہے تاہم میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہم اسے ایک انقلابی مفکر (REVOLUTIONARY THINKER) قرار دے کر اس کی خدمات کے بہت سارے پہلوؤں کو ایک عنوان کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔

سوچتا ہر انسان ہے، مگر ہر سوچنے والے کو مفکر نہیں کہہ سکتے۔ مصنف ہمارے اندر بے شمار ہیں مگر ہر مصنف کو ہم مفکرانہ بلندی پر نہیں رکھ سکتے۔ لیڈروں کی ہمارے درمیان کمی نہیں۔ مگر ہر لیڈر کے ذہن سے کسی جامع فکر کے جھرنے نہیں پھوٹتے۔ کسی دور اور کسی ملک و قوم کے حالات میں مفکرانہ عظمت تک صرف وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو سوچنے کی عامیانہ اور پٹی ہوئی راہوں کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک خاص اصولی و مقصدی نقطۂ آغاز سے چلتے ہیں اور اپنی سمت سفر اپنے اصول و مقصد کے کمپاس کے ذریعے متعین کر کے سوچنے کی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔ جینے ہوئے حالات

فریم میں اپنے ذہن کو نصب رکھ کر ہر آدمی سوچتا ہے لیکن یہ سوچنا سوسائٹی اور انسانیت کو کچھ نہیں دے سکتا۔ بنے ہوئے حالات کے فریم کو توڑ کر ان حالات کا ناقدانہ جائزہ کسی خاص درجے کی ذہنی بلندی سے لیتے ہوئے سوچنا وہ سوچنا ہوتا ہے جو فکر و عمل کی نئی دنیائیں بنا کے انسانیت کے سامنے رکھتا ہے، اور یہی سوچنا ہے جو کسی سوچنے والے کو مفکرانہ مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ مولانا مودودی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے بنے بنائے حالات کے اندر اپنے آپ کو رکھ کر سوچا ہو اور یہ سوچا ہو کہ ان حالات میں بہتر سے بہتر جگہ کیسے بنائی جا سکتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ماحول کے مسلّمہ بند قدری پیمانوں خیر و شر کی تقسیم کے معیاروں اور فکر و نظر کے زاویوں پر اندھا ایمان لا کر اپنی ذہنی قوتوں کو حرکت میں لاتے ہیں اور اپنے سارے فکری کارنامے اس اہتمام سے سرانجام دیتے ہیں کہ وہ ان پیمانوں، معیاروں اور زاویوں کے لحاظ سے قابل قدر ٹھہریں۔ مولانا مودودی اپنے ماحول، اپنے معاشرے اور اپنے گرد چھائے ہوئے حالات کے فکری قفس کو توڑ کر کھلی فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے اس قفس کا، اس کی تیلیوں کا اور اس کے اندر پھڑپھڑانے والے طیور پر شکستہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی آزادانہ فکر ایک بجلی بن کر اس قفس کو پھونک ڈالنے کے لیے چمکتی ہے، ان کی فکر طیور پر شکستہ کو نئے بال و پر دینا چاہتی ہے، وہ قفس کی جگہ ایک نیا شاداب چمن آراستہ کر دینا چاہتی ہے۔ مولانا مودودی

ماحول سے سکہ بند پیمانوں، تاریخ کے مُہر کردہ معیاروں اور معاشرہ کے بنائے ہوئے فرسودہ زاویوں پر ایمان لانے سے انکار کر کے سوچتے ہیں۔ وہ ان کے بالمقابل دوسرے پیمانے، دوسرے معیار اور دوسرے زاویے رائج کرنے کے لیے سوچتے ہیں۔ اس طرح جب کبھی کوئی شخص بنی بنائی دنیا کو قبول کرنے سے انکار کر کے ایک نئی دنیا کا نقشہ سوچنے لگ جاتا ہے تو اسے ہم "انقلابی مفکر" قرار دیتے ہیں۔

مربوط اور جامع فکر

مولانا مودودی کا مفکرانہ کارنامہ کیا ہے؟

زندگی کے مختلف اجزا کو الگ الگ رکھتے ہوئے، ان میں سے کسی ایک دو، چار کے متعلق ہر ذہین آدمی سوچ لیتا ہے اور بڑے کام کی باتیں سوچ لیتا ہے جن سے زندگی مستفید ہوتی ہے بےشمار جج، وکلا، صحافی، شعرا، ادیب، مصنف، اساتذہ، فلسفی اور لیڈر ہر معاشرے میں اسی طرح کی فکری خدمات انجام دے کر ذریعۂ ترقی بنتے رہتے ہیں لیکن زندگی کو ایک کُل کی حیثیت سے سامنے رکھ کر سوچنا، اس کے تمام کے تمام اجزا کو مربوط صورت میں اکائی قرار دے کر سوچنا، اس کے ہر پہلو کو اس شعور سے سوچنا کہ یہ دوسرے پہلوؤں پر اثر ڈال کر اور ان سے اثر لے کر کام کر رہا ہے یہ ہر ذہین آدمی کا کام نہیں ہوتا۔ اس کارنامے کے لیے بڑی ہمہ گیر نگاہ درکار ہوتی ہے، اس کے لیے زندگی کی وسعتوں کا احاطہ کر لینے والا ذہن درکار ہوتا ہے، اس

کے لیے آدمی کے علم کا پیمانہ سمندر کا سا ہونا چاہیے۔ مولانا مودودی کی خصوصیت یہی ہے۔ وہ زندگی کے کسی ایک مسئلے اور کسی ایک پہلو پر محدودیت نظر کے ساتھ غور نہیں کرتے بلکہ وہ کسی جزئی سے جزئی مسئلے پر بھی لکھتے یا بولتے ہیں تو اسے ہمیشہ کل کے اندر رکھ کر سوچتے ہیں۔ انسانی زندگی کی ایک جامع اسکیم کا فریم ان کے پاس ہے جس میں کسی مسئلے کی ٹھیک جگہ متعین کرنے کے بعد ہی وہ اظہار رائے کرتے ہیں۔ انہیں کہیں بھی جزئی مسائل کی فکر نہیں ہوتی، ہمیشہ اپنی جامع اسکیم کے فریم کی سلامتی کا وہ خیال رکھتے ہیں۔ متفرق چیزوں پر سوچنا اور متفرق خیالات دے جانا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ بڑا کارنامہ ہمیشہ ایسے سوچنے والوں کا ہوتا ہے جو نظریہ و فکر کا ایک ننھا سا بیج لیتے ہیں، اس سے ایک کونپل پھوٹتی ہے، وہ تنا بنتی ہے، تنے سے شاخیں نمودار ہوتی ہیں، شاخوں سے پتے، پھول اور پھل ظہور پانے لگتے ہیں۔ یوں وہ ہتھیلی پر جو باغ کا باغ ”جما“ لیتے ہیں، اس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی کونپل اور کسی حقیر سی پتی پر بھی آپ ان کے خیالات کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے سارے باغ کو سامنے رکھ کر اس کونپل اور اس پتی پر کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہوتے ہیں جو کہیں سے کوئی ٹہنی توڑ لاتے ہیں، کہیں سے کچھ پتیاں اکٹھی کر لیتے ہیں، کہیں سے دو چار پھول حاصل کر لیتے ہیں اور ان سب کو اکٹھا کر کے ایک فکری گلدان میں سجا دیتے ہیں۔ ٹہنی سرو کی ہے تو پتیاں برس کی اور پھول نرگس کے! اب وہ

اپنے گلدستہ کے ایک ایک جزو پر خیالات — اور قیمتی خیالات — کا بڑا قیمتی یادگاری سرمایہ چھوڑ جائیں گے۔ مگر زندگی کوئی گلدستہ تو ہے نہیں، زندگی تو ایک مربوط شے ہے، وہ جڑ سے لے کر کونپل تک ایک ہی مجموعی وجود رکھتی ہے اسے بدلو گے تو پورا بدلو گے، قائم رکھو گے تو مجموعی طور پر قائم رکھو گے کسی درخت کی جڑیں کسی کا تنا، کسی کی شاخیں، کسی کے پھول پتے جمع کر کے تم زندگی کا ایک نیا درخت نہیں اگا سکتے، نیا درخت تو ہمیشہ کسی نئے نظریے سے اُگے گا جو اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لے کر آئے گا، ٹھیک اسی طرح مودودی کی فکر ایک نظریہ سے اُگ کر اپنے تنے پر کھڑے ہونے والے، اپنی شاخیں اپنے اندر سے نکالنے والے اپنی کونپلیں اور پھل پھول اپنے فطری تقاضوں کے مطابق خود بہم پہنچانے والے اور اپنی ہی جڑوں سے غذا حاصل کرنے والے ایک مکمل درخت کی سی ہے۔ درخت — زندگی کا درخت!! درخت! — اسلامی زندگی کا درخت!!!

مودودی کے وسیع لٹریچر کے مطالعہ کو نکلیے تو آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ ایک آدمی، اتنا زیادہ مصروف آدمی، پچاس برس کی عمر میں اتنا ٹھوس، علمی اور معیاری لٹریچر اتنی ضخامت کے ساتھ کس طرح مرتب کر ڈالتا ہے۔ یہ لٹریچر اسلام کے بارے میں ایک انسائیکلوپیڈیائی علم کا مظہر ہے۔ مگر صرف لٹریچر کی وسعت اور ضخامت ہی حیران کن نہیں، اور زیادہ تعجب میں ڈالنے والا وہ غیر معمولی تنوع ہے جو بحث و فکر کے موضوعات میں پایا جاتا ہے۔ عقاید اور نظریات، اخلاق اور سیرت

قانون اور دستور، سیاست اور معیشت، معاشرت اور تمدن، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ
نظامِ تعلیم اور کلچر، ادب اور آرٹ، فقہ اور قضا، سرمایہ داری اور اشتراکیت، نیز سیاسی
اور سیکولر ڈیموکریسی، نیشنلزم اور انٹرنیشنلزم، سود اور بینکنگ، مالیات اور
تجارت اور سیاست کے وقتی مسائل اور دوسرے بے شمار موضوعات پر نہ صرف
معلومات، بلکہ ان کے ساتھ اجتہادی نقطۂ نظر، اجتہادی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ
ایک جذبۂ انقلابیت، پڑھنے والوں کو مودودی کے ہاں سے ملتا ہے۔ سب سے
بڑا کمال یہ کہ زندگی کے مختلف شعبوں، پہلوؤں، موضوعات اور مسئلوں پر ہزاروں
صفحات کا یہ لٹریچر جس فکر کو سامنے لاتا ہے وہ ایک ہی نظریے کے سرچشمے
ظہور پاتی ہے۔ تمام کی تمام متفرق بحثیں ایک ہی جڑ سے پھوٹتی ہیں۔ ایک ہی تصور
ہر جگہ بول رہا ہے۔ ایک ہی آئیڈیالوجی کی روشنی ہر جگہ پھیلی نظر آتی ہے۔ اس
دفتر کے دفتر کا شیرازہ ایک ہی طرزِ فکر نے باندھ رکھا ہے۔ یہ ہے وہ وجہ عظمت
جس نے مودودی کو ایک امتیازی درجے کا مفکر بنا دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس
طرز کا کوئی مفکر ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے اب تک کوئی
پیدا ہوا ہے۔ ہمارے دور کا یہ مفکر پوری کائنات کو ایک منظم واحد ادارے
کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اس کے اندر فطرتِ انسانی کی ایسی جگہ تجویز کرتا ہے
کہ وہ کائناتی کُل کے ساتھ بالکل ہم آہنگ رہے۔ پھر انسان کی پوری کی پوری قومی
تاریخ کو وہ بسا اوقات سوچتے وقت اس طرح سامنے رکھ لیتا ہے جس طرح جغرافیہ

کمال

کا ایک معلم کرۂ ارضی کے ماڈل کو اپنی میز پر رکھ لیتا ہے، اس ہزار ہا سالہ تاریخ کے کسی بھی دَور کو وہ باقی سارے اَدوار سے مربوط رکھ کر زیرِ غور لاتا ہے، پھر اس دَور کے اندر اگر کسی ملک، قوم اور معاشرے کو وہ دیکھتا دکھاتا ہے تو دَور کی پوری بیک گراؤنڈ کے ساتھ۔ وہ اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کو لے گا تو اس کے پورے نقشے میں لے گا۔ آدم تا ایں دم وہ حقیقت کو ایک ہی پاتا ہے۔ اُس کا ظرفِ مکان اور اُس کا ظرفِ زمان دونوں بہت ہی وسیع ہیں، مگر نہ اتنے کہ وہ ایک تخیلاتی آفاقیت میں کھو کر رہ جائے۔ وہ عملی آدمی ہے اس لیے وہ جہاں ایک طرف وسعتِ نظر اتنی زیادہ رکھتا ہے وہاں دوسری طرف توجہ کو جس پوائنٹ پہ چاہتا ہے پوری طرح مرتکز (FOCUS) کر کے رائے قائم کرتا ہے۔ آئیے ہم اس کے جامعانہ زاویۂ نگاہ کو اس کی اپنی دو ایک عبارتوں میں سے خود اخذ کریں:

"کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل اور جدا جدا اجزا پر مشتمل نہیں، بلکہ وہ ایک کل ہے جس کے تمام اجزا ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ زمین کا ایک ذرہ مریخ اور عطارد کے ذرات سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا میرے سر کا ایک بال میرے ہاتھ کے ایک ناخن سے رکھتا ہے۔ گویا پوری کائنات ایک جسدِ واحد ہے اور اس کے اجزا میں باہم ویسا ہی ربط ہے جیسا ایک جسم کے اجزا میں ہوتا ہے۔ پھر جس طرح کائنات کے اجزا میں ربط اور تسلسل ہے، اسی طرح ان واقعات میں بھی ربط اور

تسلسل ہے جو اس کائنات میں پیش آتے ہیں۔ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ بجائے خود ایک مستقل واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام کائنات کے سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی ہے اور اُس کلی مصلحت کے تحت صادر ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر خداوند عالم اپنی اس غیر محدود سلطنت کو چلا رہا ہے۔" (تفہیمات حصہ اول، مضمون "کوتاہ نظری" ص ۱۴۱)

"آپ دیکھیں گے کہ سارا عالم اور اس کا ایک ایک ذرہ ایک زبردست نظام میں جکڑا ہوا ہے، اور ایک قانون ہے جس پر خاک کے ایک ذرہ سے لے کر آفتاب عالم تاب تک ساری کائنات طوعاً وکرہاً عمل کر رہی ہے۔ کسی شئے کی مجال نہیں کہ اس قانون کے خلاف چل سکے۔ جو چیز اس سے ذرہ برابر سرتابی کرتی ہے وہ فساد اور فنا کی شکار ہو جاتی ہے۔ یہ زبردست قانون جو انسان، حیوان، درخت، پتھر، ہوا، پانی اجسام ارضی اور اجرام فلکی سب پر یکساں حاوی ہے، ہماری زبان میں فطرت یا قانون قدرت کہلاتا ہے۔ اس کے ماتحت جو کام جس چیز کے سپرد کر دیا گیا ہے وہ اس کے کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ ہوائیں اس کے اشارے پر چلتی ہیں، بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے، پانی اس کے فرمان سے بہتا ہے، سیارے اس کے اشارے سے حرکت کرتے ہیں،۔۔۔۔ جس چیز کو ہم زندگی، بقا اور کون کہتے ہیں وہ دراصل نتیجہ ہے اس قانون کی اطاعت کا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک [illegible] ترتیب [illegible] رسالہ [illegible]

[illegible] ملاحظہ فرمائیے:

یہ بات تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر چیز ایک قانون کی پابند ہے ... ایک بہت بڑے مدبر کا بنایا ہوا قانون ہے۔ ساری کائنات اور کائنات کی ہر چیز اس حکم کی تابع اور فرماں بردار ہے کیونکہ وہ اس کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت و فرماں برداری کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے کیونکہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ خدا کی اطاعت و فرماں برداری کو اسلام کہتے ہیں۔ سورج اور چاند اور تارے سب مسلم ہیں۔ زمین بھی مسلم ہے۔ ہوا اور پانی اور روشنی بھی مسلم ہیں۔ درخت اور پتھر اور جانور مسلم ہیں اور وہ انسان بھی جو خدا کو نہیں پہچانتا، جو خدا کا انکار کرتا ہے، جو خدا کے سوا دوسروں کو پوجتا ہے، جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیراتا ہے، ہاں وہ بھی

اپنی فطرت اور ودیعت کے لحاظ سے مسلم ہی ہے، کیونکہ اس کا پیدا ہونا، زندہ رہنا اور مرنا سب کچھ خدائی قانون ہی کے ماتحت ہے۔ اس کے تمام اعضا اور اس کے جسم کے ایک ایک رونگٹے کا مذہب اسلام ہے، کیونکہ وہ سب خدائی قانون کے مطابق بنتے، بڑھتے اور حرکت کرتے ہیں۔" (رسالۂ دینیات۔ صفحہ ۱۰-۱۱)

یہ ہے وہ وسعتِ نظر، یہ ہے وہ جامع نگاہی، یہ ہے وہ آفاق گیری جس کے ساتھ ایک نظریۂ حیات کو جب مودودی پیش کرتا ہے تو وہ ایک عظیم مفکر کی حیثیت پا لیتا ہے۔ وہ اسلام کو اس حیثیت سے نہیں سامنے لاتا کہ یہ اس کا ذاتی مذہب ہے، یا جس قوم میں وہ پیدا ہوا وہ اپنے آپ کو اس سے نسبت دیتی ہے، بلکہ وہ اپنے اس محبوب نظریے کو اس قدر و قیمت کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہی ساری کائنات کا دین و مسلک ہے۔ یہ وہ حقیقتِ عظمیٰ ہے کہ جمادات، نباتات، حیوانات سبھی پر چھائی ہوئی ہے اور اسی حقیقت کی گہری چھاپ انسانی فطرت پر پڑی ہوئی ہے۔ یہ سارے کا سارا کاروانِ وجود بالکل ہم رنگ، ہم مسلک اور ہم آہنگ ہے۔ وہی بات کہ

ما ہمہ یک دودمانِ نار و نور
آدم و مہر و مہ و جبریل و حور (اقبالؒ)

مولانا مودودی انسانی زندگی کو ایک کل مانتے ہیں، ایک وحدت۔۔۔

ناقابلِ تقسیم وحدت قرار دے کر اس پر غور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسے مختلف خانوں میں بانٹ کر ہر خانے کو الگ الگ نظریوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیے اور زمانے کی لکیریں ان کے نزدیک فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو، اس کے خیر و شر کو، اس کے معروف و منکر کو نہیں بدل ڈالتیں۔ ذرائع و وسائل کا ارتقا اخلاقی ضابطوں کو متغیر نہیں کر دیتا۔ فطرتِ انسانی کی مستقل ساخت اُن کے نزدیک ساری تاریخِ انسانی کو ایک مربوط شے بناتی ہے، حق اور باطل یا اسلام اور جاہلیت دو کردار ہیں جو اپنی کشمکش شروع سے آخر تک ہر قسم کے حالات میں جاری رکھے ہوئے ہیں اور انہی کی وجہ سے یہ کہانی ایک مسلسل کہانی بنتی ہے۔ ان حقیقتوں کو مختلف مواقع پر انہوں نے مختلف پیرایوں میں نمایاں کیا ہے۔ یہی نقطۂ نظر ہے جس کے تحت وہ تاریخ میں امامت (LEADERSHIP) کے انقلاب کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:-

"ٹھیک اسی طرح اس کا ایک اور قانون بھی ہے جو ہماری تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر، ہمارے گرنے اور اُٹھنے پر، ہماری ترقی اور تنزل پر، ہماری ذاتی، قومی اور ملکی تقدیروں پر حکومت کر رہا ہے . . . . . خدا کے اس قانون کی پہلی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا۔ مالک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے، اس کو زیادہ سے زیادہ

سنوارا جائے، اس کے دیئے ہوئے ذرائع اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اس کی دنیا بگاڑی جائے، اجاڑی جائے، اور اس کو بدنظمی سے، گندگیوں سے اور ظلم و ستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظر انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ انہی کو وہ یہاں کے انتظامات کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔ پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا ہیں۔ جب تک ان کا بناؤ بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا امیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور ان سے کم بگاڑنے والا میدان میں موجود نہیں ہوتا اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے سارے قصوروں کے باوجود دنیا کا انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں تو خدا انہیں اٹھا کر پرے پھینک دیتا ہے اور دوسرے امیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔

(تقریر بناؤ اور بگاڑ - مئی ۱۹۴۷ء)

یہ تقریر شروع سے آخر تک تاریخ کی اسی تعبیر کی تشریح ہے اور مخاطبین کو واقعات و شواہد کی روشنی میں اس سنت الٰہی سے آگاہ کرکے ان سے چاہا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نیابت کی صلاحیتوں سے آراستہ کریں۔

ان اقتباسات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مودودی کی فکر ایک ہمہ گیر مرتب اور مربوط فکر ہے۔ وہ ذہنی سانچہ ہی ایسا وسیع ہے کہ ساری کائنات، ساری انسانیت، ساری تاریخ اور ساری زندگی کو اپنے اندر لے کر پھر غور و فکر کا آغاز کرتا ہے۔ اس ذہنی سانچے میں جب اسلام کو رکھا جاتا ہے تو وہ بھی ایک منظم اور مربوط نظام کی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔ ذرا دیکھیے یہ چند سطریں:-

"اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہ ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں ادھر اُدھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں۔ بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصول پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں اُن سب کی رُوح اور ان کا جوہر اس کے اصولِ اوّلیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اصولِ اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح

نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنا اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔" (اسلام کا نظریۂ سیاسی صفحہ ۵)

ان الفاظ میں مودودی نے خود اپنے فکر کی جامعیت کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اسی ہمہ گیرانہ اور جامعانہ اسلوب سے وہ جب کسی اُلجھے ہوئے مسئلے کو چھیڑتا ہے تو ایک جزئی غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے ہمیں پورے سسٹم میں وہ خاص مسئلہ رکھ کے دکھاتا ہے۔ وہ "پردہ" کے پامال موضوع کو چھیڑے گا تو پورے کے پورے اسلامی معاشرتی نظام کو دنیا بھر کے معاشرتی نظاموں کے مقابلے پر رکھ کر پھر ہمیں دکھائے گا کہ اس نظام میں پردہ کی جگہ کیا ہے اور کیوں ہے اور اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو کس طرح اصول و مقاصد کا سارا ڈھانچہ پیوند زمین ہو کے رہ جائے گا۔ وہ "سود" کی حرمت پر بات چھیڑے گا تو ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کا تفصیلی نقشہ سامنے لا کر بتائے گا کہ اس نظام کو مفاسد سے مالامال کرنے میں سود کا پارٹ کیا ہے اور دوسری طرف اسلامی نظامِ معیشت کا خاکہ کھینچ کر دکھائے گا کہ اس کے اندر سود کے لیے سرے سے کوئی جگہ نہیں نکلتی اور زبردستی نکالی جائے تو اس خاکہ کے سارے مقاصد غارت ہو کر رہ جائیں گے۔ اسی طرح وہ اگر اسلام تلوار سے

چیلاٹ کے شر انگیز اعتراض کا جواب دینے کو قلم اٹھائے گا تو دنیا بھر کے قوانین جنگ کے بالمقابل اسلامی نظریۂ جہاد اور اس کے اصول و قوانین اور اس کے مقاصد و مناہج پر "الجہاد فی الاسلام" جیسی سائنٹفک، ضخیم اور علمی کتاب مرتب کر کے آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ وہ اپنی ایک کتاب "خطبات" (جو کم تعلیم یافتہ دیہاتی عوام کے مطالعہ کے لیے لکھی گئی ہے) میں اسلام کے اجزا کو الگ الگ کر کے دیکھنے اور ان سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرنے والوں کو ایک کلاک کی مثال دیتا ہے کہ جب تک اس کے تمام کے تمام پرزے اپنی اپنی جگہ پر نصب ہوں اور اپنا اپنا کام کر رہے ہوں تو اس کے ڈائل پر مطلوبہ نتیجہ (یعنی وقت بتانا) نکلتا رہے گا، لیکن اگر اس کے پرزوں کو کھول ڈالا جائے تو چاہے الگ الگ پرزوں کو لے کر ان کو کتنا پالش کیا جائے اور کتنا ہی تیل دیا جاتا رہے، ڈائل پر کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، بلکہ کسی پرزے کی مقصدیت بھی سمجھ میں نہ آسکے گی۔ اسلام کے کلاک کو کھول کر اس کے پرزے الگ الگ کر کے بلکہ ان کو سائیکل اور سلائی مشین کے پرزوں سے ادل بدل تک کر کے پھر جب لوگ ان میں سے کسی ایک پر غور کرتے ہیں تو ان کو اس تفکر کی ڈور کا سرا نہیں مل سکتا۔ مولانا نے ایک دوسرے مقام پر اسلام کے متعلق فکری انتشار کی اس عام وبا کو کھول کر یوں بیان کیا ہے:

"عام طور پر لوگ جب اسلام کے کسی مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو اس نظام اور سسٹم پر بہ حیثیتِ مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے، بلکہ نظام سے الگ کر کے اس خاص جزء کو بجائے خود جانچنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جزء تمام حکمتوں سے خالی نظر آنے لگتا ہے اور اس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ . . . . اگر آپ پوری عمارت کو دیکھنے کے بجائے صرف اس کے ایک ستون کو دیکھیں گے تو لامحالہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے۔"

(پردہ)

— مودودی کے طریقِ فکر کا امتیاز یہی ہے کہ وہ ایک ایک مسئلے، ایک ایک جزئی حکم، ایک ایک آیت اور ایک ایک حدیث کو مجموعی سسٹم میں اس کی اپنی جگہ پر رکھ کر دکھاتا ہے۔ وہ نظامِ زندگی کی کُل کا ایک ایسا انجینئر ہے جو ایک ایک پرزے کو جب اپنے صحیح مقام پر لگا ہوا اور کام کرتا ہوا سامنے رکھ دیتا ہے تو اس کی حقیقت و مقصدیت پوری پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے۔

جامع نظریے اور زندگی کے نظام دینے والے لوگ ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ اس لیے بڑے ہوتے ہیں اور اسی لیے بڑے مانے جاتے ہیں کہ وہ انسانی معاشروں کو وہ چیز بہم پہنچاتے ہیں جس سے نئے ذہن پیدا ہوتے ہیں، نئے خیالات اٹھتے ہیں، حرکت اور سرگرمی پیدا ہوتی ہے، مقصد

اور نصب العین ہاتھ آتا ہے، تعمیری قوتوں کو کام کرنے کے لیے نقشے ملتے ہیں اور زندگی ایک کل کی طرح مربوط ہو کر متحرک ہو جاتی ہے۔

اسلام کا تعارف بحیثیت نظام و تحریک

مولانا مودودی کی مفکرانہ عظمت کا دوسرا راز یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو صدہا برس کے تباہ کن عوامل کی گرفت سے نکالا اور ایک مذہب اور ملت کی سطح سے اٹھا کر نظامِ زندگی ہونے کا صحیح مقام اسے دوبارہ اس عہدِ الحاد میں پورے عقلی زور کے ساتھ دے دیا۔ جو جو قطع و برید اس کی کی گئی تھی، اس میں جو جو ترامیم، تحریفیں اور تصرفات کیے گئے تھے، اور اس کے عقیدوں، عبادتوں، اخلاقی ہدایات کو سیاست و تمدن سے کاٹ کر جو بے معنی حیثیت دے دی گئی تھی، ان ساری حرکات کے ایک ایک اثر کا ازالہ کر کے اسے "دین" کی حیثیت میں ہمارے سامنے رکھ دیا۔ کمال یہ کہ یہ سارا کام جدید دور کے عقلی اور سائنٹفک معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے۔ خصوصیت سے دین و سیاست کی تقسیم کا جو نظریہ مغرب سے آیا تھا اور اگر ہماری ذہنی فضا پر اثر انداز ہو گیا تھا، اس کے خلاف ملت کے اجتماعی ذہن نے جو کشمکش کی ہے اور جس میں بہت بڑا تاریخی حصہ علامہ اقبال کا بھی تھا اسے کامیاب تکمیل تک مولانا مودودی نے پہنچایا۔ مولانا مودودی کا تصورِ اسلام

زندگی کے سارے مسائل کو اپنے دائرہ میں لیتا ہے اور ان کو اپنے اسلوب
حل کرتا ہے۔ وہ کسی جزئی سے جزئی مسئلے کو اپنے حلقۂ اثر سے مستثنیٰ چھوڑ کر
کسی دوسری طاقت کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی تقسیم
انکاری ہے۔ اس کا نظریۂ توحید الٰہ، وحدت حیات اور وحدت آدم کے
تصورات پر مشتمل ہے۔ بلکہ مودودی کو اسلام کے اسی تصور نے اپنی طرف
کھینچا، ورنہ اس جیسا ذہین انسان بے روح عقیدوں، بے مقصد رسموں
بے معنی حرکتوں کے زندگی سے غیر مربوط مجموعے کے حوالے اپنے آپ کو کر
والا نہ تھا۔ وہ خود کہتا ہے:۔

"اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس
میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (RELIGON) کے
مزعومات بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع
اور نظامِ تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اس کی عبادات محض
پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالانکہ وہ ان ذہنی اور اخلاقی
بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا
نظامِ اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں
کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور
تمدنی لائحہ عمل کو چلانے کے لیے ان عقاید اور ان عبادات کی ضرورت

ہی کیا ہے۔ دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درس گاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہار قدر شناسی تو کر سکتے ہیں مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعین، اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدار دینداری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی، اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا باعث بن رہی ہے۔ اس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دے رہے ہیں۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ صفحہ ۱۴۱)

"اسلام کو جس صورت پر میں نے گردوپیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہو جانے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا کیونکہ میرے اندر تاریخی فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیات قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سر نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے تجویز کردہ لائحہ زندگی (SCHEME OF LIFE) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (ATOM) کی بندش سے لے کر اجرام فلکی کے قانون جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پس درحقیقت میں ایک نو مسلم ہوں۔ خوب جانچ پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے صلاح و فلاح کا

کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اس طرف ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ ہم اس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں ۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۴۱۵)

یوں مولانا مودودی کا تصور اسلام ایک نئی دنیا، ایک پورا عالم قرآنی اپنے اندر لیے ہوئے ہے ۔ اس معاملے میں مودودی کا کام بالکل نیا اور انوکھا نہیں تھا۔ بلکہ اسلام کا یہ جامع تصور ہمارے ملی لٹریچر میں ہمیشہ موجود رہا ہے اور وقتاً فوقتاً اسے ہمارے رجالِ اکابر نکھارتے رہے ہیں ۔ ماضی قریب کے مجدد شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے نظام اسلامی کا مکمل تصور قوم کو دیا ہے ۔ اس دور کے متاخرین میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد اور علامہ اقبال اور دوسرے بے شمار لکھنے اور بولنے والے اسی تصور کی آبیاری کرتے رہے ہیں ۔ مولانا مودودی کا کوئی خاص حصہ اس خدمت میں ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ نے اسلامی تصور نظام کو بالکل ایک سائنس بنا کر دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے ۔ آپ کی تحریروں اور تقریروں میں ایک ریاضیاتی ذہن کارفرما ہے جو ہر حقیقت کو دو اور دو چار کا مسئلہ بنا کر پیش کرتا ہے ۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ مودودی کا تصور اسلام نظریاتی (ACADEMIC)

(ازادی)

نہیں ہے۔ وہ ایک کتابی آدمی اور ایک مصنف اور مقالہ نگار کی طرح اسے پیش نہیں کرتا بلکہ ایک عملی آدمی کے ذہن کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہ عملی ذہن نظام اسلامی کے تخیل میں ایک تحریکیت پیدا کر دیتا ہے یعنی اس کا تصور اسلام ایسا ہے جو اپنے مخالف نظریات و تصورات، ناساز گار ماحول، غلط نظام سیاست و تمدن سے ٹکرانا چاہتا ہے، وہ تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے، وہ ظہور پاتے ہی اپنے سرچشمہ سے بہنا چاہتا ہے اور چٹانوں کو اپنے اندر ریلنا چاہتا ہے۔ یہ تصور ایک ٹھہراؤ رکھنے والی جھیل کی طرح نہیں، ایک بہاؤ رکھنے والے موّاج دریا کی طرح ہے۔ تصور اسلام کو از سر نو اس کی تحریکیت سے مالا مال کر دینا مودودی کا خصوصی کارنامہ ہے۔ اسی سے وہ محض مفکر بننے کے بجائے انقلابی مفکر بنتا ہے مسلمانوں سے اسے گلہ ہے کہ:۔

"انہوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک (MOVEMENT) کے بجائے محض زمانۂ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا ہے"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۸)

اتنا ہی نہیں، مودودی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام کو ایک تحریک کی سطح سے نیچے اتار کر دیکھنے سے اس کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی مشہور تفسیر "تفہیم القرآن" جن خصوصیات کے ساتھ سامنے آئی ہے ان میں مرتبۂ اول کی

امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن کو ایک چلتی ہوئی انقلابی تحریک کے گائڈ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور اسی تحریک کی عملی تاریخ کے مختلف مراحل کے اندر اس کی دقت دقت کی رہنمائی کو رکھ رکھ کر اس کا مفہوم متعین کرتی ہے۔ چنانچہ اس کے بصیرت افروز مقدمہ میں قرآن فہمی کے اصول بیان کرتے ہوئے صاحبِ "تفہیم" نے ایک حقیقت یہ بیان کی ہے کہ :-

" یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں۔ جیسا کہ اس کے مقدمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علمبرداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعئ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے

ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تیئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں، اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔"

(مقدمہ تفہیم القرآن صفحہ ۳۳)

پھر یہ انقلابی مفکر محض تحریکیت کا شعور دلا کر نہیں رہ جاتا، اپنی فکری مہم کے ساتھ ساتھ متوازی طور پر عملی تحریک لے کے چل بھی کھڑا ہوتا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ سارا فکری کام اسی عملی جدوجہد کے لیے کرتا ہے۔ بالعموم مفکرین عملی میدان میں کچھ نہیں کر پاتے، لیکن مودودی ایک ایسا مفکر ہے جو جیسی فکر دے رہا ہے ویسی ہی تحریک بھی برپا کیے ہوئے ہے۔

مسلم قوم پرستی اور اسلام میں تفریق و تمیز

اکثر لوگ اپنی ذات اور خاندان تک سوچ کر رہ جاتے ہیں،

کچھ اور محلے اور پڑوس، شہر اور علاقے کے مسائل سے دلچسپی لیتے ہیں اور اس سے آگے کچھ سوچ نہیں سکتے۔ چیر اور لوگ ہوتے ہیں جو اپنے طبقے اور اپنی پارٹی کی فلاح و بہبود تک نگاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ اس درجے کے محدود تفکر سے کوئی مفکر نہیں بنتا۔ مفکرین کا کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ وہ قوم اور ملک کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھنے والے مسائل کو نگاہ کے احاطے میں لیتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ چوٹی کے مفکرین آتے ہیں جو ساری انسانیت سے اپنا رشتہ جوڑ کر اُن بنیادی حقیقتوں کو سوچتے ہیں جن سے ہر فرد، ہر قوم اور ہر ملک کا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ یہ دَور نیشنلزم کا دور تھا اور اس میں بے شمار قیمتی دماغ اُبھرے لیکن ان میں سے بیشتر کو نیشنلزم نے اپنے محدود قفس میں سے لیا۔ ایک قوم، ایک وطن اور ایک نسل سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکے لیکن اسلام چونکہ ساری نوع انسانی کو خطاب کرتا ہے اور ایک عالمی تحریک اور ایک جہانی نظام ہونے کا مدعی ہے اس لیے اس کا نظریہ جغرافی اور قومی اور نسلی حدبندیوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ قدرتی طور پر ایک حقیقی اسلامی مفکر سے بھی ہم یہی توقع کرتے ہیں کہ وہ قوم پرستانہ سطح سے بلند ہو کر سوچے گا۔ مودودی کا فکری کارنامہ ہماری اس امید کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ وہ سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم اور مسئلہ قومیت لکھ کر جہاں ہندوستانی نیشنلزم سے لڑتا ہے اور بازی جیت کے دکھاتا ہے وہاں وہ پلٹ کر مسلم نیشنلزم کے اوپر اس سے زیادہ تند و تند

کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے جو "قوم پرستی" کے جہانی دور کے زیر اثر آہستہ آہستہ خود مسلمانوں میں پروان چڑھنے لگتا ہے۔ اسلام کو قوم پرستی کے سانچے میں ڈھالنے کی غیر شعوری ابتدا بہت اوپر سے ہو جاتی ہے اور متاخرین میں سے اکثر کو ہم خوشی خوشی طور پر اسی "مسلم قوم پرستی" کا مسحور پاتے ہیں۔ اور تو اور اقبال جیسا مفکر اسلام اور مسلم نیشنلزم کو دیر تک گڈمڈ کر کے چلتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلم نیشنلزم کے جذبات کے راستے ہی اسلام تک پہنچتا ہے۔ بالکل آخری ایام میں آکر وہ اس مسلم نیشنلزم کی کینچلی کو اتار سکا ہے۔ مودودی اپنے وقت کا وہ پہلا شخص ہے جس نے ہمارے اجتماعی عالم افکار کے ان دوگونہ رجحانات کو ایک دوسرے سے جدا جدا کر کے خالص اسلام کو تعین دیا ہے اور مسلم نیشنلزم کے خلاف زبردست فکری معرکہ برپا کر دیا ہے۔ اس کی انقلابی کتاب "سیاسی کشمکش کا تیسرا حصہ" درحقیقت اسی خاص معرکہ کے لیے وقف ہے۔ اس کتاب کی تحریک زا بحثوں کی ایک آدھ جھلک دیکھتے چلیے:۔

"بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (REVIVAL) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسر عروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیاء ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو

مسلم قوم پرستی کی حد تک کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح ہمیں اور ساورکر کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے۔ اسی طرح ان مسلم قوم پرستوں کے لیے اصل سوال اس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جس کے ساتھ ان کی قسمتیں وابستہ ہیں ۔۔۔۔۔ یہ ذہنیت سرسید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے ۔۔۔۔۔ اگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ۔۔۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلک اسلام کے احیاء کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اڑ جاتے ہیں جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۲)

"اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزو

اتنا کم اور قوم پرستانہ جذبہ اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں، حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں۔ اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہ عظیم ہے۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۸)

• "اس (اسلام) کا منتہائے نظر ایک ایسی جہانی ریاست (WORLD STATE) ہے جس میں نسلی اور قومی تعصبات کی زنجیریں توڑ کر تمام انسانوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع ترقی کے ساتھ ایک تمدنی و سیاسی نظام میں حصہ دار بنایا جائے۔"

(مسئلہ قومیت صفحہ ۴۸)

• "بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن (CIVILISATION) بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (WORD NATIONALITY) بنانا چاہتی ہے۔"

ان حوالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مودودی اس دور میں وہ پہلا شخص

بن کر سامنے آیا ہے جس نے اسلام اور مسلم نیشنلزم کی باہمی ترکیب کو شعوری طور پر توڑ ڈالا ہے اور جو اسلام کو مسلمان قوم کے نسلی مسلک و مذہب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے دینِ فلاح کی حیثیت سے لے کے اٹھا ہے اور جس کے سامنے ایک جہانی ریاست اور واحد انسانی قومیت کا نہایت ہی بلند اور وسیع مطمع نظر ہے۔ کام کا دائرہ آغاز وہ بھی عملاً مسلمان قوم کو قرار دیتا ہے، لیکن وہ مسلم قوم پرستی کی تنگ حدود کو پہلے قدم پر توڑ کر آگے چلتا ہے یہ مودودی کا ایک امتیازی کارنامہ ہے۔

اجتماعی تضاد کا تجزیہ

زوال اور انحطاط کے عمل سے جب کوئی تحریک یا نظریہ یا مسلک گزرتا ہے تو اُس کے ماننے والوں کی زندگیوں میں مضحکہ خیز تضاد پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ یہ واقعہ چونکہ اس وقت رونما ہوتا ہے جب فکری جمود کا روگ لگ چکتا ہے، اس لیے ایک ایک کرکے تضاد ابھرتے رہتے ہیں۔ بے جوڑ چیزوں میں سمجھوتے قائم ہوتے جاتے ہیں، متناقض عناصر باہم ترکیب پاتے رہتے ہیں، اور کسی کو ان سے کھٹک نہیں ہوتی۔ زندگی کا سارا فساد ۔۔۔ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ۔۔۔ جس بھی دائرے میں واقع ہوتا ہے ہمیشہ تضاد ہی سے واقع ہوتا ہے۔ فرد کے نفسیاتی نظام سے لے کر معاشرے کی سیاسی و اجتماعی

ہیئت تک زندگی میں جو خلل بھی آتا ہے بے جوڑ چیزوں کے جمع ہو جانے سے آتا ہے۔ یہ بے جوڑ چیزیں یکے بعد دیگرے جمع ہوتی رہتی ہیں، ہوتی رہتی ہیں اور زندگی ایک عجیب معجون مرکب بن جاتی ہے۔ لیکن عام لوگوں کے ذہن ان کے عادی ہو کر اپنے فکر و نظر کو فساد زدہ ماحول سے کچھ ایسا سازگار بنا لیتے ہیں کہ پہاڑ پہاڑ جیسے بڑے تضاد محسوس نہیں ہوتے۔ جب تک یہ محسوس نہیں ہوتے تبدیلی نہیں آتی۔ غیر معمولی درجے کے مفکر ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کے تضادوں کو سمجھ جاتے ہیں اور پھر ان کو تنقید کا نشانہ بنا کر اجتماعی حس کو بیدار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ جس صاحب فکر کے کارنامے کا بھی آپ جائزہ لیں، آپ دیکھیں گے کہ وہ زندگی کے کچھ نہ کچھ تضادوں کو نمایاں کرتا ہے جنہیں عام ذہن نے محسوس نہیں کیا ہوتا اور پھر جو صاحب فکر کسی ہمہ گیر اور بنیادی تضاد پر انگلی رکھ دیتا ہے تو وہ مفکرانہ مرتبے میں دوسرے بے شمار اہل فکر سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ مودودی نے اس ہمہ گیر تضاد کو اجاگر کیا ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ایک ایک گوشے پر سالہا سال سے اپنا پرتو ڈالے چلا آ رہا تھا۔ وہ ہے اسلام اور مسلمان کے نام کے ساتھ ان بے شمار نظریوں، خیالات، اعمال و کردار، اور نظام ہائے کار کا جوڑ جو قطعاً غیر اسلامی اور غیر مسلمانانہ ہیں۔ امر واقعہ ایسا ہے کہ بالکل پیش پا افتادہ ہے۔ ہم سب اس سے ہمہ وقت دو چار ہیں۔ کوئی راز نہفتہ نہیں، لیکن ہم چونکہ

اس سے ذہنی سازگاری پیدا کرچکے ہیں اس لیے وہ ہمیں کھٹکتا نہیں۔ جب ایک حساس ذہن نمودار ہوتا ہے تو وہ اس پر یوں گرفت کرتا ہے :۔

"بازاروں میں جائیے، مسلمان رنڈیاں آپ کو کوٹھوں پہ بیٹھی نظر آئیں گی اور مسلمان زانی گشت لگاتے ملیں گے جیل خانوں کا معائنہ کیجیے، مسلمان چوروں، مسلمان ڈاکوؤں اور مسلمان بدمعاشوں سے آپ کا تعارف ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں کا چکر لگائیے، رشوت خواری، جھوٹی شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ مسلمان کا جوڑ لگا ہوا پائیں گے۔ سوسائٹی میں پھریئے، کہیں آپ کی ملاقات مسلمان شرابیوں سے ہوگی، کہیں آپ کو مسلمان قمار باز ملیں گے، کہیں مسلمان سازندوں اور مسلمان گویوں اور مسلمان بھانڈوں سے آپ دوچار ہونگے۔ بھلا غور تو کیجیے، یہ لفظ مسلمان کتنا ذلیل کر دیا گیا ہے "

(سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ صفحہ ۲۴)

"اس سے اونچے تعلیم یافتہ طبقے کی حالت اور بھی زیادہ افسوسناک ہے . . . کہیں کوئی صاحب علانیہ خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر ہیں پھر بھی مسلمان ہی! ایک دوسرے صاحب خدا اور رسالت اور

آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادہ پرستانہ مسلک پر پورا ایمان رکھتے ہیں مگر ان کے مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک تیسرے صاحب سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں لیتے، مگر ہیں یہ بھی مسلمان! ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحب یا شریمتی جی بناتے ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبزادی سے وائلین بجوا رہے ہیں، مگر آپ کے ساتھ بھی لفظ مسلمان بدستور چپکا ہوا ہے ...... غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا، مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے، کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ صفحہ ۲۵-۲۶)

"پھر لطف یہ کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہو گیا ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی کرے وہ اسلامی ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ اسلام سے بغاوت بھی کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے۔ یہ (سودی) بینک کھولیں تو

اس کا نام اسلامی بینک[1] ہو گا۔ یہ انشورنس کمپنیاں قائم کریں گے تو وہ اسلامی انشورنس کمپنی ہو گی۔ یہ جاہلیت (غیر اسلام) کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ کالج، یا اسلامیہ اسکول ہو گا۔ ان کی کافرانہ ریاست (یعنی اسلام کے خلاف کسی دوسرے اصول اور نظریے پر چلنے والی ریاست) کو اسلامی ریاست کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان کے فرعون اور نمرود اسلامی بادشاہ کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ ان کی جاہلانہ زندگی اسلامی تہذیب و تمدن قرار دی جائے گی۔ ان کی موسیقی، مصوری اور بت تراشی کو اسلامی آرٹ کے معزز لقب سے ملقب کیا جائے گا۔ ان کے زندقے اور اوہام لاطائل کو اسلامی فلسفہ کہا جائے گا۔ حتیٰ کہ یہ سوشلسٹ بھی ہو جائیں تو مسلم سوشلسٹ کے نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا

---

[1] واضح رہے کہ آج کی معاشیاتی اور مالیاتی ضروریات کے لحاظ سے مولانا مودودی بنکنگ کی ضرورت کے قائل ہیں، مگر وہ اس کا سود کے سسٹم کا چلنا خلافِ اسلام مانتے ہیں اور اسے ایک دوسرے طرز پر قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں اس سلسلے میں ان کی کتاب "سود" حصہ اول و دوم میں تفصیلات ملاحظہ فرمایئے۔

ہو چکے ہیں۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ اسلامی شراب خانے، اسلامی قحبہ خانے اور اسلامی قمار خانے جیسی اصطلاحوں سے بھی آپ کا تعارف شروع ہو جائے۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو اسلامی کفر یا اسلامی معصیت کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو تناقض فی الاصطلاح (CONTRADICTION IN TERMS) کا شبہ تک نہیں ہوتا حالانکہ اگر کسی دکان پر آپ "سبزی خوروں کی دکان گوشت" یا "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں یا کسی عمارت کا نام "موحدین کا بت خانہ" سنیں تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے گی۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ صفحہ ۲۶)

"میں مسلمان صرف اس وقت تک ہوں جب تک زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی نظریہ رکھتا ہوں۔ جب میں اس نظریہ سے ہٹ گیا اور کسی دوسرے نظریہ کے طرف چلا گیا تو میری جانب سے یہ سراسر بے شعوری ہوگی، اگر میں یہی سمجھتا ہوں کہ اس نئے مقام پر بھی مسلمان ہونے کی حیثیت میرے ساتھ لگی چلی آتی ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظریہ اختیار کرنا صریح بے معنی بات ہے۔ "مسلمان نیشنلسٹ" اور "مسلمان کمیونسٹ" ایسی ہی

متناقض اصطلاحیں ہیں جیسے "کمیونسٹ فاشسٹ" یا "مدینی قصائی" یا "اشتراکی مہاجن" یا "موحدیت پرست" (مسئلہ قومیت ص۹۵)

مودودی کی یہ وہ تحریریں ہیں جنہوں نے مسلم نوجوانوں کے اندر ان کی سوئی ہوئی خودی اور ان کے جمود زدہ احساس کو ٹھونکے لگا کر جگا دیا ہے ان کو اپنے تشخص کا شعور دیا ہے، ان کو اس اصل فساد سے آگاہ کر دیا ہے جس سے مسلم سوسائٹی اور مسلم فکر دوچار ہے۔ ان کو فکر و عمل کے وہ راستے دکھلائے ہیں جن پر چل کر وہ نوع انسانی کے ارتقاء میں موثر حصہ ادا کرنے والی اور تاریخ بنانے والی ایک نظریاتی و تحریکی طاقت بن سکتے ہیں۔

فکری استقلال کا داعی

اسلامی فکر کو مسلم نیشنلزم سے الگ کر کے اور تضادوں کے گھناؤنے داغوں سے پاک کر کے مولانا مودودی نے ایسے دور میں پیش کیا ہے جو پوری دنیا میں نظریاتی اور فکری اور تہذیبی کشمکش کا ایک دور تھا۔ اشتراکیت اور فسطائیت اور جمہوریت کے مختلف تصورات مشرق و مغرب میں باہم آویزاں تھے۔ تاریخ کے سمندر میں مختلف سمتوں سے لہریں اٹھ اٹھ کے ٹکرا رہی تھیں اور نئے نئے بھنور بن رہے تھے اور ان بھنوروں سے پھر نئی لہروں کے دائرے پھیل رہے تھے۔ ہر فکر اور تحریک اپنے راستے نکالنے اور دنیا کو

مفتوح کرنے کے لیے زور کر رہی تھی۔ فکروں اور تحریکوں کے یہ ریلے مشرقی اقوام، بالخصوص مسلمانوں کے ذہنوں سے بھی آ آ کے ٹکرا رہے تھے بد قسمتی سے جدید مادہ پرستانہ تہذیب و فکر جو مختلف ریلے پیدا کر رہی تھی ہمارے ہاں مغربی قوموں کے سیاسی تسلط اور امپیریلزم کے جلو میں آئی ہے۔ ہم اس سے ہر جگہ غلامی اور بے بسی اور پسماندگی کی حالت میں دوچار ہوئے ہیں، ہر جگہ ہم نے اس کا چیلنج انتہائی زوال کے گڑھے میں گرنے کے بعد سنا ہے، اور کہیں بھی ٹکر برابر برابر کی نہیں تھی۔ چنانچہ سیاسی شکست کے ساتھ ہی ساتھ ہماری ذہنی شکست کا آغاز ہو گیا۔ غنیمت بس یہ تھا کہ معرکۂ کشمکش کسی نہ کسی درجے میں جاری رہا۔ ایک سخت جان عنصر شروع ہی سے ہمارے اندر ایسا موجود تھا جس نے زمانے کی ہوا کے ساتھ اڑ جانے والوں کے بالمقابل زمانہ کے دھارے کے خلاف تیرنے کی جسارت کر دی۔ اس کے ساتھ امپیریلزم اور بیرونی اقتدار کے خلاف روز افزوں نفرت بھی معاون ہوئی۔ مگر جدید فکر و تہذیب کی یلغار بڑی سخت تھی۔ اس کے مقابلے میں دلوں اور دماغوں نے سپر ڈال دی۔ اس کے سامنے نگاہِ تنقید ایسی جھکی کہ بالکل زمین میں گڑ کے رہ گئی۔ ایک طرف تعلیم کا تیزاب تھا جو فولاد کی خودی کو بھی گھلائے دے رہا تھا۔ دوسری طرف لٹریچر کا سیلاب تھا جو سروں سے اونچا ہو کے بہہ رہا تھا۔ تیسری

طرف سائنس کی ترقیات کے ہوش رُبا شعبدے تھے جو ہوش اڑا رہے تھے، چوتھی طرف ایک نیا کلچر تھا جس کی شان دلربائی بُری طرح ریجھا رہی تھی، پانچویں جانب مادی طاقت کے وہ دل دہلا دینے والے مظاہر تھے جن سے چکاچوند آرہا تھا۔ ان موثرات کے اندر گھر جانے پر ہمارے اوپر وہ مرعوبیت چھائی کہ ہم نے اپنے چشم و گوش سے دیکھنا سننا اور اپنے دماغوں سے سوچنا بالکل چھوڑ دیا، اپنے نظریات کے بارے میں ہم شک میں پڑ گئے، اپنے دین سے ہمیں عار آنے لگی، اپنے سرمایہ روایات و اقدار نے ہماری نگاہوں میں قیمت کھو دی جیسے ہم اپنی بنیادوں سے بالکل اکھڑ گئے اور ہوا کے جھونکوں پر اڑنے والے تنکے بن گئے۔ ہم نے مرعوبیت کے اس طلسم میں سمجھا کہ ترقی، خیر، فلاح اور سچائی وہ ہے جو یورپ سے آئے۔ ہم نے ذہنی غلامی کے اس سحر میں مبتلا ہو کر یہ مستقل تاثر لے لیا کہ یورپ کی نئی زندگی ایک بالکل بے عیب زندگی ہے۔ ہم نے غیر شعوری رائے یہ قائم کر لی کہ جس کے پاس طاقت ہے، اس کے نظریات بھی برحق ہیں۔ اس عالم میں ہمارے مذہبی حلقوں نے بلاشبہ مدافعت کی سعی جاری رکھی ہے لیکن زمانہ انہیں پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔ اچانک اقبالؒ ہمارے ملی محاذ پر ابھرا۔ ہمارے عالم افکار کا یہ شاہین، یہ عقاب چونکہ اس علم سے خود آراستہ، اس فکر کا راز داں اور اس تہذیب کا خود غواص تھا جس سے معرکہ درپیش تھا اس لیے جب اس نے آکر مورچہ سنبھالا اور دعوت جاننے

کے خلاف "اعلانِ جنگ" کر دیا تو کشمکش کا پانسہ پلٹنے لگا۔ نوجوان نسل کے جذبات نے بالکل نئی کروٹ لی، اور ملی شعور ایک نیا موڑ مڑ گیا۔ اقبال کے کام سے آگے کی مہم کو مودودی نے سنبھال لیا۔ اس نے تفصیل سے جدید افکار، جدید تہذیب اور جدید نظاموں پر تنقید کی اور براہِ راست اس سیلاب کو سمجھ کر تنقید کی، مسلمانوں کی اس تاریخی حالت کا تجزیہ کر کے ان کے سامنے رکھا جس کے زیرِ اثر وہ ایک خاص طرح کی محکومانہ نفسیات کا شکار ہو رہے تھے، پھر مثبت طور پر اسلامی آئیڈیالوجی اور نظام کے ایک ایک پہلو کی قدر و قیمت کو ان پر واضح کیا اور اسی سائنٹفک معیارِ استدلال سے واضح کیا جو اس دور کا معیار تھا۔ اس مہم کے نتیجے میں "احساسِ کہتری" کا نوٹ اور بقول مودودی "یرقانِ ابیض" ان کی آنکھوں سے دور ہوا، انہوں نے نگاہیں اٹھا کر ازسرِ نو جو غور کیا تو وہ اپنے آپ کو ازسرِ نو جان کر حیرت میں رہ گئے کہ ہیں، ہم یہ کچھ ہیں!

مودودی دیکھ رہا تھا کہ آزادی کی تحریک اٹھ رہی ہے، انقلاب آنے والا ہے۔ اگر ٹھیک وقت پر مسلمانوں کو فکری مرعوبیت اور احساسِ کہتری اور ذہنی غلامی اور مغرب کی اندھی تقلید سے نہ نکال لیا گیا تو انقلاب آ جانے کے بعد تعمیرِ نو بالکل غلط نقشے پر شروع ہو جائے گی اور پھر سالہا سال تک نہ تو قوم کو اپنی ملی خودی کو زندہ کر کے اپنی دنیا آپ بنانے کی توفیق ملے گی اور

نہ خود اسلام ہی کے اُٹھنے کا کوئی امکان باقی رہتا ہے گا۔ اس لیے اُس نے اس کشمکش میں مسلمانوں کی ذہنی اسلحہ بندی کے لیے پوری پوری محنت و کاوش صرف کی ہے۔ اس محنت و کاوش کے نتائج یوں تو مودودی کی ایک ایک سطر میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن خصوصیت سے جو کتاب خاص اسی کشمکش کے زیر اثر لکھی گئی ہے وہ تنقیحات ہے۔ تنقیحات وہ مربوط مجموعہ مقالات ہے جو ان تمام سوالات اور اعتراضات اور ان تمام شکوک اور غلط فہمیوں پر بحث کرتی ہے جن سے مسلمان دوچار تھے۔

مودودی وہ شخص ہے جس نے نظریات کے میدان میں ہم کو دوسروں کا بھکاری بنے دیکھا اور ہمارا ہاتھ پکڑ کے وہ ہمیں اپنے گھر کے ان قیمتی خزانوں تک لے آیا جن کو ہم فراموش کر چکے تھے یا جن کی قدر و قیمت ہماری نگاہوں میں ختم ہو رہی تھی۔ اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اپنی زندگی ہی کا نہیں، اپنی ترقی ہی کا نہیں، اپنی فلاح ہی کا نہیں، ساری نوع انسانی کی زندگی اور ترقی اور فلاح کا سروسامان ہمارے اپنے پاس ہے۔ اب ہم نہ سرمایہ دارانہ نظام کے در کے بھکاری ہیں، نہ اشتراکی خرمن کی بارگاہ کے سائل، بلکہ اب ہم کسی سے لینے کے بجائے دوسروں کو وہ کچھ دینے والے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہے۔ اب ہمیں وہ مقام ملا ہے جس پر آئے بغیر کوئی گروہ انسانی ترقی اور فتوحات کے دروازے اپنے لیے کھول نہیں سکتا۔ اب ہمیں اس

"سم سم" کی کنجی ہاتھ آئی ہے جس سے ہم ایک نئی دنیا کے تالے کھول سکتے ہیں۔ اب ہم خود شناس ہیں۔ اب ہماری آنکھوں میں نگاہِ تنقید کی نئی چمک ہے، اب ہم اپنے دین کے بارے میں کسی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ اُلٹا ایک فخر اور ایک برتری کا احساس اپنے اندر پاتے ہیں، اب ہمارا اندازِ گفتگو معذرت خواہانہ (APOLOGATIC) نہیں رہا بلکہ داعیانہ ہے۔

ذہن کا حُسنِ ترتیب بہت سے وہ لوگ ہمارے اندر موجود ہیں جو معلومات کے سمندر سر و دماغ میں اتار جاتے ہیں جن کا مطالعہ غیر معمولی حد تک وسیع ہوتا ہے، لیکن جو زندگی کی کوئی ایک گرہ سلجھا نہیں سکتے اور کسی ایک مسئلے کے صحیح حل کا راستہ نہیں نکال سکتے۔ کتابیں لکھتے ہیں اور بے حساب لکھتے ہیں، مقالات نگاری کرتے ہیں اور بڑے اونچے معیار پر کرتے ہیں، ساری ساری عمر جرائد نکالتے ہیں اور بڑی مقصدیت کے ساتھ نکالتے ہیں، اخبار نویسی کرتے ہیں اور زوردار طریقے سے کرتے ہیں لیکن زندگی جن اُلجھنوں میں گھری ہے، دماغ جن پیچیدگیوں میں مبتلا ہیں، خیالات جس طرح متصادم ہیں، مسائل جس طرح پیچ در پیچ ہیں ان کے برسوں کے کارناموں کے بعد بھی سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے اور کوئی ایک گرہ وہ نہیں کھول سکتے بلکہ اُلٹا سینکڑوں گرہیں ڈال کے رخصت

ہوتے ہیں جس انتشار کے سمندر میں سوسائٹی غوطے کھا رہی ہوتی ہے ان کے کارنامے اس کی طوفان خیزیوں میں کچھ اضافہ ہی کرتے ہیں، کمی نہیں کر سکتے۔ ہم کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ وہ نہ اپنے ذہن کا جائزہ لے کر اسے منظم کر سکتے ہیں، نہ حاصل شدہ معلومات اور ذخیرۂ علم کو اس میں کسی اچھی ترتیب سے رکھ سکتے ہیں، نہ کسی مسئلے، کسی بحث، کسی سوال، کسی حالت، کسی کشمکش، کسی تاریخی دور، کسی تحریک اور کسی تہذیب کا صحیح تجزیہ کر کے اس پر مرتب سلیقے سے غور و فکر کر سکتے ہیں۔ ان کا اپنا ذہن ایک کباڑخانہ ہوتا ہے جس میں کیل، پردے، بوتلیں، کپڑے، برتن، لیمپ، ہیرے، موتی، سبھی طرح کی چیزیں بے ڈھب طریقے سے بکھری ہوتی ہیں۔ اس غیر مرتب اور غیر منظم ذہن کے ساتھ وہ مسائل و معاملات کا کبھی صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے، بلکہ انتشار سے چلتے ہیں اور سارا راستہ اپنی بے شمار قیمتی معلومات اور بے شمار لایعنی مزعومات کو بکھیرتے ہوئے ایک خطرناک انتشار پر جا کے سفر ختم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ معلوماتی مفاد کے سرمایہ دار ہونے کے باوجود کبھی مفکر نہیں بن سکتے۔

مودودی کو مفکرانہ مرتبے پر لانے والی ایک خصوصیت اس کا یہی منظم اور مرتب ذہن ہے۔ عملی تجربات و مشاہدات، کتابی مطالعے اور ذاتی غور و تفکر سے وہ جو مواد معلومات بھی حاصل کرتا ہے وہ بہترین سارٹنگ کے ساتھ اس کے

ذہن میں جگہ پاتا ہے۔ اس منظم اور مرتب ذہن کے ساتھ جب وہ کوئی کام کرنے لگتا ہے تو اس کا سب سے بڑا کمال ماہرانہ تجزیہ ہے۔ وہ معاشرے کو لے گا تو اس کے عناصر کا تفصیلی تجزیہ کرے گا، وہ کسی بحث میں حصہ لے گا تو پہلے موضوع بحث اور میدان بحث کا تجزیہ کرے گا، وہ کسی فکر و نظام پر بات کریگا تو بات کرنے سے پہلے اس کا تجزیہ کرے گا۔ وہ کسی سوال سے دوچار ہوگا تو سوال اور اسے پیدا کرنے والے ذہن کا تجزیہ کرے گا، وہ کسی سے مخاطب ہوگا تو اس کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کرے گا، وہ کام کرنے کے لیے کوئی پروگرام اختیار کرے گا تو لازماً اس پروگرام کا تجزیہ کرکے اس کے ایک ایک حصے کے لیے منصوبہ بندی کریگا۔ ہمارا معاشرہ جس پست ذہنی سطح پر ہے اور جس طرح کی فکری کشمکش سے دوچار ہے اور جو ذہنی انتشار اس میں شائع و ذائع ہے اس کی وجہ سے جو سوال پیدا ہوتے ہیں پہلے تو وہ خود الجھ جاتے ہیں، پھر ان کے جو جواب دیئے جاتے ہیں وہ سوال سے بھی زیادہ الجھ کر سامنے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ سوال تو لاینحل ہو کے رہ گیا، کچھ دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ الجھے ہوئے نکلے۔

مودودی کے لٹریچر کو پڑھیے، اس کے خطوط کو دیکھیے، اس کی تقاریر سنیئے، ہر جگہ آپ کو حالات اور مسائل کے ایسے تجزیے کے آثار ملیں گے جن کے تحت ایک ایک بات بالکل اپنی فطری ترتیب میں آسکے گی اور سلسلۂ خیالات

کی ہر کڑی کا ربط دوسری کڑی سے منطقی قسم کا ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کا سفر کبھی بھی متحنی خطوط پر نہیں کرتا، بلکہ پہلے نقطۂ آغاز کو اور غایتِ آخر کو قطعی یقین سے سامنے رکھ لیتا ہے، پھر ایک ایک قدم بالکل خطِ مستقیم میں رکھتا ہوا اپنا سفر ختم کرتا ہے۔ یہ راست فکری (STRAIGHT THINKING) اور راست کلامی اس کا ایک بڑا ہی قیمتی کمال ہے جس کے بغیر وہ عالم تو ہو سکتا تھا، مفکر نہیں ہو سکتا تھا۔

مودودی کی یہ وہ خصوصیت ہے کہ اس کے لٹریچر کو کچھ عرصہ تک پڑھنے والے لوگ بھی اس سے اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مودودی ایک وسطی مقام

اب مجھے اس کے مفکرانہ مقام کے بارے میں صرف ایک پہلو اور واضح کرنا ہے۔

تاریخی شخصیتوں میں دیکھنے کی ایک چیز یہ ہوتی ہے کہ تاریخی حالات اور معاشرے کے مختلف عناصر کے اندر وہ کونسی پوزیشن لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مودودی کا مقام بڑا ہی اہم ہے۔ ہماری سوسائٹی نظریات اور کلچر کے لحاظ سے دو حصوں میں بُری طرح بٹ رہی تھی۔ ایک طرف مذہبی عناصر تھے جو زندگی کے نظام سے بے تعلق ہو کر فسادی ماحول کے خلاف ایک منفعلانہ اور منفی قسم کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ دوسری طرف جدید طبقہ تھا جو اسلام سے باغی ہو کر نہیں، تو کم سے کم بے نیاز ہو کر زندگی کے اجتماعی نظام کو اندھا دھند چلائے جا رہا تھا۔

وہ زندگی کی گاڑی کو اسلامی نصب العین کی طرف لے جانے کا راستہ جانتے تھے مگر اس کی ڈرائیونگ کا ان کو عملی تجربہ نہیں رہا تھا۔ یہ گاڑی چلانا جانتے تھے مگر راستہ بھول چکے تھے۔ ایک کو دین کی حقیقتوں کا علم تھا مگر جدید حالات اور جدید نظریات سے بے ربطی تھی، دوسرے کو جدید حالات و نظریات کی مہارت تھی مگر دین کا ماہرانہ علم نہیں تھا۔ لیکن انگریزی استیلاء نے پہلے تو ان دونوں کو دین و سیاست کی تفریق کے نظریے پر کام کر کے باہم دگر پھاڑ دیا اور پھر آہستہ آہستہ ان کو حریف بنا ڈالا۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے لین دین کا سلسلہ ختم ہو گیا، اُلٹا تنفر اور کھینچا تانی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اُدھر یہ دعویٰ کہ دین کا ہم علم رکھتے ہیں تم کو ہماری رہنمائی ماننی چاہیے، اِدھر سے یہ مطالبہ کہ زندگی کا جو نیا نظام ہم اپنے روشن دماغوں سے چلا رہے ہیں، اس دور میں یہی ذریعۂ ترقی ہے لہٰذا دین کو بھی اگر رہنا ہے تو اپنے آپ کو اس سے ہم آہنگ کرے۔ اس کھینچا تانی نے آہستہ آہستہ دونوں اہم عناصر کے درمیان طبقاتی بُعد پیدا کرنا شروع کیا۔ تعلیمی مراکز الگ ہو گئے، تنظیمی ہیئتیں الگ الگ ہو گئیں، لباس اور کلچر الگ الگ ہو گئے، بولیاں اور دلچسپیاں الگ الگ ہو گئیں، مسائل اور سرگرمیاں الگ الگ ہو گئیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ معاشرہ اپنی ساری طاقت جمع کر کے ناپسندیدہ حالات اور بیرونی اثرات سے کشمکش کرے اور کسی صحیح نقشے پر تعمیر نو کرنے کی تیاریاں کرے، اُلٹا اس کی دو قیمتی

طاقتیں کہ جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ضروری صلاحیت سے آراستہ تھی آپس میں معرکہ آرا ہوتی نظر آئیں۔ دونوں طرف ایک نہ ایک قسم کی کوتاہیاں موجود تھیں اور دونوں طرف کسی نہ کسی طرح کی انتہا پسندیاں کارفرما تھیں۔ حد یہ کہ ان کے ہاں "مولوی" کا لفظ گالی بنا دیا گیا اور ان کے ہاں مسٹر کا لفظ ملاحی بن گیا۔ زوال اور غلامی میں مبتلا ہونے والی قوموں کو ایسے تباہ کن حالات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

لیکن مودودی وہ پہلا شخص ہے جس نے وہ خط اعتدال فراہم کر دیا جس پہ دونوں طرف کے لوگ، اگر تشانہ نشانہ کھڑے ہوں اور تاریخ سازی میں اپنا حصہ ادا کر سکیں۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مودودی دونوں طرف کے علوم[1] سے بہرہ اندوز تھا، دونوں طبقوں کو وہ دیکھ بھال کے آ رہا تھا، دونوں کی خوبیاں اور دونوں کی کمزوریاں اور دونوں کا جوہر مشترک اس کے سامنے صاف تھا۔ چنانچہ خود اپنے بارے میں اسی کے الفاظ دیکھیے!

"فاضل تنقید نگار[2] اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں گروہ علماء

---

[1] جو لوگ مولانا مودودی کو گالی دینے کے لیے "ملا" کہتے ہیں ان میں سے اکثر کو شاید انگریزی زبان کی اتنی کتابیں سرسری نظر سے دیکھنے کا موقع بھی نہ ملا ہو گا جو اس شخص کی لائبریری میں ہیں اور جن میں سے بے شمار کے صفحات پر اس کے نشانات اور حاشیے لگے ہوئے ہیں۔

[2] مراد ہیں خان بہادر نواب ذوالفقار اللہ مرحوم جنہوں نے سیاسی کشمکش کے مباحث پر مسلسل تنقیدیں لکھی ہیں۔

میں سے ہوں، اور "مولوی" ہونے کی حیثیت سے جدید تعلیم اور جدید تعلیم یافتہ گروہ پر حملہ کر رہا ہوں۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے گروہِ علماء میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں جس نے جدید اور قدیم دونوں طریقہ ہائے تعلیم سے کچھ کچھ پایا ہے اور دونوں کو چوں کو خوب چل پھر کر دیکھا ہے۔ اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو میں قدیم گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو۔ دونوں کی خامیوں پر میں نے آزادی کے ساتھ تنقید کی ہے، اس لیے میرا کوئی خاص رشتہ کسی گروہ سے نہیں ہے۔" (ترجمان القرآن۔ جلد ۱۴ عدد ۳ صفحہ ۲۲۷)

یعنی مولانا مودودی نے دونوں گروہوں کی طبقاتی پوزیشن میں سے کسی کو قبول نہیں کیا، دونوں کے بیچ میں ایک مقام پر کھڑے ہو کر دونوں پر ضروری تنقید کی ہے۔ دونوں کے اندر جو پہلو کام کے ہیں ان کی اہمیت واضح کی ہے جو کمزوریاں ہیں ان کو بے نقاب کیا ہے اور پھر دونوں کے سامنے اپنی دعوت اس طرح رکھی ہے کہ اس میں کچھ وجوہ جاذبیت اُدھر والوں کے لیے ہیں، کچھ اِدھر والوں کے لیے۔ مثلاً مولانا مودودی اصول تو اسلام سے لینا چاہتے ہیں اور اس میں اٹل ہو کر بات کرتے ہیں، لیکن دوسری طرف اس اصول پر کام کرنے کے لیے اجتہادی نقطۂ نظر کو لازم قرار دیتے ہیں۔ وہ نظریۂ زندگی تو سو فیصد

اسلامی رکھتے ہیں، لیکن عملاً زندگی کا نظام بنانے میں وہ جدید ذرائع و وسائل، ادارات کی جدید اشکال اور ڈھانچوں، نئے دور کی علمی ترقیوں، سب سے کام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ جدید علوم سے استفادہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ان کے مرکزی نظریے کو ہٹا کر اس کی جگہ اسلامی نظریہ رکھ دیا جائے۔ وہ دعوت توحید کی تو وہی لیتے ہیں جو قدیم سے قدیم انبیاء سے لے کر اب تک ایک ہی رہی ہے مگر اسے پیش کرنے کے لیے جدید انداز، جدید اسلوب، جدید زبان اور جدید پیرایوں کا اختیار کرنا لازم مانتے ہیں۔ وہ قانون کے اصول شریعت اسلامیہ ہی سے لینا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف پچھلے دور کی طے شدہ فقہی جزئیات کو ان اصولوں کے ساتھ دوامی شریعت کی حیثیت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ دستور کے لیے آئیڈیالوجی تو بلا آمیزش خدا اور رسول سے لیتے ہیں لیکن اس کے کام کرنے کے لیے جدید حالات کے تقاضوں کے مطابق کوئی سا موزوں خارجی ڈھانچہ مرتب کر لینے کے حق میں ہیں۔

ایک وسطی مقام سے مولانا نے اپنی دعوت دونوں عناصر کو یکساں پیش کی ہے اور دونوں سے کام کے آدمی حاصل کیے ہیں۔ مگر ان کا عملی تجربہ یہ ہے کہ ان کی دعوت پر لبیک کہنے، اس کے سانچے میں کردار کو ڈھالنے اور اس کے لیے جدوجہد کرنے کے لحاظ سے جدید طبقہ نے بہت زیادہ اور

بہت کام کے آدمی فراہم کیے ہیں۔ چنانچہ اب بھی نوجوان طلبہ کے حلقوں میں یہ دعوت جس طرح اپنے راستے تیزی سے بنا رہی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یا تو اس دعوت میں جدید طبقے کے لیے اپیل نسبتاً زیادہ ہے یا جدید طبقے میں کام کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ غالباً یہ دونوں ہی باتیں ہیں۔

مودودی دنیا کے اُن خوش نصیب مفکروں میں سے ہے جن کی فکر ان کی زندگی میں عملی تحریک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں تاریخی احوال کے عمل کا بھی بڑا حصہ ہے اور اس کاوش اور جدوجہد کا بھی بڑا حصہ ہے جو مولانا مودودی نے سالہا سال صبر اور بے لوث اخلاص کے ساتھ حالات پر اثر انداز ہونے کے لیے صرف کی ہے۔ آج جبکہ مودودی کی فکر ایک کتابی دعوت کے درجے سے بلند ہو کر ایک وسیع تحریک کی شکل میں کام کر رہی ہے، مودودی کی اپنی اہم اور قیمتی شخصیت اس تحریک کے ہوتے ہوئے ثانوی مقام پر چلی گئی ہے۔ اب اصل چیز یہ تحریک ہے اور مودودی اس کا ایک کارکن ہے ــــ چاہے کسی بھی درجے کا کارکن ہو۔

اس مودودی کے بارے میں جو لوگ کسی سیاسی اور جزئی معاملے میں اس کی رائے یا تقریر ـــــ وہ بھی متعصب اخبار نویسوں کی مسخ کردہ ـــــ پڑھ کر ایک مستقل رائے قائم فرما لیتے ہیں اور پھر اسی رائے کی عینک لگا کر آئندہ کی

ہر چیز کو دیکھتے چلے جاتے ہیں، کاش کہ انہیں بتایا جا سکتا کہ ایسی شخصیتوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے اختلاف کرنے والے بھی ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے کام کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کو ملک و قوم کے لیے باعث عزت سمجھتے ہیں۔

ابن تیمیہؒ کا رنگ

ڈاکٹر محمد عطاء الرحمن ندوی

"یہ تو ابن تیمیہؒ کا رنگ ہے"

یہ الفاظ آج سے پندرہ سال قبل ایک محترم زبان سے میں نے سنے تھے۔ گہرے تاثر کا وہ عالم جس میں یہ الفاظ زبان پر جاری ہوئے تھے، ذہن میں بعینہ محفوظ اور آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ گویا اس وقت بھی وہ اثر انگیز چہرہ دیکھ رہا ہوں اور تاثر میں ڈوبی ہوئی وہ آواز سن رہا ہوں۔

بہتر یہ ہے کہ پورا واقعہ بیان کر دوں۔

میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ یہیں پہلے پہل مجھے "ترجمان القرآن" کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میرے ذہن نے ——— وضاحت

کر دوں کہ یہاں میں ذہن کا لفظ قلب و دماغ دونوں کے مجموعے کے لیے استعمال کر رہا ہوں — اس قدر شدید گیرائی پائی کہ "ترجمان" کا مطالعہ میرے لیے ایک فطری تقاضا بن گیا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب میں اپنے گھر (موضع پہاڑپور، بازار، ڈاکخانہ ٹیڑھ مرایہ متصل سیوان، ضلع سارن) گیا تو رسالہ ترجمان کے پرچے ساتھ لے گیا، اور بڑے شوق و ذوق سے اپنی اس یافت کا والد محترم سے ذکر کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ والد محترم نے غالباً اس خیال سے کہ ان کے نور نظر نے وقت کے عام مذاق کے خلاف — خصوصاً نوجوانوں کے پسندیدہ موضوعات کے خلاف — ایک ایسے رسالے سے اپنی دلچسپی وابستہ کی ہے جس کا نام "ترجمان القرآن" ہے، تحسین و آفرین سے نوازا اور خود بھی دیکھنے کا شوق ظاہر فرمایا۔

والد محترم جناب مولانا مفتی محمد جمیل انصاری رحمۃ اللہ علیہ ایک حق پرست عالم دین تھے ان کی عمر پڑھنے پڑھانے میں گذری تھی۔ صاحب درس ہونے کے ساتھ صاحب فتویٰ بھی تھے، اور بیس برس (سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۴۱ء) تک مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس اور اس کے دارالافتاء کے مفتی رہے۔

میں نے "ترجمان" کے وہ تمام پرچے، جو میرے ساتھ تھے، حضرت کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ ان کو دیکھ کر حضرت نے پہلی رائے جو ظاہر فرمائی وہ یہ تھی:

"میاں یہ ساری چیزیں قرآن و سنت میں موجود ہیں۔ ضرورت

عمل کی ہے۔ عام طور سے انگریزی داں حضرات اس قسم کی باتیں اپنے اخبارات و رسائل میں لکھا کرتے ہیں، لیکن عمل نہیں ہوتا ہے۔"

پھر جب ۱۹۳۶ء کی چھٹیوں میں وطن آیا، "ترجمان القرآن" کے تازہ پرچے والد (رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں پیش کیے۔ حضرت نے بالاستیعاب ان کا مطالعہ فرمایا۔ پھر ایک دن نہایت دلدوز لہجے میں فرمانے لگے کہ

"مجھے سخت غلط فہمی تھی۔ یہ شخص (مودودی صاحب) نرا انگریزی داں ہی نہیں ہے بلکہ عربی کا بھی بہت بڑا فاضل ہے —— ان کی عمر کیا ہو گی؟"

میں نے عرض کیا: "غالباً عمر تیس بتیس سال ہو گی۔"

استعجاب سے فرمانے لگے:-

"اس عمر میں اتنی صلاحیت و قابلیت بہم پہنچائی ہے کہ ان کے رسالے کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔"

میں نے ان تفصیلات سے مولانا مودودی صاحب کو مطلع کیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مولانا پٹھان کوٹ آ چکے تھے۔ مولانا نے جواب کے ساتھ "سیاسی کشمکش"، "رسالہ دینیات" اور "دستور العمل دارالاسلام" بھی روانہ فرمایا۔ والد رحمۃ اللہ علیہ نے ان چیزوں کو اوّل تا آخر بڑے شغف سے پڑھا، اور نہایت دلگیری سے بار بار فرماتے رہے کہ:

"مجھے اس شخص کے متعلق بڑی غلط فہمی تھی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے یہ تو علامہ ابن تیمیہ کا رنگ ہے۔ تعجب ہے کہ اس قحط الرجال کے زمانے میں، اور وہ بھی ہندوستان میں، ایسا شخص پیدا کیونکر ہوا۔ یہ شخص عملاً جب اس کام کو کرے گا تو اس کی مخالفت بھی بڑے شد و مد سے کی جائے گی، کیونکہ دنیا میں اہلِ حق کے ساتھ ہمیشہ یہی برتاؤ ہوا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ لوگ ان کو قتل بھی کر دیں۔"

چنانچہ واقعۃً حکومت پاکستان نے پھانسی کی سزا تجویز کرکے یہ بات پوری بھی کر دی تھی۔ وہ تو یہ کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے محفوظ رکھا۔ لیکن مولانا کی عزیمت نے شہادت کے رتبۂ عالیہ کو حاصل کر لیا۔

اب پٹھان کوٹ سے براہِ راست "ترجمان" کے رسالے پہاڑ پور بازار کتب خانہ انصاریہ کے پتے پر آنے لگے تھے۔ والد محترم تعطیلات میں جب ملکنے سے مکان تشریف لاتے تو فرصت کے دنوں میں ذوق شوق سے ان کا مطالعہ فرمایا کرتے۔ بالآخر جب "ایک صالح جماعت کی ضرورت" پر "ترجمان" میں اشارات شائع ہوئے تو والد صاحبؒ نے پر عزم لہجے میں فرمایا:۔

"اگر یہ جماعت وجود میں آئی تو میں اس کا پہلا ممبر ہوں گا۔"

لیکن افسوس کہ تشکیلِ جماعت سے دس دن قبل (۱۰ اگست ۱۹۴۱ء کو) حضرت اپنی راہ چلے گئے۔ (رحمۃ اللہ علیہ)

سالہا ۵, ۱۲

اسی زمانے میں مولانا مودودی کی عظیم شخصیت پر علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھرے جلسے میں مہر تصدیق ثبت فرمائی۔

دسمبر ۱۹۴۷ء کی آخری تاریخوں میں دارالعلوم کے قدیم طلبہ کی "ندوی کانفرنس" تھی میں نے ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم ندوہ سے سند فراغ حاصل کیا تھا۔ اس لیے میں بھی کانفرنس میں شریک ہونے کی غرض سے لکھنؤ گیا۔ ایک خاص محرک اس کانفرنس میں شرکت کا یہ تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی اس زمانے میں لکھنؤ تشریف لانے والے تھے، اور میری طرح ندوہ کے بہت سے فراغت یافتہ طلبہ کو مولانا سے ملاقات و تبادلہ خیالات کا شوق تھا۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب، کانفرنس کے اختتام کے بعد ندوہ کے مہمان خانے میں تشریف لائے۔ تمام اساتذہ اور ندوہ کے فارغ التحصیل حضرات نے مولانا سے تبادلہ خیالات کیے۔ مختلف نشستیں مہمان خانے اور مسجد میں ہوئیں۔ بعض نشستوں میں مجھے بھی تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا۔ ارباب ندوہ نے مولانا سے اصحاب تعلیم و طلبہ کو خطاب کرنے کی خواہش کی۔ لکھنؤ کی انجمن اتحاد طلبہ کی جانب سے، جس میں ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ شامل تھے، جلسے کا انتظام کیا گیا اور مولانا مودودی صاحب نے اپنا مقالہ "نیا نظام تعلیم" اپنے خاص طرز ادا اور اسلوب میں ارشاد فرمایا۔ صدر جلسہ ہمارے محترم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تھے۔ فریضہ تعارف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ادا کیا۔ حضرت سید صاحب قبلہ نے مولانا مودودی صاحب کا تعارف جن

الفاظ میں کیا تھا، اب تک میرے کان ان صداؤں سے گونج رہے ہیں، اور وہ نقشہ میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔

علامۂ محترم نے فرمایا:

"میں اس وقت ایک نوجوان لیکن ایک بحرِ زخار کا تعارف آپ حضرات کے سامنے کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں۔ مولانا مودودی صاحب سے علمی دنیا پورے طور پر واقف ہو چکی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اس دور کے "متکلم اسلام" اور ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔ یورپ سے الحاد و دہریت کا سیلاب جو ہندوستان میں آیا تھا، قدرت نے اس کے بند باندھنے کا انتظام بھی ایسے ہی مقدس اور پاک طینت ہاتھوں سے کرایا ہے جو خود یورپ کے جدید و قدیم خیالات سے نہایت ہی اعلیٰ طور پر کما حقہ واقفیت رکھتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ قرآن و سنت کا اتنا گہرا اور واضح علم رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر اس کی روشنی میں تشفی بخش طور پر گفتگو کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحدوں اور دہریوں نے اس شخص کے دلائل کے سامنے ہتھیار ڈال دی ہیں، اور یہ بات واضح طور سے کہی جا سکتی ہے کہ مودودی صاحب سے ہندوستان اور عالم اسلام کے مسلمانوں کی بہت سی توقعات دینی وابستہ ہیں۔"

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ خاص کر اس فتنے کی طرف تھا جو نیاز فتحپوری نے دینی عقائد اور وحی و قرآن کے متعلق برپا کیا تھا۔ اور نوجوان طبقہ اس کی طرف بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ مولانا مودودی نے اس سلسلے میں متعدد مضامین سپرد قلم فرمائے، از اں جملہ "تجدد کا پائے چوبیں" ہے، جو ہماری ندوی جماعت میں بہت پسند کیا گیا تھا۔

لیکن دنیا کے عجائبات میں سے یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ جب دین کا کام کرنے کے لیے کچھ لوگ کھڑے ہوتے ہیں، اور اس کو تمام ادیان باطل پر غالب کرنے کے لیے تمام ممکن ذرائع اور وسائل کو اپنے قبضے اور تصرف میں لانا چاہتے ہیں، تو ان پر آج انہی حلقوں، بلکہ انہی زبانوں سے "خارجیت" کے الزام تراشے جاتے ہیں، طرح طرح کے فتوے برستے ہیں اور اقامت دین کی تحریک میں خلل ڈالنے بلکہ مٹا دینے کی انتہائی نامحمود کوششیں کی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان محترم بزرگوں کے حال پر رحم فرمائے اور ہم کو اور ان کو عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

آغا شورش کاشمیری

راقم الحروف کو پہلی دفعہ ۱۹۴۵ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ پانچ برس کی قید کے دن تھے۔ اور منٹگمری سنٹرل جیل میں سوشلزم اور کمیونزم کے عالموں کا اجتماع تھا۔ جو مسلمان قید تھے ان میں تعلیم یافتہ شاید ہی تھے، اور جنہیں تعلیم یافتہ کہا جا سکتا تھا وہ سیاسی ہونے کے باوجود ادبی زیادہ تھے، ان کے وقت کا بیشتر حصہ ناولوں، افسانوں، غزلوں اور نظموں کی کتابوں میں کٹتا، اور جب ان سے فرصت پاتے تو خوش گپیوں میں وقت گزار دیتے تھے۔ جن دو چار آدمیوں کا تعلق مذہب سے تھا وہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر قرآن مجید پڑھنے اور کبھی کبھی سجدہ کر لینے کے سوا اور کوئی کام نہ جانتے تھے۔ وہ اپنے کام یعنی دل کو قرآن سنانا یا ان کے سامنے قرآن پڑھنا غالباً معیوب سمجھتے تھے۔ انہیں اس

بات کا خطرہ رہتا تھا کہ ان کے ساتھی انہیں فرقہ پرست نہ کہیں، یا اس بات کا طعن نہ دیں کہ سائنس کے ترقی یافتہ دور میں تیرہ سو برس پہلے کی ایک کتاب کے فرسودہ مفہوم جانے بغیر آگے جا رہے ہیں۔

اس کے برعکس سوشلسٹ اور کمیونسٹ دن رات اپنے تبلیغی مشن میں مشغول رہتے اور ان کی بالالتزام کوشش ہوتی کہ وہ حاضر ساتھیوں کو اپنے قریب کھینچیں، انہیں اپنے مبادیات سے آگاہ کریں، اپنے مقاصد سے روشناس کرائیں، اپنے نصب العین کی جدوجہد کے لیے تیار کریں اور وہ تعلیمات جن پر دنیا بھر کے کمیونسٹ اور سوشلسٹ ایک سی رائے رکھتے اور ایک سے نظریے کے زیر اثر کام کرتے ہیں، انہیں عام کریں۔

مجھے ان لوگوں کے حوصلے واستعداد اور مطالعہ ومشاہدے کے ساتھ ساتھ ان کے تبلیغی انداز پر حیرت ہوتی اور جس ترتیب سے یہ ساتھیوں کو مارکسزم کا درس دیتے اس میں کشش کا خاص سامان ہوتا۔ میں احرار کے جنرل سکرٹری کی حیثیت میں قید ہوا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ سوائے قید کے میرے جیب و داماں میں کچھ نہ تھا، باہر بھی دیکھا اور اندر بھی مجلس احرار کے زعماء نے اپنے پیروؤں پر کبھی اپنے نصب العین کی علمی بنیادیں واضح نہ کیں۔ اس کے باوجود کہ وہ پاکستان کی آواز کے اٹھتے ہی حکومت الٰہیہ کے داعی بن گئے تھے ان کے پیش نظر کوئی سائنٹفک طریق کار نہ تھا۔ وہ اپنے نعرے کے علمی پہلوؤں کی وضاحت غیر ضروری سمجھتے تھے۔

انہوں نے کبھی اپنے گرد و پیش بیٹھنے والوں کا کلمہ بھی درست نہ کرایا۔ اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی کے باوجود اپنے متبعین کو یہ نہ بتایا کہ صوم و صلوٰۃ کے مطالبات کیا ہوتے ہیں، غالباً ذہن کی اس ناصافی کا یہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے کانگرس کی ہم خیالی کے باوجود لیگ کے مقابلہ میں اپنے تئیں مذہب کا دلدادہ ثابت کرنا چاہا، اور جب جمعیۃ العلماء ہند کا سوال سامنے آیا تو خود سیاسی بن گئے۔

احرار میں انگریز دشمنی کا منفی جذبہ آخیری حد تک تھا، لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں رہنمائی کا عصا تھا وہ ذاتی طور پر مذہبی لوگ تھے اس لیے ان کی لسانی فضا میں سیاست کی بجائے مذہب کا اثر زیادہ تھا۔ اس منفی جذبہ کے ماتحت میں قید ہوا تھا۔ چونکہ میرا ماحول شروع ہی سے طبعی طور پر غریب و امیر کی کشمکش اور انگریز دشمنی کی جدوجہد سے عبارت تھا اس لیے جیل خانہ کی چاردیواری میں مجھ پر ان لوگوں کے قرب کا زیادہ اثر پڑا جو باثر موجود تھی ہیں، مجھ سے زیادہ تیز اور جن کے فلسفۂ حیات کی بنیاد وہی طبقاتی کشمکش پر ہے۔

میں نے مختلف پروفیسروں سے کمیونزم پڑھنا شروع کیا۔ دو سال تک پڑھتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ میری ذہنی بنیادیں ہل گئیں۔ میں خدا کے وجود سے لے کر تمام اخلاقی اقدار تک کے عقیدے میں ڈانواں ڈول ہو گیا۔ میں نے قرآن مجید کی باقاعدہ تلاوت ترک کر دی، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ مطلب جانے بغیر اس کی تلاوت بے فائدہ ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ (نعوذ باللہ) کو فرصت کے تعقلوں کا

موضوع سمجھتا تھا۔ اور پھر اس مسئلہ کی تضحیک میں خوشی ہوتی جو مذہب کے "بغیر عقلی" وجود سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی اثناء مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مجھے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک ضخیم تصنیف "الجہاد فی الاسلام" بھجوائی۔ میں نے سرسری دیکھا اور کتاب کو سرہانے رکھ چھوڑا۔ کچھ دنوں بعد میرا جیل خانہ کے سپرنٹنڈنٹ سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اس نے مجھے تنہائی میں بھیج دیا اور مارکسزم کے موضوع کی تمام کتابیں روک لیں۔ میں نے اصرار کیا لیکن وہ نہ مانا۔ جب دو چار دن سے مطالعہ تنہائی میں گزر گئے تو میں نے محض دفع الوقتی کے لئے "الجہاد فی الاسلام" طلب کی۔ سپرنٹنڈنٹ ہندو تھا اس لیے مذہبی کتاب سمجھ کر بھیج دینے پر راضی ہو گیا۔ میں نے تین دن میں تمام کتاب پڑھ ڈالی۔ یہ مطالعہ آنکھوں کی مشغولیت تک محدود رہا۔ دماغ میں اس کا ایک دھندلا سا نقش ہی قائم ہو سکا۔ البتہ دل نے ایک لطیف اثر ضرور قبول کیا۔ اب میں نے کتاب کے بیس صفحے بلاناغہ پڑھنا اور ان پر اپنے فہم کے مطابق سوچنا شروع کیا۔ جب میں کتاب ختم کر چکا تو مجھے اپنے دماغ و دل میں حیرت انگیز تبدیلی محسوس ہوئی۔ میں نے قیدِ تنہائی سے نکلتے ہی کمیونزم اور سوشلزم کے مبلغین سے بحث و مذاکرہ شروع کر دیا۔ جب وہ میری زبان سے اسلام کی تصریحات سنتے تو وہ اپنے سوالات بھول جاتے اور انہیں حیرت ہوتی کہ اسلام کا مفہوم مروجہ اصطلاح مذہب سے کتنا مختلف ہے۔

کچھ دنوں بعد میرے پاس مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن حصہ اوّل بھی آ گیا اور سید سلیمان ندوی کے خطباتِ مدراس بھی۔ جو سیرت النبی کی نادرہ روزگار تصویریں ہیں میں نے انہیں غور سے پڑھنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا اسلام عود کر آیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام عقلی حدود سے کوئی خارج فلسفہ نہیں ہے۔

میں نے کچھ دوستوں کو خطوط لکھے، انہوں نے مجھے مولانا ابوالاعلیٰ کی بعض دوسری کتابیں بھجوا دیں۔ میں نے انہیں اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ان کے مطالعہ سے میرے ذہن سے شک و شبہ کے کانٹے نکل گئے اور میں نے پہلی دفعہ اسلام کی عملی بنیادوں کو محسوس کیا۔ میں ان بنیادوں کے بارے میں اپنے ہمراہیوں سے بے تکلف گفتگو کرتا۔ انہیں اپنے تصورات سمجھاتا اور ان کے تصورات سے موازنہ کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنوں میں اپنے نظریات کے متعلق شک محسوس کرتے۔ عجیب نہ تھا کہ وہ اسلام پر ایمان لے آتے یا ان میں سے کچھ اسلام کی عقلی بنیادوں کو تسلیم کرتے لیکن ان کی ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ ان کتابوں کی زبان کو اچھی طرح نہ سمجھ سکتے تھے اور دوسرے وہاں کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا جو انہیں عربی الفاظ و مصطلحات کا حقیقی پس منظر سمجھا سکتا۔

جب میں قید سے چھوٹا تو میرے لیے یہ اطمینان کا موجب تھا کہ میرا ذہن اعتقاداً مسلمان تھا اور اس کا عظیم سبب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں تھیں۔ اس قید سے رہائی کو چھ سال گزر چکے ہیں۔ میں نے اس عرصہ میں ملک کے

طول و عرض کا سفر کیا اور نہایت قریب سے عوامی ذہن کو پڑھا ہے۔ ہمارا معاشرہ آج جن حالات سے دوچار ہے اور ملک کے ذہن پر مختلف عقائد کی جو یلغار ہو رہی ہے اس کے مخصوص معاشی و معاشرتی وجوہ ہیں۔ ان وجوہ کے علی الرغم مسلمان نوجوان کی اسلامیت کو جو تھوڑا بہت سہارا مل رہا ہے، اس کی بڑی وجہ جماعت اسلامی کا ادب ہے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پاکستان بھر میں تنہا آدمی ہیں جن سے الحاد و زندقہ کی صرصر کو ضعف پہنچا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے اعمال و افعال میں ابھی تک اسلام و ایمان کی حقیقی روح پیدا نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو واضح ٹھکانا جماعت اسلامی تھا، لیکن اس کوتاہی کے باوجود میں دیکھ رہا ہوں کہ میری طرح کے سینکڑوں نوجوان جماعت اسلامی کے دینی افکار کی بدولت گمراہی کے راستے سے محفوظ ہو گئے ہیں

خدا معلوم ہماری گورنمنٹ کو کونسی مصلحتیں ہیں جو ابھی تک مولانا ابوالاعلیٰ کی رہائی کے راستے میں مانع ہیں۔ فرض کیجیے اگر ان کے کسی عمل سے حکومت کے کسی عمل کو نقصان پہنچا ہے تو وہ اس فائدہ کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو ان کی ذات سے خود پاکستان کو پہنچا ہے اور اسلام کو پہنچ رہا ہے۔

(۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی واحد شخص ہیں جنہوں نے پاکستان کے ذہنی مواد کی عقلی شاہراہ کا پتہ بتا دیا۔

(۲) انہوں نے اس وقت اسلام کو ایک فلسفۂ سیاست کے طور پر پیش کیا

جب ہماری اسلامیت کو دو صد سالہ غلامی نے متروک العمل قرار دے دیا تھا۔

(۳) ان کی تحریک ہی ایک ایسی تحریک ہے جس کا علم و نظر جدید یورپی نظریات سے ٹکر لینے پر قادر ہے۔

(۴) ان کے افکار میں اسلام کی روحیت اس درجہ موجود ہے کہ نئی پود کا نوجوان اس کو اپنے اندر من وعن قبول لینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

(۵) حکومت جو بہر حال ایک عارضی سفر پورا کر کے ختم ہو جاتی ہے کسی ملک کی جسمانی بغاوت ہی کو اور وہ بھی ایک مخصوص مدت کے لیے قانون کے بل پر دبا سکتی ہے، لیکن ذہنی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی قوت اور کوئی تعزیر نہیں۔ ہمارا معاشرہ شعوری اور غیر شعوری طور پر بعض معلوم اسباب کے باعث اسلام سے ذہنی بغاوت کے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ اگر اس کا مقابلہ کرنے کی سکت کسی میں ہے تو وہ صرف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی فکری جماعت ہے۔ ان کے علاوہ ذہنی مزاج کے سیلاب کو نہ تو شیخ الاسلام کی تاویلات کا الجھا ہوا انداز روک سکتا ہے اور نہ فقیہ شہر کی شرعی تشریحات، جو ان کی دستار فضیلت کے پیچ و خم کی طرح ہر نئی قوت کے ساتھ اپنے اجتہاد کا رنگ بدلتی رہتی ہیں۔

معلوم نہیں ان کی قید کو اتنا طول کیوں دیا جا رہا ہے؟

کیا اس لیے کہ انہوں نے جنگ کشمیر کے متعلق اجتہادی طور پر مختلف رائے

کا اظہار کیا تھا اور جب اصل حالات سامنے آئے تو انہوں نے اپنی رائے میں ترمیم کر لی۔ کیا ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے حکام پاکستان کو ان کی بدعنوانیوں پر ٹوکا اور صحیح مسلمان بن جانے کی ہدایت دی۔

اگر یہ دعوت جرم ہے تو شاید وہ اس دعوت سے کبھی نہیں رک سکتے کیونکہ اس طرح کلمۃ اللہ کا اخفا اور کتمان شہادت ہوتا ہے۔ آخر "پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ" کہنے والوں کے حدود اربعہ میں اسلام ہی محبوس کیوں ہے؟ تعجب کی بات ہے جن لوگوں نے قومی اموال میں خیانت کی، پاکستان کے ملکی ناموس کو گزند پہنچایا، نظم و نسق میں خلل ڈالا، اقربا نوازی اور خویش پروری میں کسر نہ اٹھا رکھی اور رشوت ستانی میں اخلاق و سیرت کے تمام حدود پھاند گئے، ان کے متعلق تو صرف اتنا کہہ کر برأت کا اظہار کر دیا جاتا ہے کہ واضح شہادت میسّر نہیں آسکی ہے، لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جن کی قید حقیقت میں اسلام کی قید ہے صرف اس جرم میں اندر پڑے ہوئے ہیں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ کسی مسئلہ میں اجتہادی اختلاف تھا اور وہ ہم سب کو مسلمان بن جانے کی دعوت دیتے تھے۔

دنیا کیا کہے گی کہ پاکستان کے قانون میں قومی چوروں، ملکی خائنوں، مجلسی لٹیروں اور سیاسی غداروں کے لیے لوچ اور لچک ہے لیکن ایک راستباز زبان کے لیے نہیں جس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کا مطالبہ پیش کرتی ہے اور

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی آواز اٹھاتی ہے۔

اپنے ذہنی تغیر کا واقعہ لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جن تبدیلیوں پر قانون کی سنگینی قادر نہیں ہوتی وہ علم و نظر کی ایک صحبت سے طے پا جاتی ہیں۔ میں جن لوگوں میں رہتا ہوں وہ عوام ہیں، مجھے ایک جیب تراش سے لے کر ایک وزیر اعظم تک کی نفسیات کا اندازہ ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہمارا معاشرہ کدھر جا رہا ہے۔ ہمارے ادب میں کونسی روح بول رہی ہے۔ ہماری سیاست؛ ہماری معیشت، ہماری معاشرت، ہماری تہذیب، ہمارا تمدن اور ہماری ثقافت کے تیور کیا سے کیا ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر پاکستان کے ارباب حل و عقد اپنی گدیوں سے نیچے اتر کر دیکھیں اور لوگوں کے ذہنی مزاج کا جائزہ لیں تو وہ خود ہی محسوس کرنے لگیں گے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی آزادی مملکت پاکستان کے لیے نفع رساں ہے یا قید؟

کیا ہمیں لازم نہیں کہ ہم کمیونزم کے لیے جگہ خالی کرنے کی بجائے اسلام کے لیے جگہ خالی کردیں؟

(۲)

"مولانا جس مقام پر کھڑے ہیں اب امتداد زمانہ کی گردشیں بھی انہیں اس مقام سے ہٹانے پر قادر نہیں، اور ان کی علمی وجاہت اور دینی ثبات اتنی ازاں

ہیں کہ ہر کہ و مہ انہیں کانچ کی شیشیاں سمجھ کر کلوخ اندازی سے توڑ سکتا ہے"۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں ہمارے خیالات ہمیشہ سے الہانہ رہے ہیں۔ ہم ان کے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ علیٰ وجہ البصیرت لکھتے ہیں۔ آج کے لوگ نہ جانیں، یا ان پر بہتان تراش کر اپنے نامۂ اعمال کو گندہ کریں لیکن وہ دن ضرور آئے گا کہ جب دنیا انہیں اسلام کے محسنوں میں شمار کرے گی، اور وہ اس صف میں نظر آئیں گے جہاں ہمارے بڑے بڑے دینی اکابر کھڑے ہیں۔ مگر جوشِ ارادت میں یہ لکھ دینا کہ "جس دن مولانا مودودی جیسا شخص معافی مانگنے پہ اتر آئے گا اس دن پھر اور کوئی نہ رہے گا کہ جس کے کیریکٹر پہ دنیا اعتماد کر سکے"۔ ایک ایسا خیال ہے جس میں ایک گونا سچائی کے باوجود ایک گونا غلو ہے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وصالِ مبارک پر جب صحابہ میں سے اکثر بے اختیار ہو کر اسلام ہی کو ختم سمجھنے لگے تھے تو صدیق اکبرؓ نے تلوار نکال کر اعلان کیا تھا کہ اللہ اور اس کا دین حضور رسالت مآب (فداہ امی و ابی) کی رحلت کے باوجود زندہ ہے، اور جو ایسا نہیں سمجھتا وہ نعوذ باللہ خداوندی میں تحریف کرتا ہے میرے اور اس کے درمیان یہ تلوار ہی فیصلہ کر سکتی ہے۔

یہ واقعہ بجائے خود اس کا مظہر ہے کہ خدا کا دین اور اس کی ضرورتیں اگرچہ اس کے نیک بندوں کی معرفت سرانجام پاتی ہیں، اور دنیا کے لیے ہر زمانہ میں

راہنما شخصیتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، مگر کسی کے لیے یہ مقدر نہیں ہوتا کہ وہ حرفِ آخر ہو، یا اس سے کوئی لغزش سرزد ہو گئی تو پھر دنیا کس پر اعتماد کرے گی؟

مولانا مودودی کا کیرکٹر مثالی ہے۔ انہوں نے موت کی سزا پر جس ایمان کا ثبوت بہم پہنچایا اس پر جتنا فخر بھی کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔ ہر شخص اتنے ثبات کے ساتھ موت کی کوٹھری میں داخل نہیں ہو سکتا، مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ دولت دوسروں سے سلب کر لی گئی ہے، یا اب دنیا میں کوئی اور شخص اس کی مقدرت نہیں رکھتا۔"

سحر طراز موسیو مودودی

رشید احمد ایم اے (پیرس)

میں نے آج تک موسیو مودودی کو نہیں دیکھا۔ میں نے ان کی تصویر بھی نہیں دیکھی میں ان کے حالات زندگی اور اس زبان سے بھی واقف نہیں جس زبان میں وہ اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ اور میں اس وقت ان کے نصب العین سے بھی متفق نہ تھا جب میں نے پہلی مرتبہ ان کی تحریر "سنی" ——— لفظ "سنی" میں نے عمداً استعمال کیا ہے کیونکہ میں بدقسمتی سے "اردو" پڑھنا نہیں جانتا، صرف بولنا جانتا ہوں۔ اور ان کی تحریریں عموماً اردو میں ہوتی ہیں۔

یہاں میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ یورپ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں رواج ہے کہ جب کسی خاص نظریے یا ادبی تخلیق کو پھیلانا چاہتے ہیں تو اس کو پیش کرنے سے پہلے اس کے متعلق خوب پروپیگنڈا کیا جاتا ہے مشہور

ممتاز اہلِ قلم اور شہرت یافتہ اہلِ رائے شخصیتوں سے اپنے اس ادیب یا مفکر کے متعلق ریویو لکھوائے جاتے ہیں، تاکہ وہ صاحب اپنا کارنامہ پیش کرنے سے پہلے لوگوں کے ذہن پر سوار ہو جائیں، اور جب ان کی کتاب لوگوں کے ہاتھ میں آئے تو ذہن پہلے سے مفتوح یا کم از کم مرعوب ہو چکے ہوں۔ یہاں میں اعتراف کرتا ہوں کہ خورشید مودودی کی تحریر "سنتے" سے پہلے مندرجۂ بالا قسم کا کوئی اثر میرے ذہن پر نہ تھا۔ میں بالکل خالی الذہن تھا، بلکہ تنقیدی سوچ (MOOD) میں تھا ــــ نئے ادیب پر ہر کوئی تنقید کرتا ہے میں بھی تنقید پر آمادہ تھا لیکن جب میں نے وہ تحریر پڑھ لی تو ہمت اور کوشش کے باوجود اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سوچ سکا کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے دل کے تمام شکوک شبہات کا تنقیہ کر چکے ہیں۔ کچھ دنوں اس کا اثر میرے دل پر رہا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اثر بھی جاتا رہا اور میں رسالے کا نام بھی بھول گیا ــــ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ اس کے آخر میں قرآن کا لفظ تھا۔ اور خورشید مودودی کا نام بھی بھول گیا۔ میرا ماحول "ملحد" تھا۔ اس نے مجھے فتح کر لیا اور میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ بیسویں صدی میں "خدا" کا وجود ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا ہے، میں بھی اس کے وجود کو ناقابلِ برداشت سمجھنے لگا۔ تعلیم نے، پروفیسروں نے، ادیبوں اور شاعروں نے، فلسفیوں اور لیڈروں نے اس قسم کے خیالات کو تقویت پہنچانے کے لیے لٹریچر کا پورا ذریعہ فراہم کر دیا ہے۔ اس لٹریچر نے میرے قوائے فکر کو خوب ڈسا۔ مذہب اور خدا میرے لیے ایک ایسا معمہ بن گئے جن کے موعودہ انعام محض دھوکہ اور فریب ہوں۔

میں کب تک اس میں غرق رہا! یقیناً میرے موضوع کے لیے اس کی تفصیل مفید نہیں۔ میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ میں ایک زمانے تک اس فلسفے کو بروئےعمل لانے والوں میں شامل رہا۔ اور انتہائی بلندی تک پہنچ گیا۔ لیکن اوپر پہنچنے کے بعد نیچے کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد کچی اینٹوں سے اٹھائی گئی ہے جو سیلاب کے ایک ریلے میں بہہ جائے گی۔ اور اترنے کا راستہ ندارد۔ گویا یہ ایک مینار ہے جس پر صرف چڑھنے کے لیے سیڑھی لگائی جاتی ہے اور جب کوئی مورکھ چڑھ جاتا ہے، سیڑھی ہٹالی جاتی ہے — اس استعارے سے میری مراد بحث، تنقید ہے آزادیٔ بحث و نظر کی چاٹ میں جس گروہ سے میں نے اپنا ذہنی و معاشری ناطہ جوڑ لیا تھا وہ لوگ بس اسی وقت تک تنقید و بحث کی اجازت دیتے ہیں جب تک ان کے اغراض کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اور ایسی تنقیدوں کا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہیں جو ان کے ناجائز اغراض کے لیے مفید ہوں۔ لیکن ایسی تنقیدوں کی ان کے معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں جو ان کے اغراض کے مطابق نہ ہوں، بلکہ ایسا نقاد ان کی نگاہ میں قابل گردن زدنی ہے۔

بالآخر مجھے بھی قابل گردن زدنی بننا پڑا۔ میں اس گروہ سے نکل گیا جس کی کامرانی کے لیے میں نے اپنی تمام قوتیں استعمال کی تھیں، اور قربانیوں سے بھی دریغ نہیں کیا تھا جیل کے بیرک میں اور خفیہ پولیس کے دفتر میں وہ تکلیفیں بھی اٹھائی تھیں، جن کے بعد، انقلاب کا تو ذکر ہی کیا، انسان جد و جہد سے بھی باز آجاتا ہے۔

بلکہ سی۔ آئی۔ ڈی کا ذریعہ معلومات بن جاتا ہے لیکن میں ان میں سے کچھ بھی نہ بن سکا۔ غالباً یہ میرے پٹھان خون کا اثر تھا۔

اس گروہ سے کنارہ کشی کے بعد وطن واپس آیا۔ یہاں میں نے بہت سی سیاسی جماعتوں کا مطالعہ کیا، اور بہت سی سیاسی جماعتوں نے دعوتیں بھی دیں، اور دعوتوں کے ساتھ ساتھ دھمکیاں بھی کہ میں ان کی جماعت میں شریک ہو جاؤں۔ لیکن یہاں بھی میری پٹھان فطرت اور حق جو ذہنیت آڑے آئی۔ میں کسی ایسی چیز کی تائید و حمایت انسانیت کی توہین سمجھتا تھا جس کو میرا دماغ تسلیم نہ کرے ― دل کو میں اہمیت نہیں دیتا ― میں نے ان کی دعوتوں کا جواب انکار میں دیا، کیونکہ میرے دماغ کا یہی مشورہ تھا۔

ایک دن ریلوے اسٹیشن سے واپس آرہا تھا کہ ایک اسٹال پر "لائف" خریدنے کے لیے ٹھہر گیا۔ اسٹال والے نے کہا صاحب "لائف" نہیں آیا ہے۔ یکایک میری نظر ایک کتاب پر جا ٹھہری۔ اس کا نام تھا "مارکسزم اور اسلام" (MARXISM AND ISLAM) ہلکے سے تبسم کی ایک لہر اٹھی۔ میں نے کہا یہ کون بزرگ ہیں۔ جنھوں نے یہ احمقانہ سعی کی ہے، اور معاً گوشۂ چشم سے ایک اور کتاب (AFTER SECULARISM WHAT) نگاہ سے الجھی۔ میں نے دونوں کتابیں خرید لیں۔ آکے ان کو پڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ کم از کم احمق نہیں، گوارا ہیں۔ دوسرے دن اسٹال پر گیا تو ایک چھوٹا سا پمفلٹ نظر آیا (CONSTITUTIONAL

(PROPOSALS BY MAUDOODI)۔ حافظے میں یہ نام ابھرتا سا محسوس ہوا ۔۔۔ کبھی سنا ہے یہ نام ۔۔۔ ساتھ ہی پیرس کی وہ شام یاد آئی جب میں نے ایک مضمون سنا تھا ۔۔۔ وہ مضمون کس کا تھا؟ ۔۔۔ کہیں وہ یہی تو نہیں ۔۔۔ میں نے وہ پمفلٹ خرید لیا اور اسٹال والے سے کہا: بھائی اس رائٹر کی کوئی اور کتاب بھی تمہارے پاس ہے؟ اس نے WHAT IS ISLAM اور ECONOMIC PROBLEMS کے پمفلٹ الماری سے نکالے۔

میں نے تینوں پمفلٹ وہیں کھڑے کھڑے پڑھ ڈالے ۔۔۔ پڑھ رہا تھا اور ایک نئی خوشی سے دوچار ہو رہا تھا میرے دماغ اور ذہن میں ایک عجیب انقلاب غیر شعوری طور پر آ رہا تھا ۔۔۔ عجیب اس وجہ سے کہ میرا دماغ بغیر کسی استدلال کے اب مجھے اس تحریر کا اثر قبول کر رہا تھا ۔۔۔ عجیب اس وجہ سے کہ میرے ذہن کی دنیا میں ایک بہت ہی بڑا انقلاب آیا جس نے میرے سارے تصورات بدل دیئے لیکن جو کچھ اس نے توڑا، اور جو کچھ اس نے بنایا اس کی دھمک بھی مجھے محسوس ہوئی ۔۔۔ میں اس مطالعہ میں محو تھا کہ بک اسٹال والے کی مشفقانہ آواز نے مجھے چونکا دیا:

"صاحب! آپ بیٹھ تو جائیے۔ پانچ بج رہے ہیں ایک بجے سے یہ وقت آ گیا"

واقعی پانچ بج چکے تھے۔ چار گھنٹے گذر گئے اور میں کسی چیز کا سہارا لیے بغیر وہیں بک اسٹال کے پاس کھڑا پڑھتا رہا۔ اُف! کتنا طلسم ہے اس کی تحریروں میں! لیکن میں تو طلسم کا قائل ہی نہیں! نہیں، نہیں، یہ طلسم نہیں، یہ ورائے طلسم کچھ اور ہے۔ وزنی اور

دل کش لیکن تدریجی ترتیب اور خوش سلیقگی سے وابستہ ــــ میں نے ٹیگور کو پڑھا، کیٹس کی شاعری سے لطف اندوز ہوا، میکالے کی نثر اور شیکسپیئر کی ٹریجڈی پڑھی لیکن یہ پر تاثیر ہمہ گیری اور یہ فاتحانہ قوت میں نے ان کی تحریروں میں نہیں پائی۔ مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ ان فن کاروں کی تحریریں، ان کی مقبولیت و عظمت کی روایتوں (پروپیگنڈے) کے باوجود میرے دماغ کو متاثر نہیں کر سکیں۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مودودی کی تحریر نے میرے دماغ پر قبضہ کر لیا۔ انجیل میں وارد ہے کہ "وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا" میں یہی بات، خفیف سے تغیر کے ساتھ کہتا ہوں ــــ اور یہ کہنے میں مجھے کوئی خوف و تذبذب نہیں ہے ــــ کہ "وہ آیا، اس نے پڑھایا اور فتح کر لیا" ــــ مودودی نے مجھے بتایا کہ انسان بندر کی اولاد نہیں، بلکہ انسان ہی کی اولاد ہے، اور اس کو ایک ایسی ہستی نے پیدا کیا ہے جو اس پورے جہان کا، اور ایسے ہی دوسرے جہانوں کا مالک ہے۔ یہ باتیں میں نے مسٹر محمد علی ایم۔ اے (کینٹب) کے ایک پمفلٹ میں بھی پڑھی تھیں، لیکن ان کی تحریر نے اس رہی سہی ہمدردی کو بھی مٹا دیا جو مجھے خدا کے تصور سے باقی رہ گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ احمدیوں کی انجمن اشاعت اسلام لاہور کے ایک کارکن نے جب مجھے احمدیت قبول کرنے کی دعوت دی تھی تو میں نے ان کو جواب دیا تھا "جناب! میں خدا کو نہیں مانتا جس نے آپ کا نبی بھیجا ہے۔ آپ کے نبی کو ماننے کا سوال تو بعد کی چیز ہے" ــــ لیکن آج یہ کیا ہے، میری حاضر جوابی ــــ میرا فلسفہ

مولانا محمد علی لاہوری

—— میرے دلائل —— یہ سب کہاں چلے گئے! ذرا سی دیر میں، ذہن میں اتنا بڑا تغیر!! افکار و تصورات میں اس قدر عظیم انقلاب!!! —— جو کچھ ناممکن تھا دفعۃً ممکن ہو چکا تھا، اور وہی شخص جو ایک بجے خدا کا منکر تھا، پانچ بجے خدا کا مکمل قائل تھا۔

مودودی کی تحریر نے مجھے مسلمان کیا میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔ مودودی کی تحریروں میں دلائل ہوتے ہیں "۲+۲=۴" کی طرح۔ دلیلوں کا انبار نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر دلیل کے بعد سوچنے کے لیے وقفہ، پھر دوسری دلیل۔ وہ اپنے ہم عصروں کی طرح دقیق الفاظ اور دور از فہم دلائل سے قاری کے ذہن کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ سیدھے سادے اسلوب اور سہل زبان میں عام فہم دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں الجھاؤ نہیں ہوتا، اور خاص بات یہ کہ تضاد فکر نہیں ہوتا۔ یہ ایسی خوبی ہے جو مودودی کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور بلند کرتی ہے۔

میں نے مودودی کی دوسری کتابیں نہیں پڑھیں۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن افسوس سے تو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں نے اردو سیکھنی شروع کر دی۔ اسی دوران میں مجھے اس بک اسٹال سے ایک پمفلٹ "مودودی کا مقدمہ" (TRIAL OF MAUDOODI) ملا۔ یہ ایسا پمفلٹ تھا جس نے مودودی کی لیاقتوں کا ایک اور پہلو نمایاں کیا۔ یہ ان کی تفہیم معاملہ کی اعلیٰ استعداد تھی۔ میں ایک بار پھر اس کے مطالعہ میں محو ہو گیا۔ دلائل، اور فلسفیانہ انداز بیان، لطافت تفہیم اور ادبی استعاروں نے مجھے ایک نئے لطف سے بہرہ مند کیا۔ اس کی زبان میں کس

غضب کا جادو تھا بے اختیار میری زبان سے نکلا: اگر جادو کوئی چیز ہے تو یہ عظیم جادو ہے۔ اور مودودی عظیم تر جادوگر!

اس پمفلٹ نے میرے دماغ میں ایک اور انقلاب برپا کیا۔ بک اسٹال والے نے میری دلچسپی دیکھ کر مجھے جماعت اسلامی کے دارالمطالعہ کا پتہ دیا۔ میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ میری ملاقات اپنے ایک ہم عمر سے ہوئی۔ انہوں نے کہا، فیصلہ سنا دیا گیا ـــــ پھانسی"! ـــ میرے دماغ کے سارے تار ایک دم جھنجھنا اُٹھے ـــ سنسنی اور سناٹے کے عالم میں بھی خیالات کی ایک دنیا بس جاتی ہے! ـــ کیا ان فیصلہ سنانے والے ججوں نے مودودی کی تحریریں نہیں پڑھی تھیں؟ ـــ کیا انہوں نے مودودی کا بیان نہیں سنا تھا؟ ـــ وہ کس مٹی کے تھے کہ اس کا بیان سن کر بھی ان پر اثر نہیں ہوا، جبکہ مودودی کی تحریر میں سنگ و آہن کو پگھلا دینے کی قوت ہے؟ ـــ وہ کس ریشے کی رسیاں ہونگی جو اس گردن کا پھندا بن سکیں جس پر صرف خدا کی اطاعت کا قلادہ ہے؟ ـــ وہ کس دل گردے کا جلاد ہو گا جو مودودی کو پھانسی کے تختے پر چڑھائے گا؟ ـــ کیا اس کے ہاتھوں کو رعشہ اور لرزہ بے قابو نہیں کر دے گا؟ ـــ کیا اس کے دل میں خدا کے اس شاہکار کو پھانسی دیتے ہوئے ربِ عظیم کی ہیبت کا خیال نہیں آئے گا؟ جس کے حضور پایانِ کار ایک دن جانا اور جواب دینا ہے ـــ ہاں! وہ ربِ عظیم جس نے اس کو پیدا کیا، اور دماغ دیا اور عقل دی ـــ آن کی آن میں یہ سارے خیالات بجلی کے کوندنے کی طرح آئے۔

اور پھر وہ جو کبھی نہیں رویا تھا، نہ فاقہ کشی میں، نہ خفیہ پولیس کی مار کھاتے ہوئے، اور نہ فائرنگ کے وقت جب گولیاں جسم کے اطراف سنسنا رہی تھیں، اس موقع پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا! ــــــ نہ جانے اس وقت کہاں سے میری آنکھوں میں آنسو پھوٹ نکلے ــــــ جس نے اپنی ماں کی موت پر کہا تھا کہ ہمیں بھی مرنا ہے، مرنے پہ رونے سے کیا فائدہ، اس موقعہ پر یہ فلسفہ بھول گیا اور بے اختیار رو دیا ــــ اور زندگی میں شاید پہلی مرتبہ یہ افسوس ہوا کہ میرے پاس آنسو کم ہیں، یا اس غم کے شایان شان نہیں جو اس وقت میرے دل و دماغ پر مسلط ہے۔

وہ ہم عمر دوست اور نہ جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے، لیکن مجھے کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ گویا میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا گیا ہو۔

رو رو کے مجھے خیال آ رہا تھا کہ جس ہاتھ میں دین کا قلم تھا، کیا اس کو توڑتے وقت ان حاکموں کو خدا کا خوف نہیں آیا؟ ــــ جس زبان سے رب عظیم کی حمد و ثنا اور اس کے دین کی تقدیس کے سوا کوئی غلط بات نہیں نکلی، کیا اس کو محروم گویائی کرتے ہوئے ان حاکموں کو خدا کے حضور جواب دہی کا ڈر محسوس نہیں ہوتا؟

میرے دوست نے کہا ــــــ "پاکستان کے غیور باشندوں کے احتجاج نے حاکموں کو مجبور کر دیا کہ سزائے موت منسوخ کر دیں۔ موت کی سزا چودہ سال قید با مشقت کی سزا سے بدل گئی" ــــــ میرے آنسو تھم گئے۔ میں اطمینان اور غصّے کے ملے جلے جذبے سے چلا اٹھا: "مودودی کا خدا ان سے زیادہ قوی تھا،

جنہوں نے اسے سزائے موت دی تھی۔ اس کے قلم اور اس کی زبان نے یہاں پھر اس کی مدد کی" ـــــ

چودہ سال قید با مشقت!! ـــ کیا تمہارا یہ فرسودہ اور طاغوتی نظام چودہ سال تک زندہ بھی رہ سکے گا؟ ہاں! مودودی کا قلم پھر موتی بکھیرے گا۔ اس کی زبان پھر اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدائیں بلند کرے گی۔ اس کی تقریروں کا امرت ہمارے کانوں میں پھر ٹپکے گا۔ اس کی تحریروں کے جواہر ہم پھر سمیٹیں گے۔ کیونکہ زندگی اسلام کے لیے ہے، اور موت کفر و طاغوت کے لیے ـــ ہم نے ہمیشہ کفر و طاغوت کو چیلنج دیا ہے کہ وہ اپنی موت کے لیے تیار ہو جائے، کیونکہ اسلام کی فکر عظیم کوچ کر چکی ہے۔ اے کفر و طاغوت کے منحوس کرگسو! ہمارے سروں پر نہ منڈلاؤ۔ اے شب پرستو! دفع ہو جاؤ۔ ہم تم سے نفرت کرتے ہیں۔ تم اپنا تنبو ڈیرا اٹھاؤ۔ اس بازار میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں، کیونکہ صبح نزدیک ہے اور مودودی کی تحریروں کا آفتاب ایک بار پھر آسمان پر بلند ہو گا۔ یہ بہت جلد ہو گا۔ میں سوچتا ہوں یہ جلد ہو گا، کیونکہ اور بھی بہت سے لوگ ایسا سوچ رہے ہیں۔ اور اگر تم نہیں بھاگے تو یاد رکھو کہ مودودی کی تحریروں سے پریم کرنے والوں کے بہتے ہوئے آنسو انقلاب کی شمشیر بن جائیں گے۔

---

(۲)

لیکن پاکستان میں ایک تیسری شخصیت بھی ہے جس سے موجودہ برسر اقتدار طبقہ کافی ہراساں ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ غالباً پاکستان میں یہ شخص فرد واحد ہے جو ہر بات ایمان داری سے کہتا ہے اور سچ کہتا ہے۔ یہ شخص جماعت اسلامی پاکستان کا ۲۵ سالہ لیڈر اور مفکر اسلام ابوالاعلیٰ مودودی ہے۔ یہ اپنے سیاسی رقیبوں کے تمام حربے خالی دے چکا ہے

یہ اپنے سیاسی رقیبوں کے تمام حربے خالی دے چکا ہے۔ یہ اپنے مخالفین کی گالیوں اور بہتانوں پر کان نہیں دھرتا اور نہ ہی ان کا جواب دیتا ہے اس صدی میں بہت کم ایسے آدمی ہیں جو اس بے مثال کیرکٹر کے مالک ہیں۔

انہیں ۱۹۵۳ء کے مارشل لا کے زمانے میں ایک پمفلٹ لکھنے کے جرم میں (قادیانی مسئلہ) سزائے موت دی گئی۔ سزائے موت بجائے خود کوئی حیرت انگیز چیز نہیں ہے بلکہ حیرت تو یہ ہے کہ سزائے موت کا حکم سن کر ان کے چہرے پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کا "خدا" "عدالت" کی کرسی پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ بعد میں عوام کے غم و غصہ اور عالم اسلام کے احتجاج سے مرعوب ہو کر حکومت نے ان کی سزائے موت منسوخ کر دی اور چودہ سال کی سزا ان کو مقرر کی گئی۔ کچھ عرصے بعد یہ سزا خود بخود تین سال کی مدت میں تحلیل ہو گئی۔ اور اب جب کہ ان کی سزا کم و بیش چھ ماہ باقی رہ گئی تھی انہیں غیر مشروط طور پر رہا

کر دیا گیا (یہاں پر ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس پمفلٹ کو تحریر کرنے کے جرم میں مودودی کو سزائے موت اور سزائے قید دی گئی وہ بدستور بازار میں فروخت ہوتا رہا اور اس کو باوجود توجہ دلانے کے ضبط نہیں کیا گیا۔ شاید یہ بھی جمہوریت کی کوئی نئی تعبیر ہے) اب موسیو مودودی پاکستان کے عوام کے ہیرو ہیں نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے ہیرو ہیں مستقل کردار اور بے داغ کردار مودودی کی خصوصیت ہے۔ مودودی جماعت اسلامی کے رہنما ہی نہیں بلکہ ایک بہترین اہل قلم اور اسلامی فلسفی ہیں، مودودی جدید و قدیم دونوں علوم پر عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے معاشیات، اخلاقیات، عمرانیات، دینیات اور تہذیب و تمدن کے مسائل پر ۹۰ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ جو اپنی طرز تحریر اور خوبی کے لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ مودودی ایک بے مثال طرز تحریر کے مالک ہیں۔ ان کی تحریر اپنے اندر تسخیر کی قوت رکھتی ہے اور کوئی سنجیدہ شخص ایسا نہیں ہے جو ان کی تحریر سے متاثر نہ ہو۔ ان کی ایک کتاب "اسلام کا نظریہ سیاسی" فرانسیسی میں عنقریب شائع ہو رہی ہے۔ مودودی کی کتابیں دنیا کی مختلف گیارہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اور خراج عقیدت وصول کر چکی ہیں۔

گو موسیو مودودی کی جماعت کے ارکان زیادہ نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود عوام میں ان کا اثر و رسوخ کافی ہے جس کا مظاہرہ موسیو مودودی کی سزائے موت کے موقع پر کیا جا چکا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کا علمی مرتبہ

پروفیسر محمد عثمان
(گورنمنٹ کالج کیمبلپور)

انسانی بڑائی یا عظمت کی کیا پہچان ہے؟ اس سوال کے جواب میں اختلاف کی کافی گنجائش ہے۔ میری نگاہ میں ہر وہ شخص بڑا اور عظیم ہے جو اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کو محنت، ذہانت اور دیانت سے نشوونما دے کر انہیں دوسروں کی بہبود کے لیے وقف کر دیتا ہے اس اعتبار سے سید ابوالاعلیٰ مودودی کو میں ایک بڑا آدمی سمجھتا ہوں اور ان کی دو تین باتوں کا خاص طور سے قائل اور مداح ہوں۔ اول قرآن و حدیث میں ان کی نظر اور نظر سے زیادہ ان کی رائے کا خلوص اور دیانت، گذشتہ سو سال میں ہمارے درمیان دین کے جتنے بلند پایہ عالم اٹھے ہیں میرے نقطۂ خیال سے مودودی کا مرتبہ کسی ایک سے بھی کم نہیں۔ سرسید، مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، مناظر احسن گیلانی، حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔

غلام احمد پرویز۔ یہ لوگ علمِ دین کے نمائندے ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی وقت کے اعتبار سے اس زمرے میں غالباً سب سے بعد داخل ہوتے ہیں۔ لیکن مرتبے کے اعتبار سے وہ شاید کسی کے بعد نہیں۔ انہوں نے اسلام کو زندگی کے ایک ہمہ گیر نظام کی صورت میں نہایت قابلیت سے سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور حیاتِ انسانی کے ایک ایک گوشے پر قرآن و حدیث کی کرنیں بکھیر کر اس کے سیاہ و سفید کو روشن کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ ان کی جامعیت پر نگاہ رکھی جائے تو یہ کہنا محض اعترافِ حقیقت ہوگا کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ (۱۸۵۷ء) کے بعد اتنا انتھک مفسرِ اسلام شاید کوئی اور نہیں۔

دوم یہ کہ ان کے یہاں اسلام کی اخلاقی قدروں پر ایک خاص طرح کا عملی زور (PRACTICAL EMPHASIS) ملتا ہے جو دیگر نمائندگان کے ہاں اگر موجود بھی ہے تو اتنا نمایاں نہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے جہاں ہزاروں (شاید لاکھوں) ناواقفِ دین لوگوں نے دین سے واقفیت اور آگاہی پائی ہے اور ان میں اسلام کی رغبت اور محبت پیدا ہوئی ہے وہاں عملی طور پر اس کے اصولوں کو برتنے کا شعور اور شوق بھی بیدار ہوا ہے۔ اور ان سے متاثر لوگ بالعموم جھوٹ، فریب، بدمعاملگی، بے حیائی، بددیانتی، رشوت، سود اور اس قبیل کی دوسری اخلاقی اور معاشرتی قباحتوں سے بڑی حد تک بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی تحصیل (ACHIEVEMENT) نہیں۔

سوم یہ کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی میں جدید خیالات اور عہدِ حاضر کی تحریکات اور

تقاضوں کا ایک فہم ملتا ہے جس کی وجہ سے بمقابلہ ٹھیٹ علماء دین کے ان کے خیالات میں واقعیت پسندی (REALISM) کی ایک شان موجود ہے۔ ان کی تحریریں وقت کے بہت سے مقتضیات کا حل اور بہت سی الجھنوں کا سلجھاؤ پیش کرتی ہیں۔ آپ کو ان سے اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن آپ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ وہ جدید تمدن کے اکثر مسائل سے آگاہ اور نئے انسان کی بہت سی مشکلوں سے واقف ہیں۔ روح عصر سے واقف رہنے کی مسلسل اور دیانتدارانہ سعی ہمارے جلیل القدر علمائے دین کی بہترین روایات میں سے ہے اور آج معدودے چند اور علماء کے علاوہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کا قلم بھی اس اعلیٰ روایت کا محافظ اور علمبردار ہے۔

اپنی ساڑھے تیرہ سو سالہ تاریخ میں ہمیں تین قسم کے علمائے کرام ملتے ہیں ایک گروہ ان مقدس لوگوں کا جو اپنے سینوں کو قرآن کے نور سے اور سیرت رسول پاک صلعم کی ضیاء سے منور کر کے مدت العمر اس چراغ کو دوسروں کے سینوں میں روشن کرتے رہے۔ تعلیم و تعلم، تحقیق و تفقہ اور تصنیف و تالیف کو زندگی کی بہترین متاع اور آخرت کا سب سے عمدہ توشہ خیال کیا۔ شاہان وقت اور امرائے زمانہ سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ دنیاداری کے تمام فرائض انجام دیئے اور دنیاداروں کے
۵
ساتھ باقاعدہ معاشرت کا لین دین نباہا۔ مگر عسرت میں بھی اور خوشحالی میں بھی استغناء اور فقر کا دامن ہاتھ سے نہ دیا۔ دوسرے وہ جنہوں نے علم دین کو

حصولِ جاہ وحشم کا ذریعہ بنایا۔ اپنے زمانے کے بادشاہوں سے گہرا ربط ضبط رکھا۔ بدلتی ہوئی سیاست کا ساتھ دیا۔ اور بڑے سے بڑا منصب پایا۔ تیسرا گروہ ان علماء کا ہے۔ اور ان کی تعداد باقی دونوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے جن کی بے تاب طبیعت محض علم اور وعظ و تصنیف سے کبھی مطمئن نہیں ہوئی۔ انہوں نے شاہان وقت سے بے نیاز رہ کر اور ریا اور خانقاہ ترک کرکے اپنے ذہن کی ضیا اور دل کی گرمی کو ہمیشہ خارج میں ایک نئی سوسائٹی۔ ایک نئے مسلم معاشرے کی صورت میں ڈھالنے کی جدوجہد کی۔ ان میں سے اکثر کو ناکامی ہوئی۔ اور بعض کی ناکامی خود ان کی تحریک کے کسی نہ کسی پہلو میں مضمر تھی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان حضرات کی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں نے ہماری تاریخ کو متاثر کیا اور کروڑوں اربوں انسانوں کی زندگی کے دھارے بدل ڈالے۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی بھی اس گروہ کے ایک فرد ہیں۔ ان میں علم کے وزن کے ساتھ ساتھ ایک انقلابی تڑپ ہے اور اپنے گروہ کے دوسرے ممتاز نمائندوں کی طرح انہوں نے بھی لاتعداد انسانوں کو اپنی تڑپ میں شریک کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ صرف مستقبل کا مؤرخ ہی کرے گا کہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا مقام اسلام کے ان انقلابیوں میں کہاں اور کیا ہے اور یہ کہ ان کی کون کونسی خوبی اور خامی ان کی کس کس کامیابی اور ناکامی کی ذمہ دار ہے۔

ایک اور بات جو سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں خاصی قابلِ ذکر ہے اور جس کی طرف میرا خیال ہے عام ذہن بہت کم منتقل ہوتے ہوں گے۔ ان کا طرزِ تحریر

ہے۔ اچھا اسلوب بیان ایک نعمت ہے۔ اس کی بدولت تحریریں اثر اور جاذبیت کا رنگ آتا ہے۔ عالمانِ دین کی اکثریت تو اس وصف سے عاری دیکھی گئی ہے لیکن اس حلقہ سے جن کو قدرت کی طرف سے تحریر یا تقریر کا ملکہ ودیعت ہوتا ہے پھر ان کی نظیر مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اردو میں سرسید، مولانا شبلی، ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی کے منفرد اسالیب سے کون واقف نہیں۔ سرسید کے ہاں عبارت کی رنگینی اور الفاظ کا شکوہ نہیں ملتا۔ مگر ان کی پرخلوص سادگی اور سلاست میں بڑی قوت اور تاثیر ہے اور ان کا بیان واقعی دل میں اتر جاتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کے اسلوب میں پہاڑوں کا جلال، موجوں کی تندی اور دریاؤں کی روانی ہے شبلی کا انداز رنگینی اور سلاست کا دلآویز امتزاج ہے۔ عبدالماجد کے چھوٹے چھوٹے فقرے شبنم کی لطافت مگر تلوار کی کاٹ رکھتے ہیں۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلوب بیان بھی بڑا جاندار اور پُراثر ہے۔ ان کے یہاں کہیں کہیں طوالت کا احساس ضرور ہوتا ہے اور بعض جگہ ساختگی کا رنگ جھلکتا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کا طرزِ بیان شگفتہ اور پرخلوص ہے وہ اپنے خیال کو بڑی صفائی، زور اور صحت کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور بعض دفعہ اس کے لیے ایسے مناسب اور نپے تلے الفاظ ڈھونڈھ کے لاتے ہیں۔ یا بے تکلف لے آتے ہیں کہ ان سے بہتر الفاظ اس خیال کے لیے ممکن نہیں۔ ان کا طرز (موجودہ عہد کے لیے) شبلی اور ابوالکلام آزاد دونوں سے اس لحاظ سے بہتر ہے کہ عوامی ہے، ان کے سلیس اور

اسلوب میں خیال اور بیان کا آہنگ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ معمولی رو وال انداز میں لکھتے لکھتے جب ان کا خیال منتہا (CLIMEX) کو پہنچتا ہے تو ان کا بیان بھی اسی نسبت سے جاذب اور پر زور ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے کا دل اس حصے کو متعدد بار پڑھنے کو چاہتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر ان کی تحریروں سے ایسے حصے یا پیراگراف علیحدہ کر لیے جائیں تو ایک چھوٹی سی کتاب بن جائے جو خالص انشاپردازی کے نمونے کا کام دے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کو بڑا انسان سمجھتا ہوں اور آپ شاید مجھ سے اتفاق کریں کہ بعض اوقات بڑے انسانوں کی غلطیاں اور محرومیاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوسروں سے بڑھ چڑھ کر غلطیاں کرتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی رائے کی عدم صحت اور ان کے قلم کی لغزش بھی چونکہ ہزاروں دوسرے انسانوں کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کی قوت رکھتی ہے اس لیے کہ ان کی غلطی اثر اور نتیجہ کے اعتبار سے بڑی اور بے پناہ بن جاتی ہے۔ یوں بھی بڑے انسان آخر انسان ہوتے ہیں اور ان سے خطائیں اور کوتاہیاں سرزد ہو سکتی ہیں لیکن جہاں عام آدمی اپنی خطا اور کوتاہی سے بالعموم آسانی سے رجوع کر لیتا ہے۔ بڑے انسان اپنی ذات اور رائے پر غیر معمولی اعتماد رکھنے کے باعث ایسے توقف سے بہت کم سر کتے ہیں۔ میرے نزدیک سید ابوالاعلیٰ مودودی ان بڑے لوگوں میں سے ہیں جو اپنی زندگی کے بعض نازک اور اہم فیصلے اتنے بڑھے ہوئے اعتماد کے بل پر

بعض اور برائیاں ایسی ہیں کہ کسی بھی سوسائٹی کے لیے باعث ننگ اور وجہ خسران بن سکتی ہیں۔ مگر انہی باتوں کے ساتھ ساتھ ان میں بعض ایسی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں جو بے حد قابل تعریف اور لائق تحسین ہیں۔ ان کی حریت پسندی اور حقوق شناسی، قومی ہمدردی اور اجتماعی امور میں ان کی بے نفسی، ان کی صدق گوئی اور خوش معاملگی، ان کا استقلال اور پامردی، ان کی فرض شناسی اور ضابطہ پسندی، ان کا ذوق تجسس اور جذبۂ تحقیق و تفتیش، سائنس اور فلسفہ کی دنیا میں ان کی غیر معمولی حیرت انگیز ایجادات واکتشافات، یہ خوبیاں ایسی ہیں کہ کوئی دیانتدار شخص ان کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ خامیاں اور خوبیاں مل کر موجودہ یورپ کی تشکیل کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں علماء کی ایک بھاری تعداد نے یورپ کی زندگی کو ہمیشہ ادھورا دیکھنے اور ادھورا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ان کے پیش نظر ایک ملی مفاد بھی تھا۔ وہ مغرب زدگی کی رو کو روکنا چاہتے تھے۔ لیکن اس مقصد کے لیے انہوں نے بالعموم جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ حقیقت پسندانہ نہ تھا۔ اپنی تہذیبی قدروں سے محبت کرنے، ان کی سچائی میں پختہ یقین رکھنے اور ان میں کسی طرح کے ردوبدل کو پسند نہ کرنے کے معنی یہ تو نہیں کہ آپ دوسروں کی تہذیب و تمدن میں کوئی خوبی اور کوئی معقولیت نہ دیکھیں۔ پہلی بات ہر قوم کی زندگی اور ہر مذہب کے فروغ کے لیے بھی ضروری ہے اور بہت حد تک فطری بھی۔ دوسری چیز ایک پیچیدہ نفسی بیماری ہے۔ جو اگر پھیل جائے تو سارے معاشرے کو روگی بنا سکتی ہے۔ دقیق نظر قومی رہنما وہ ہے جو

اس بات کا خیال رکھے کہ اس کی تحریروں سے پڑھنے والوں کے دل میں جہاں اول الذکر حیاتیاتی اور حیات بخش احساس بیدار ہو۔ وہاں تعصب کا نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL) مرض بجز نہ پکڑنے پائے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں اپنے اثر و ردِ عمل کے طور پر متذکرہ بالا نفسیاتی بیماری کے جراثیم بھی رکھتی ہیں۔

آج کی دنیا میں فرنگی مدنیت، ایک ایسی واقعیت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں یہ اعلان کرنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ نظامِ تمدن بڑی حد تک ہمارا حریف ہے۔ اور ہم اس کے حریف ہیں۔ لیکن مسلمان کو بزدل یا اوچھا دشمن تو نہیں ہونا چاہیے کہ حریف کے دن کو بھی رات کہے۔ بہترین انسانی روایات یہ ہیں کہ دشمن سے بھی انصاف برتا جائے۔ اس کی برائی کو برائی اور اچھائی کو اچھائی کہہ کر اس کا سامنا کیا جائے۔ ایسا کرنے سے نظر کی وسعت اور فکر کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اور بسا اوقات انسان دشمن کی نظر میں بھی محترم ٹھہرتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں دشمن کی نظر میں محترم ٹھہرنا تبلیغ کا پہلا قدم ہے۔ انگریزی کے مشہور مقولے "شیطان کی بھی داد دو جس حد تک وہ مستحق ہے" (GIVE THE DEVIL HIS DUE) پر اگر ہم عمل نہ کریں تو کچھ مضائقہ نہیں، لیکن قرآن کی اس آیت سے کہ کسی قوم کی دشمنی سے ایسا نہ ہو کہ تم اس سے انصاف نہ کرو۔ انصاف سے کام لو۔ (لا یجرمنکم شنئان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا)۔

ہم کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ اگر بھاگ نکلنے بھی رہے ہیں تو ہمیں بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ اس پہلو پر تفصیل سے بات کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ اپنی اس روش سے ہم دشمن کا تو کچھ بگاڑ نہ سکے۔ البتہ اپنا اور اسلام کا بہت کچھ بگاڑ چکے ہیں قرآن کا یہ ارشاد کسی خاص شعبے یا معاملہ تک بس نہیں بلکہ انسانوں کی طرف مسلمان کے طرزِ عمل کا دستورِ اساسی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، اس طرزِ عمل کو اختیار کرنے کا وقت کب آئے گا؟

معاشی امور میں قرآن ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے مگر یہ حق غیر مشروط نہیں ذاتی مال و زر اس لیے نہیں کہ ہم اور آپ تو داد عیش دیتے رہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے لاکھوں کروڑوں انسان اس آرزو اور کشمکش میں تڑپا کریں کہ کسی طور ان کے جسم و روح کا رشتہ قائم رہ سکے۔ اگر ذاتی ملکیت سے یہ سنگدلی اور شقاوت مراد ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں قرآن اس کا سخت ترین دشمن ہے۔ اس کے معاشرے میں تو ذاتی ملکیت افراد کی شخصیت کی تکمیل کا ایک ذریعہ اور بہانہ ہے۔ کہ وہ جائز ذرائع سے خوب کمائیں۔ اور اپنی جائز ضروریات کو پورا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے اسے خدا کی راہ یعنی، دوسروں کی بہبود میں فراخدلی سے خرچ کریں۔ اور یوں خدا اور انسانیت سے اپنی محبت اور شیطان سے اپنی نفرت کا ثبوت دیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن نیکی کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے ملزوم نہ کرتا کہ دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے امیروں کے ایک طبقے ہی میں گھومتی رہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن اپنے معاشرے کو انصاف، اخوت اور ہمدردی کی فطری بنیادوں پر اٹھوانا چاہتا ہے۔ اگر آپ کے آس پاس اور دور نزدیک ہر شخص زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بہرہ مند ہے تو اپنے کمائے ہوئے مال و زر سے آپ کو ہر جائز آسائش اور ہر معقول راحت کا حق ہے۔ آپ اپنے بیوی بچوں کے لیے لاکھوں کا ترکہ چھوڑیں۔ آپ سے خدا ناراض اور نہ انسانیت بیزار۔ لیکن اگر معاشرے کے حالات بصورت دیگر ہیں۔ اور سسکتی ہوئی انسانیت اور مسلمانی آپ سے ایثار و قربانی کا تقاضا کرتی ہے تو پھر آپ کو "قل العفو" پر عمل کرنا ہوگا۔ اور اس بات کی فکر نہ کرنی ہوگی کہ وراثت والی آیات کا اطلاق کہاں اور کیونکر ہوگا۔ جو سوسائٹی خدا اور انسانیت کے نام پر ایثار کرتی ہے۔ اس کی انفرادی اور اجتماعی خوشحالی دور نہیں۔ اور وراثت والی آیات پر عمل درآمد ہونے کے حالات جلد پیدا ہو جاتے ہیں۔

اخلاق اور معیشت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب تک کسی قوم کا معاشی ڈھانچہ ہموار اور معقول نہ ہوگا۔ اس کے اخلاق و کردار کی صحیح نشو و نما ممکن ہی نہیں۔ "قرآن"، "مسلمان" اور "مومن" کا کردار ہوا میں تعمیر نہیں کرتا۔ وہ اول ایک متوازن اور مبنی بر انصاف معاشی نظام کی صحت مند فضا پیدا کرتا ہے۔

پاکستان کا موجودہ معاشی ڈھانچہ اسلام کے نظامِ معاش سے اس قدر بعید ہے کہ اسے آپ اسلام کی ضد کہہ سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کوئی

شخص اسلام کے نظامِ اخلاق پر بڑا زور صرف کرے۔ مگر اس کے معاشی نظام کو برپا کرنے کے سوال کو ثانوی حیثیت دے تو میرے نزدیک اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایک خوب صورت عمارت سطحِ زمین پر کھڑی کرنا چاہے اور اس کے لیے بنیاد کھودنے کو ضروری نہ سمجھے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی بڑی حد تک ایک ایسی مثال پیش کر رہے ہیں۔

اگر اسلامی ممالک میں اسلام کا کوئی مستقبل ہے (اور مجھے یقین ہے) تو اس کی یہی صورت ہے کہ ان ممالک میں جس قدر جلد ممکن ہو اسلامی اقتصادی انقلاب برپا کیا جائے۔ یہ انقلاب (بنیادی اقتصادی تبدیلی) زمانے کا تقاضا ہے فطرت کا اشارہ ہے۔ وقت کی ضرورت ہے۔ یہ ہو کر رہے گا۔ اگر اسلامی نہ ہوا تو غیر اسلامی ہو گا۔ آج ہر وہ اسلامی تحریک جس کی نگاہ سے یہ نکتہ اوجھل ہو گیا یا اوجھل رہا۔ ناکامی کی ایک دلدوز مگر عبرتناک داستان بننے والی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اخلاق اقتصاد کی پیداوار ہے۔ ہمارے نزدیک اخلاق توحید و رسالت کی شاخ سے پھوٹتا ہے۔ لیکن خود یہ شاخ ہری نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا پودا ہموار معاشی سرزمین میں نہ لگایا جائے۔ آج اگر توحید ایک زندہ قوت نہیں تو اس کی وجہ یہی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے حال ہی میں معاشی مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے مگر ان کے نظامِ فکر میں پھر بھی اقتصادی مسئلہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو ہونی چاہیے۔ میری سمجھ میں اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ آج سے

تیس چالیس برس پہلے جس ماحول اور زمانے میں انہوں نے زندگی کے حقائق اور قرآن کے معارف پر غور کرنا شروع کیا۔ اس وقت کم از کم مشرق کی دنیا اقتصادیات اور اقتصادی مسائل کی اصل اہمیت سے آشنا نہ تھی۔ دوم یہ کہ انہوں نے کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اور تعلیم و تعلم کے خوشگوار ماحول میں ہوش سنبھالا۔ سوائے رمضان کی عبادت کے وہ بھوک کی شدت اور افلاس کی تلخی سے واقف نہ ہوئے اور خلوت پسند ہونے کے باعث ان گلی کوچوں میں قدم رکھنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی جن کا وجود "اسلام" اور انسانیت پر ایک خوفناک طنز ہے (اور چیلنج بھی)، اور جن کی موجودگی میں تعمیرِ اخلاق کا ڈھول ڈالنا، اگر واقعات کا منہ چڑانا نہیں تو ان سے آنکھ چرانا ضرور ہے۔

ایک بات میں سید ابوالاعلیٰ مودودی ہمارے اکثر علمائے کرام سے بہت مختلف ہیں۔ ہماری قدیم اور اعلیٰ روایات میں ایک یہ بھی ہے کہ علمائے اسلام قرآن و تفسیر اور فقہ و حدیث کے علاوہ علم و ادب کے دوسرے شعبوں میں بھی خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ کسی نے فلسفہ و طب میں کمال حاصل کیا تو کوئی شعر و سخن یا تحقیق و تفتیش کے میدان میں ممتاز ہوا۔ خود ابوالاعلیٰ مودودی کے بزرگ اور ساتھی ہمعصروں کی یہی کیفیت ہے۔ مولانا شبلی نے "الکلام"، "علم الکلام"، "الفاروق" اور "سیرت النبی" کے ساتھ ساتھ شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر لکھا۔ ابوالکلام آزاد نے "ترجمان القرآن" کے علاوہ متعدد ادبی تنقیدیں لکھیں اور خالص علمی موضوعات

پر بارہا قلم اٹھایا یا شعر تو گویا ان کی گھٹی میں تھا۔ سید سلیمان ندوی نے ایک طرف ارض القرآن اور سیرت النبی کا گویا انسائیکلوپیڈیا تیار کیا۔ اور دوسری طرف نقوش سلیمانی اور عمر خیام جیسے خالص ادبی تحقیق و تنقید کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ مفسر قرآن عبدالماجد اردو مثنوی اور غزل کا نقاد بھی ہے اور "فلسفۂ جذبات" کا مصنف بھی شعر و ادب کے مطالعہ اور لگاؤ سے شخصیت میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور لوچ پیدا ہوتا ہے، اور مخالف رائے کو قدرے ہمدردی اور حوصلے کے ساتھ سمجھنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے خیال کی پختگی اور مزاج کی استقامت میں فرق آئے، بلکہ اس سے اکثر وہ بات پیدا ہوتی ہے جسے اقبال نے "محبت فاتح عالم" سے تعبیر کیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ سید ابوالاعلیٰ مودودی میں اس کی خاصی کمی نہیں؟

شخصیت ــــ جس سے ہم متاثر ہوئے

شیخ احمد اللہ ظفر

میں نے بچپن سے ہی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق سن رکھا تھا۔ میرے والد صاحب مولانا کے بڑے معتقد تھے۔ ہمارے گھرانے میں اسلام کی بگڑی ہوئی شکل رائج تھی۔ اسلام کو محض روزہ اور نماز کا دین باور کر لیا گیا تھا۔ اوہام پرستی عام تھی۔ کسی نہ کسی پیر کا مرید بننا لازمی سمجھا جاتا تھا۔ مشہور تھا کہ جب تک کوئی شخص کسی پیر کے دامن میں پناہ نہیں لے اُس وقت تک اُس کا اسلام مکمل نہیں ہوتا۔ اسلام کے ساتھ طرح طرح کی جاہلیتوں کو ملا دیا گیا تھا۔ اس طرح اسلام ایک عجیب سی معجونِ مرکب بن کر رہ گیا تھا۔

ایسے حالات میں میرے والد صاحب کا اسلام کے ہمہ گیر تقاضوں کو اپنانا اور اسلام کی پوری دعوت پر لبیک کہنا ایک انقلاب آفریں قدم تھا۔ ہمارے عقائد کی بنیادوں ملے

بنی ہوئی شکل پر ایک کاری ضرب تھی ۔ اگرچہ میرے والد صاحب اپنے گھر کے سربراہ تھے لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے اس اقدام پر کچھ نہ کچھ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نظریہ کو اپنانے سے چونکہ معاشی طور پر بھی میرے والد صاحب کو نقصان اٹھانا پڑا تھا اس لیے ہمارے رشتہ داروں میں اُن کے خلاف عام ناراضگی پھیل گئی۔ چونکہ اس نظریہ سے اُن کے اختیار کیے ہوئے نام نہاد اسلام کا پول کھلتا تھا اس لیے وہ مزید بھڑک اُٹھے اور اُن کے دلوں میں خود مولانا مودودی کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ کیونکہ اُن کے معاشرہ میں اس بحران کو پیدا کرنے کی براہ راست ذمہ داری آپ پر ہی عائد ہوتی تھی۔

میں ان تمام ہنگاموں اور ان تمام حالات سے بے خبر اپنا بچپن گزار رہا تھا۔ مجھے معلوم تک نہ تھا کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ جُوں جُوں میں ہوش سنبھالتا گیا میری دادی صاحبہ (میرے والد صاحب کے نظریہ کی سب سے بڑی مخالف میری دادی ہی تھیں۔ اب خدا کا فضل ہے کہ وہ بھی غائبانہ طور پر مولانا کے متعلق بڑی اچھی رائے رکھتی ہیں۔ خاص طور پر جب مولانا کو پھانسی کی سزا سنائی گئی، اور انہوں نے اس مرحلہ پر بھی مومنانہ عزیمت سے کام لیتے ہوئے مقدمے کے ایک فریق کے سامنے رحم کی درخواست کرنے سے انکار کر دیا تو ہماری دادی صاحبہ پر اس کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے مولانا کو مجاہد کا خطاب دیا۔ آج کل پوزیشن یہ ہے کہ جب کبھی مولانا کے بارے میں کوئی بات ہوتی ہے، وہ بے تاب ہو کر اُن کے لیے اور اُن کے بچوں کے

لیے پُرخلوص دعائیں کرتی ہیں۔) مولانا صاحب کے متعلق نفرت انگیز باتیں میرے کانوں میں ڈالی گئیں۔ اور میں اُن کو اپنے دل میں بٹھاتا چلا گیا۔ چونکہ ہمارے خاندان اور احباب کی مجموعی رائے مولانا صاحب کے متعلق بڑی خراب تھی۔ اس لیے میرا دل بھی کچھ نہ جاننے بوجھنے کے باوجود مولانا صاحب کی طرف سے نفرت پکڑتا چلا گیا اور میں مولانا کو اور اُن کی تحریک کو دین کے لیے فتنہ اور مسلمانوں کے لیے تباہی سمجھنے لگا۔ یہی وہ پس منظر تھا جس کی بنا پر میں نے والد صاحب کے اصرار کے باوجود پٹھانکوٹ جاکر مولانا سے تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔

قیام پاکستان کے وقت میرا ذہن شعور کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اگرچہ وہ پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی جو کسی مسئلہ پر رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی مولانا کے متعلق میری وہی رائے رہی جو بلا کسی دلیل کے میرے ذہن میں بٹھا دی گئی تھی۔

قیام پاکستان کے تقریباً تین سال بعد حسن اتفاق سے مولانا کی تصنیف "حقیقت اسلام" میرے زیرِ مطالعہ آئی۔ یہ پہلی ضرب تھی جو میرے برسوں کے قائم کیے ہوئے خیالات پر پڑی۔ مجھے اپنا نظریہ ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا نظر آیا۔ ریت کے وہ محل جو میں نے مدتوں سے بنا رکھے تھے، مولانا کی تحریر کی آندھی سے بکھرنے شروع ہو گئے۔ مجھے اپنے احباب کی قائم کی ہوئی ہوا اُکھڑتی محسوس ہوئی۔ میں جیسے خواب دیکھتے دیکھتے چونک پڑا۔ تاج کمپنی کے زیرِ اہتمام چھپے ہوئے مولانا کے پانچ مقالموں

میں سے ایک یہ پہلا پمفلٹ پڑھتے ہی میرے خیالات کے تار پود بکھر کر رہ گئے۔ میرے دل میں تجسس اور تحقیق کا خیال پیدا ہوا اور میں نے اس سلسلے کی دوسری کڑی "حقیقتِ صوم و صلوٰۃ" کا مطالعہ کیا۔ اللہ، اللہ! حقائق کا ایک سمندر تھا جو اُمنڈا چلا آرہا تھا۔ بقول شیخ عنایت اللہ صاحب مینجنگ ڈائرکٹر تاج کمپنی کے الفاظ میں واقعی مولانا نے دریا کو کوزہ میں بند کر کے رکھ دیا تھا۔ جُوں جُوں میں ان پمفلٹوں کو پڑھتا گیا، مدتوں سے پڑی ہوئی میرے دل کی گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ میرا دل ایک نئی روشنی سے منور ہوتا چلا گیا۔ کوئی غیر مرئی قوت میرے دل سے سابقہ بے بنیاد اور بے دلیل خیالات کو کھرچ کھرچ کر نکالتی گئی۔ اور اُن کی جگہ نئے خیالات کے پودے لگاتی چلی گئی۔ اسلام کا ہمہ گیر تصور میرے ذہن میں رقصاں تھا۔ اور میری مضطرب نظریں مولانا کی انقلاب انگیز تصانیف کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مطالعہ کرتی رہیں۔ میرے دل میں ایک نیا ولولہ بیدار ہو گیا۔ میرے بے چین دل کو سکون مل گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا۔ جیسے کڑاکے کی گرمی کے بعد ایک فرحت بخش بارش ہو گئی ہو——میرے دل نے کہا کہ ہاں! یہ ہے دین کی اصل دعوت اور یہ ہے اس کے پیش کرنے کا طریقہ۔

ایک مرتبہ میں نے اور میرے تین دوستوں نے یہ ارادہ کیا کہ ہم مولانا موصوف کا نیاز حاصل کریں۔ اس ارادہ سے ایک روز ہم گوجرانوالہ سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم چاروں میں سے صرف ایک دوست مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ باقی تین (جن میں میں بھی شامل تھا)۔ دوستوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا

ہم سب کے دلوں کی عجیب کیفیت تھی۔ایک کپکپی سی ہم پر طاری تھی۔خاص طور سے مجھ پر ایک خاص قسم کا نفسیاتی وقت تھا۔میرا دل غیر معمولی مسرت اور فخر کے جذبات سے لبریز تھا۔اور یہ مسرت اور فخر کی آمیزش اتنی شدید تھی کہ بیک وقت میں کانپ بھی رہا تھا اور میرا دل بلیوں اچھل بھی رہا تھا جیسے کہ ابھی سینے سے باہر نکل کر زمین پر آ رہے گا۔میں سوچنے لگا کہ ابھی میں مولانا صاحب سے میلوں دور ہوں تو میرے دل کی یہ حالت ہے۔جب اُن سے ملا تو پھر کیا ہو گا؟ اس مرحلہ پر مولانا کی تحریریں میرے سامنے اُبھر اُبھر کر آئیں اور کہنے لگیں کہ تمہارا خوف کرنا بے جا ہے۔وہ جتنا باوقار ہے، اتنا ہی سادہ بھی ہے۔

یہ واقعہ ۶ر جولائی ۱۹۸۱ء بروز جمعہ کا ہے۔اس روز عید الفطر کا مبارک تہوار بھی تھا۔لاہور پہنچ کر ہم نے آسٹریلین مسجد میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا خطبہ جمعہ سُنا اور سیدھے اچھرہ روانہ ہو گئے۔مرکز پہنچے۔دفتر کے باہر میاں طفیل محمد صاحب قیّم جماعت اسلامی پاکستان تشریف فرما تھے، اُن سے مولانا کے متعلق استفسار کیا۔انہوں نے بتایا کہ مولانا جمعہ کی نماز پڑھ کر واپس آ چکے ہیں اور عادت کے مطابق آرام فرمانے گھر چلے گئے ہیں۔آپ عصر کے وقت آ سکیے گا۔"ہم نے بتایا کہ ہم گوجرانوالہ سے آئے ہیں اور آج ہی ہمیں واپس چلے جانا ہے اس لیے اگر ہو سکے تو ابھی اُن سے ملاقات کرا دیجیے۔کچھ دیر تامل کے بعد میاں صاحب اُٹھ کر چلے گئے اور ہم اُمید و بیم کی حالت میں وہاں بیٹھ گئے۔میرا اور اُن صاحب کا جو اس سے

پہلے مولانا صاحب سے ملاقات کر چکے تھے) یہ خیال تھا کہ مولانا ہمیں ابھی ملاقات کا شرف عطا فرمائیں گے اور ہماری یہ توقع غلط نہ نکلی۔ تھوڑی ہی دیر بعد امیر جماعت کے دفتر کا دروازہ اندر سے کھلا اور ادھر سے میاں صاحب نے آکر ہمیں بتایا کہ آپ مولانا سے مل سکتے ہیں۔ مولانا ابھی سوئے نہ تھے جبکہ انہیں ہمارے آنے کی اطلاع ملی۔ اور انہوں نے ہماری خاطر اپنے آرام کو چھوڑ دیا۔ کتنا بلند اخلاق تھا یہ انسان! میں نے بیسیوں لیڈر اور رہنما اور معمولی معمولی عالم دیکھے ہیں جو معمولی حیثیت کے لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن یہ انسان اپنا ایک منفرد مقام رکھتا تھا جس کی وجہ سے اُس نے اپنے آرام کے وقت کی قربانی دے ڈالی۔

میں اپنے تینوں دوستوں کے ساتھ اُٹھا اور مولانا سے ملنے کے لیے چل پڑا۔ آج میں اُس شخصیت سے ملنے والا تھا جس کے علم و عرفان کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل چکا تھا۔ ہاں وہ عالم جس نے زندگی کے ہر گوشے اور انسانی حیات کے ہر شعبے کی مشکلات کو کتاب و سنت سے حل کر دکھایا تھا اور جس نے نظام اسلامی کو دنیا کے دیگر نظاموں کے مقابلے میں مضبوط اور مسکت دلائل کے ساتھ بلند و برتر ثابت کر دیا تھا۔ ہاں وہ شخص جس کی تحریریں لاکھوں گمراہ اور غافل انسانوں کو جگانے اور اُن کے قلوب و اذہان کو اسلام کی تابندہ روشنی بخشنے کا ذریعہ ثابت ہوئی تھیں ـــــ ہاں وہ مجاہد جو اس پُرفتن دور میں اسلام کا جھنڈا بلند کیے ہوئے تھا اور اس وقت نظام باطل کے علمبرداروں کی نظروں میں خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔

ہاں وہ اولوالعزم انسان جو حق کی خاطر بیس ماہ تک جیل میں رکھا گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے میرا دل لرزا۔ جسم پر گھبراہٹ طاری ہوئی لیکن پھر میں نے اپنے دل کو سنبھالا اور کمرے میں داخل ہو گیا وہ انسان جو اس صدی کا ایک بہت بڑا عالم اور فاضل انسان ہے۔ سراپا اخلاق بنا کھڑا تھا۔ اللہ اللہ اتنا جلیل القدر انسان اور اتنے حقیر سے لڑکوں کا اس طرح سے استقبال — بڑی گرمجوشی سے انہوں نے مصافحہ کیا، اور کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئے۔ ہم بھی بیٹھ گئے۔ ہم پر اُن کی شخصیت کا رعب طاری تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ ہمارے سامنے صرف ایک مصنف ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ دان ایک سیاست دان ایک رہنما، ایک فلسفی، ایک ماہر معاشیات، ایک ماہرِ نفسیات اور نہ جانے کون کون سی خصوصیات رکھنے والا شخص بیٹھا تھا لیکن انہوں نے زیادہ دیر ہمیں اس حالت میں نہ رہنے دیا۔ اور جلد ہی اپنی بے تکلف اور میٹھی لیکن سنجیدہ گفتگو سے ہمیں بھی کچھ عرض کرنے کی جرأت دلا دی۔ ہم نے اپنی اپنی مشکلات بیان کیں اور اُس کے لیے اُن سے رہنمائی طلب کی۔ میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے چند منٹوں اور چند فقروں میں ہمارے اُلجھے ہوئے خیالات کو سلجھا دیا، ہمارے عقدوں کو حل کر دیا — وہ بڑی سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ تول تول کر گفتگو کرتے تھے۔ جب تک ہم بیٹھے رہے اُن کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ کھیلتی رہی اور ایک منٹ کے لیے بھی انہوں نے ہمارے دل میں یہ خیال نہ آنے دیا کہ

ہم جتنی دیر یہاں بیٹھیں گے اتنا ہی ان کے آرام کا وقت ضائع کریں گے۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ وہ ہمارے ہر سوال کو غور سے سنتے اور بلا توقف ایسا جواب دیتے جو یقیناً ہماری تشفی و تسلی کر دینے والا ہوتا۔

اس طرح ہم تقریباً ایک گھنٹہ یہ تاریخی ملاقات کرنے کے بعد اُٹھے اور اُن سے اجازت چاہی۔ انہوں نے اُسی خندہ پیشانی سے ہمیں الوداع کہا اور ہم اپنے دلوں پر ایک نہ مٹنے والا نقش لے کر باہر آ گئے۔

آج جبکہ وہ ملتان جیل میں احقاقِ حق کی سزا بھگت رہے ہیں۔ میرے دل میں اُن سے اس ملاقات کی یاد اس طرح موجود ہے جیسے کہ یہ واقعہ کل پیش آیا ہو۔ یقیناً یہ میری زندگی کا سب سے اہم اور بابرکت واقعہ تھا جس نے میرے دل کو مکمل طور پر اسلام کی طرف پھیر دیا اور جو مجھے اسلام کی راہ پر لانے کا موجب ہوا۔

میرے ساتھ جو دوست تھے اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) جناب محمد عبداللطیف صاحب (۲) جناب عبدالقیوم صاحب۔

(۳) جناب حافظ رشید احمد صاحب۔

محمد صدیق کاتب ۲۶/۹/۵۵

مولانا مودودی

اپنی اور دوسروں کی نظر میں

مرتب

محمد یوسف

شائع کردہ

مکتبۂ الحبیب • اچھرہ • لاہور